

وَلَا تَقْرَأُ الْقُرْآنَ فَتَسْمَعُ عَظْمًا وَلَا نَصِيَةً (الآيَةُ)
(قرآن کریم)

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعْ لَهُ وَأَنْصِتْ لَعَلَّكَ تُبْقَىٰ وَتَرْحَمُ الرَّحْمَٰنَ (الحديث)

حَسُنُ الْكَلَامُ

فی

ترك القراءة خلف الامام

جلد اول

جس میں قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ و اتباع تابعینؓ اور دیگر
جمہور فقہاء اور محدثین عظام سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی بھی قسم
کی قرأت عموماً اور سورۃ فاتحہ کی قرأت خصوصاً ممنوع ہے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے
قرأت کرنا قرآن کریم، حدیث صحیح اور اجماع کے خلاف ہے اور فی نفسہ منکر اور مذموم ہے اور
جہری نمازوں میں حضرات ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ نیز عقلی اور قیاسی دلائل سے اس مسئلہ
پر فیصلہ کن بحث کی گئی ہے اور فریق ثانی کو مسکت جوابات دیے گئے ہیں اور اس طبع میں خیر الکلام
اور الاعتصام میں کیے گئے اعتراضات کے جوابات کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تالیف

ابوالزاہد محمد سر فراز خاں صفدر

جملہ حقوق بحق مکتبہ صفدریہ گوجرانوالہ محفوظ ہیں۔

جون ۲۰۰۶ء

طبع دہم

نام کتاب ————— احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام

مؤلف ————— شیخ اکبریت حضرت مولانا محمد رفیع خان صفدر دام مجدہم

تعداد ————— ایک ہزار

مطبع ————— فائن بکس پرنٹرز لاہور

ناشر ————— مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ فقہاء العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

قیمت ————— دو سو پچیس روپے

ملنے کے تہ

- مکتبہ صفدریہ نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ
- مکتبہ حلیمیہ جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
- مکتبہ خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ العارفی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
- مکتبہ رشیدیہ حسن مارکیٹ نیوز روڈ مینگورہ
- مکتبہ نفاہیہ کبیر مارکیٹ مکی مردت
- مکتبہ قاسمیہ جمشید روڈ نزد جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی
- مکتبہ فاروقیہ حنفیہ عقب فائر بریکڈ اردو بازار گوجرانوالہ
- مکتبہ امدادیہ ملتان
- مکتبہ حنفیہ ملتان
- مکتبہ مجیدیہ ملتان
- مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
- اسلامی کتب خانہ اڈا گامی ایبٹ آباد
- مکتبہ فریدیہ ای سیون اسلام آباد
- دارالکتب عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
- مدینہ کتب گھر اردو بازار گوجرانوالہ

کتب گھر شاہ جی مارکیٹ گامگورہ



فہرست مضامین

۴۶	دیب چہ طبع دوم
۵۲	دیب چہ طبع اول
۵۲	سخن ہائے گفتنی
۵۲	سبب تالیف
۵۸	اختلافی مسائل میں ہمارا نظریہ
۶۱	توثیق و تضعیف کا معیار ہے
۶۱	اسانید کے ترجمہ کا معیار ہے
۶۲	حضرات فقہار و محدثین اور ائمہ دین کا احترام
۶۳	ضروری التماس
۶۵	مقدمہ
	جو حضرات صحابہ کرام تمام نمازوں میں امام کے
۶۶	پچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔
۶۶	جو جہری نمازوں میں قائل نہ تھے۔
	جو حضرات تابعین تمام نمازوں میں قرآن
۶۶	خلف الامام کے قائل نہ تھے۔
۶۶	جو جہری نمازوں میں قائل نہ تھے۔
۶۶	مسئلہ خلف الامام اور حضرات اتباع تابعین
۶۷	حضرات ائمہ اربعہ اور مسئلہ خلف الامام
۶۷	حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک
۶۸	امام موصوفؒ فقہار اور محدثین کی نگاہ میں
۷۰	امام محمدؒ کا مسلک بھی یہی تھا

تصدیقات علمائے کرام

۱۰	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
۱۸	حضرت مولانا مفتی سید ہمدی حسن صاحب
۲۰	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی
۲۰	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی
۲۱	حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب
۲۳	حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کراچی
۲۴	حضرت مولانا خیر محمد صاحب
۲۵	حضرت مولانا احمد علی صاحب
۲۶	حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب
۲۷	حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی
۲۷	حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب بہبودی
۲۸	حضرت مولانا سلطان محمود صاحب
۲۹	حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک
۳۰	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی
۳۱	حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد نصیر الدین صاحب غوثی
۳۲	حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی
۳۳	حضرت مولانا محمد عبدالرشید صاحب نغانی
۳۴	حضرت مفتی رشید احمد صاحب
۳۵	دیب چہ طبع سوم

- ان کی شخصیت ۷۰
- امام ابو یوسفؒ کا مذہب بھی یہی تھا ۷۱
- ان کی ذات ائمہ کی نظر میں ۷۱
- حضرت امام مالکؒ کا مسلک ۷۲
- ان کی جلالت شان؟ ۷۲
- حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ۷۳
- ان کی دینی خدمات اور امامت ۷۳
- ان کا مسلک سمجھنے میں غلط فہمی ہوتی ہے۔ ۷۳
- امام داؤد بن علی الظاہریؒ کا مسلک ۷۵
- امام شافعیؒ کی اپنی عبارتیں ۷۶
- اس غلط فہمی کا اصلی سبب کیا ہے؟ ۷۷
- مؤلف خیر الکلام کی تاویلات { ۷۸ تا ۸۵
- اور ان کے مسکت جوابات {
- حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک، ان کا پایہ؟ ۸۶
- امام ابراہیم نخعیؒ کا مسلک، ان کا درجہ؟ ۸۷
- امام زہریؒ کا مسلک اور درجہ ۸۸
- امام ثوریؒ کا مسلک اور رتبہ ۸۹
- امام لیث بن سعدؒ کا مسلک اور شان ۸۹
- امام ابن مبارکؒ کا مسلک اور فضیلت ۸۹
- امام اوڑاعیؒ کا مسلک اور جلالت ۹۰
- امام اسحاق بن راہویہؒ کا مسلک اور رتبہ ۹۱
- سفیان بن عیینہؒ کا مسلک اور شان ۹۱
- امام شمس الدین ابن قدامہ حنبلیؒ ۹۲
- شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مسلک اور درجہ ۹۳
- شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا مسلک اور رتبہ ۹۳
- حافظ ابن القیمؒ کا مسلک اور شان ۹۶
- حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مسلک ۹۷
- امام احمد کے زمانے تک ائمہ اسلام میں اس کا کوئی بھی قائل نہ تھا کہ تارک قرآن خلف الامام کی نماز فاسد اور باطل ہے۔ ۱۰۰
- مؤلف خیر الکلام کی توجیہات کا جواب ۱۰۱
- حضرت امام ترمذیؒ کی ایک قابل حل عبارت ۱۰۶
- امام عینیؒ کا دہم اور اس کا ازالہ ۱۰۸
- باب اول ۱۱۰
- قرآن کریم کے آداب میں سے ایک ادب { ۱۱۱
- یہ ہے کہ قرأت کے وقت خاموشی اختیار کی جائے
- قرآن کریم کا سننا بعض اوقات خود پڑھنے سے { ۱۱۶
- زیادہ افضل ہے۔
- آیت **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ...** الایۃ خلف الامام { ۱۱۹
- کے بارے میں نازل ہوتی ہے۔
- قرآن کا نمبر اول پر مصداق صرف سورہ فاتحہ ہے ۱۲۰
- حضرات صحابہ کرامؓ کی تفسیر کا حکم کیا ہے؟ ۱۲۱
- آیت کی تفسیر حضرت ابن مسعودؓ سے ۱۲۲
- فرق تفسیر میں ابن مسعودؓ کا رتبہ حضرت خلفاءؓ سے { ۱۲۲
- راشدینؓ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔
- ابن مسعودؓ کی پہلی روایت ۱۲۳

- ۱۵۷ علامہ زنجشیریؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۵۸ حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۵۹ علامہ ابوالسعودؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۶۰ امام ابو نعیمؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۶۱ علامہ محمود اوسؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۶۲ امام بیہقیؒ کی تفسیر
- ۱۶۳ قاضی شوکانیؒ کی تفسیر
- ۱۶۴ حافظ ابو عمر بن عبدالبرؒ کی تفسیر
- ۱۶۵ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تفسیر
- ۱۶۶ اس تفسیر پر فریق ثانی کے اعتراضات
- ۱۶۷ پہلا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۶۸ دوسرا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۶۹ تیسرا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۰ چوتھا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۱ پانچواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۲ چھٹا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۳ ساتواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۴ آٹھواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۵ نواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۶ دسواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۷ استماع کا معنی
- ۱۷۸ انصاف کا معنی
- ۱۷۹ سکوت کا معنی
- ۱۸۰ آہستہ پڑھنا بھی انصاف و استماع کے
- ۱۲۶ ابن مسعودؓ کی دوسری روایت
- ۱۲۸ حضرت ابن عباسؓ کا رتبہ
- ۱۲۸ ان کی پہلی روایت
- ۱۳۲ حضرت ابن عباسؓ کی دوسری روایت
- ۱۳۴ حضرات تابعینؓ کی تفسیر کا مقام
- ۱۳۴ حضرت مجاہدؒ کا رتبہ اور ان کی تفسیر
- ۱۳۴ ان کی پہلی روایت
- ۱۳۵ ان کی دوسری روایت
- ۱۳۶ ان کی تیسری روایت
- ۱۳۸ حضرت سعید بن المسیبؒ کی روایت
- ۱۳۹ حضرت حسن بصریؒ کی روایت
- ۱۴۰ حضرت ابو العالیہ ریاحیؒ کی روایت
- ۱۴۱ حضرت امام زہریؒ کی روایت
- ۱۴۲ حضرت عبید بن عمیرؒ اور عطاء بن ابی ریحانؒ کی روایت
- ۱۴۴ محمد بن کعبؒ کی روایت
- ۱۴۵ حدیث مرسل
- ۱۴۹ بعض تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے مراسیل
- ۱۵۲ دیگر تابعینؓ و اتباع تابعینؓ سے اس کی تفسیر
- ۱۵۳ مشہور مفسرین کرامؒ اور محدثین عظامؒ کی تفسیر
- ۱۵۴ ابن المسیبؒ کا مرسل عند الشافعیؒ بھی صحیح ہے (الترغیب)
- ۱۵۴ قرینہ سے ظاہر ہے کہ مرسل بھی صحیح ہے (حجۃ اللہ الباقیہ)
- ۱۵۵ امام ابن جریرؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۵۶ امام بغویؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟

- چوتھا اعتراض کہ محمد بنین کا ایک گروہ اس [۲۵۷]
 زیادت میں کلام کرتا ہے اور اس کا جواب
- اس زیادت کو کن کن محدثین نے صحیح
 کہا ہے؟ [۲۵۷]
- پانچواں اعتراض کہ یہ روایت مسند نہیں ہے [۲۶۰]
 اور اس کا جواب۔
- چھٹا اعتراض کہ اس میں قرأت سے ما زاد
 علی الفا تم مراد ہے اور اس کا جواب [۲۶۳]
- دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہ سے [۲۶۷]
- اس پر پہلا اعتراض ابو خالد کا تفرقہ اور
 اس کا جواب [۲۶۹]
- دوسرا اعتراض محمد بن عجلان میں کلام اور
 تدلیس کا جواب [۲۷۰]
- تیسری حدیث حضرت انس سے [۲۷۳]
- چوتھی حدیث [۲۷۷]
- اس پر پہلا اعتراض ابن اکیثمہ کی جہالت
 اور اس کا جواب [۲۸۰]
- اس پر دوسرا اعتراض کہ یہ زہری کا درج
 ہے اور اس کا جواب [۲۸۱]
- اس پر تیسرا اعتراض اور اس کا جواب [۲۸۷]
- پانچویں حدیث [۲۸۸]
- چھٹی حدیث [۲۹۱]
- ساتویں حدیث [۲۹۳]

- سراسر منافی ہے [۱۹۹]
- گیارہواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۰۰]
- بارہواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۰۱]
- تیرہواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۰۳]
- چودھواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۰۸]
- سکات امام کی فیصلہ کن بحث [۲۰۹] تا [۲۱۸]
- پندرہواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۱۸] تا [۲۲۵]
- سولہواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۲۵]
- سترہواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۲۶]
- اٹھارہواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۲۸]
- انیسواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۲۸]
- بیسواں اعتراض اور اس کا جواب [۲۳۰]
- باب دوم [۲۳۳]
- حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث [۲۳۳]
- اس کی مختلف سندیں [۲۳۴] تا [۲۳۸]
- اس حدیث پر پہلا اعتراض، سلیمان تیمی کی
 تدلیس اور اس کا جواب [۲۳۹]
- اس حدیث پر دوسرا اعتراض (کہ وہ متفق ہیں)
 اور اس کا جواب [۲۴۱]
- اس حدیث پر تیسرا اعتراض قتادہ کی تدلیس
 اور اس کا جواب [۲۴۹]
- صحیحین میں تدلیس مضر نہیں [۲۴۹]
- بعض روایات کی تدلیس مضر نہیں ہے [۲۵۱]

۳۷۵ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۷۶ حضرت ابن مسعودؓ کے آثار
 ۳۷۸ ان پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۸۰ حضرت ابن عباسؓ کا اثر
 ۳۸۲ { حضرت ابن عباسؓ کا ایکس اور اثر اور
 اس کی وضاحت
 ۳۸۴ حضرات خلفائے راشدینؓ کا اثر
 ۳۸۶ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کا اثر
 ۳۸۸ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۹۰ حضرت سعید بن ابی وقاصؓ کا اثر
 ۳۹۱ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۹۲ لطیفہ
 ۳۹۵ آثار تابعینؓ
 ۳۹۵ حضرت علقمہ بن قیسؓ کا اثر
 ۳۹۶ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۹۷ حضرت عمرو بن مومنونؓ وغیرہ کا اثر
 ۳۹۸ حضرت اسود بن یزیدؓ کا اثر
 ۴۰۰ حضرت سويد بن غفلهؓ کا اثر
 ۴۰۰ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۴۰۱ حضرت نافع بن جبیرؓ کا اثر
 ۴۰۲ حضرت سعید بن المسیبؓ کا اثر
 ۴۰۲ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۴۰۳ حضرت سعید بن جبیرؓ کا اثر

۳۴۸ مترصدین حدیث
 ۳۵۰ اس پر پہلا اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۵۱ اس پر دوسرا اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۵۲ مولف خیر الکلام کا صریح ہتنام
 ۳۵۳ اٹھارہویں حدیث
 ۳۵۳ کتاب الآثار سے اس کی تائید
 ۳۵۳ اس کی سند صحیح ہے
 ۳۵۴ انیسویں حدیث
 ۳۵۶ بیسویں حدیث
 ۳۵۷ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۶۰ اکیسویں حدیث
 ۳۶۱ بطور شاہد پہلی حدیث
 ۳۶۲ دوسری حدیث
 ۳۶۳ تیسری حدیث
 ۳۶۵ چوتھی حدیث
 ۳۶۸ تیسرا باب
 ۳۶۸ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کے آثار اور
 علم و فقہ میں حضرات صحابہ کرامؓ کی نمایاں اور
 مشہور ہستیاں
 ۳۷۰ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اثر
 ۳۷۱ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
 ۳۷۲ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ کا اثر
 ۳۷۳ حضرت زید بن ثابتؓ کا اثر

- ۴۰۹ جہوں کی روایتوں کا معیار کیا ہے؟
- ۴۱۰ حضرات محدثین کرامؒ اور فقہائے عقیدت
- ۴۱۲ چوتھا باب
(عقلی، تزجی اور قیاسی دلائل)
- ۴۱۲ پہلی دلیل دوسری اور تیسری دلیل و ۴۱۳
- ۴۱۵ چوتھی اور پانچویں دلیل و ۴۱۴
- ۴۱۶ چھٹی اور ساتویں دلیل و ۴۱۵
- ۴۱۸ آٹھویں دلیل — نویں دلیل و ۴۱۴
- دسویں اور گیارھویں دلیل ۴۱۹
- ۴۲۰ بارھویں دلیل
- ۴۲۳ فریق ثانی سے اخلاص کے ساتھ استدعا ۴۲۳
- ۴۰۳ اس پر اعتراض اور اس کا جواب
- ۴۰۴ حضرت عروہ بن زبیر کا اثر
- ۴۰۴ حضرت ابراہیم نخعی کا اثر
- ۴۰۵ حضرت قاسم بن محمد کا اثر
- ۴۰۶ حضرت امام اوزاعی کا اثر
- ۴۰۶ حضرت سفیان ثوری کا اثر
- ۴۰۷ حضرت لیث بن سعد کا اثر
- ۴۰۷ حضرت عبداللہ بن مبارک کا اثر
- ۴۰۷ حضرت عبداللہ بن وہب کا اثر
- ۴۰۸ حضرت سفیان عیینہ کا اثر
- ۴۰۸ حضرت اسحاق بن راہویہ کا اثر

آخری التماس ۴۲۴

تَمَّ بِعَوْنِ اللَّهِ تَعَالَى

تصدیقاتِ علماءِ کرام

فخر الامثال قدوة الصالحا حکیم الاسلام الحاج الحافظ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب امت کا تم

مہتمم دارالعلوم، دیوبند۔

مخدوم و محترم زاد مجد کم

سلام مسنون نبی از مقرون۔ لکھڑ سے رخصت ہو کر بعافیت لاہور اور وہاں سے دیوبند پہنچا۔ احسن الکلام کا مطالعہ زیادہ شوقِ طبعی دامن گیر تھا۔ ماشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ فاتحہ میں اسے ایک بحرِ ذخار پایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس سعی و محنت کو قبول فرمائے اور امت کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے حسب وعدہ تقریظ لکھنے کا ارادہ کیا۔ لکھنے بیٹھا تو غیر متوقع طریق پر تحریر طویل ہو گئی جو احسن الکلام سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا۔ تقریباً پانچ صفحے فل سکیپ کے ہو گئے۔ اور تقریظ کی صورت نہ رہی۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو آپ اس میں سے وہ زائد حصہ حذف کرائیں جس میں خالی اہل حدیث کو ناصحانہ خطاب ہے اور اگر اسے غیر ضروری نہ سمجھیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ اسے تقریظ کے بجائے کتاب کا مقدمہ بنا دیجیے جو میری طرف سے ہو جائے گا۔ مقدمہ کے لیے یہ تحریر موزوں رہے گی، جو بھی صورت مناسب ہو کر لی جائے۔

میں بجز اللہ تعالیٰ بعافیت ہوں۔ اُس شب کی مہل نوازی کا شکر گزار ہوں۔ والسلام

محمد طیب

دیوبند
۳/۴/۷۵ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَيَسِّرْ عِبَادَ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ (سُورَةُ الزَّمَرِ)

محترم الفاضل مولانا محمد سر فراز خاں صاحب دام بالمجد والفواضل کی لطیف ترین تالیف احسن الکلام فی ترک قرآۃ الفاتحہ خلف الامام سے استفادہ کا شرف میسر ہوا۔ مطالعہ کے وقت ہر اگلی سطر پر آنکھوں میں نور دل میں سرور اور روح میں تلخ یقین بڑھتا جاتا تھا، اثبات مسئلہ کے سلسلہ میں مصنف نے سلاست بیان زور استدلال منصفانہ تنقید اور عادلانہ مدافعت سے مسئلہ کے تحقیقی اور الزامی دونوں پہلوؤں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کا مثبت حصہ بہت زیادہ دل آویز ہے جس میں متین انداز کے ساتھ مضبوط دلائل اور موثکہ شواہد سے مسئلہ کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور ساتھ ہی مسئلہ کے دفاعی پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔ کیونکہ مثبت پہلو کے ساتھ جب تک اس کا منفی پہلو صاف نہ ہو مسئلہ من کل الوجوه مستحکم نہیں ہوتا۔ مصنف نے جہاں مثبت پہلو سے ماننے والوں کے لیے سینہ کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ وہیں منفی پہلو کے دفاع سے نہ ماننے والوں اور ان طعنہ زوروں کا منہ بند کر کے ان پر حجت بھی تمام کر دی ہے جنہیں فاتحہ اور ترک فاتحہ سے زیادہ صرف گروہی تعصب اور اس کا تفوق ہی زیادہ سے زیادہ پیش نظر ہے، لیکن ان کے مقابلے میں یہ تردید مسئلہ کے کسی اجتہادی پہلو کی تردید نہیں بلکہ ان کے تخیلات اور غیر معتدل رویہ کی تردید ہے ورنہ ایک فروعی اور ایک اجتہادی اور اوپر سے مختلف فیہ مسئلہ کے ایک پہلو کے اثبات و تحقیق پر اتنا زور دیا جانا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی جانب مخالف اور اس کے ماننے والوں کی تردید یا مخالفت کے لیے نہیں ہے نہ ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے فروعی مسائل نہ تو تبلیغی ہیں کہ انہیں دوسروں تک پہنچایا جانا اور ان کا منوایا جانا ضروری ہو اور نہ معاذ اللہ تکذیبی ہیں کہ مخالف راستے رکھنے والوں کو جھٹلایا جانا اور ان کی تکذیب کیا جانا

روا ہو بلکہ محض ترجیحی ہیں جن میں حق و باطل کا نہیں محض خطا و صواب کا اختلاف ہے وہ بھی
 علی الاطلاق نہیں بلکہ اپنا صواب بھی احتمال خطا کے ساتھ اور دوسروں کی خطا بھی احتمال
 صواب کے ساتھ مفید ہے اور پھر اس میں بھی دوسرے کی یہ متحمل خطا اس یقین کے ساتھ
 ہے کہ وہ اور اس کے ماننے والے اس پر مستحق اجر و ثواب اور مستوجب نجات و فلاح
 بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذوجہتین مسائل میں جن میں جانب مخالف باطل بھی نہ ہو وہ خطا
 قطعی بھی نہ ہو اور پھر سے نجات و اجر کا استحقاق بھی یقینی ہو کسی فریق کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے
 کہ وہ مسئلہ کی مخالف سمت کے ساتھ طعنہ زنی اور تشنیع سے پیش آئے یا اسے باطل قرار
 دے کر ماننے والوں کو مبطل قرار دے۔ اور اس کے بالمقابل اپنی مسلمہ جانب کی دعوت و تبلیغ
 کرنے لگے۔ فریقین کو اگر حق پہنچتا ہے تو صرف یہ کہ وہ وجوہ دلائل سے اپنی مسلمہ جانب کو
 مسلک سنت ثابت کرتے ہوئے اس کی ترویج واضح کر دیں جس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ
 اپنے کو تہمت بدعت سے بری ثابت کر کے دائرہ سنت میں محدود کیے ہوئے ہیں۔
 اور یہ کہ مسئلہ کی جس سمت کو انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ہوائے نفس سے نہیں بلکہ
 وجوہ شرعیہ ہے۔ اس ترجیحی سلسلہ میں فریق ثانی کا ابطال یا معاذ اللہ تعالیٰ اضلال کا
 کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ اس کی طرف التفات کی کوئی وجہ ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ
 ان فروعی اختلافات میں سرے سے فریق بندی ہی نہیں ہے کہ فریق اول اور فریق ثانی
 کی بحث شروع کر کے بل من مبارزہ کی زور آزمائیاں دکھلائی جائیں۔ فاتحہ خلف الامام ہو
 یا آئین بالجہر و بالسر، رفع یدین ہو یا ترویج اذان وغیرہ ان میں ہر مسئلہ کا مثبت اور منفی پہلو
 ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ مسئلے دو نہیں ہیں اور وہ پہلو بھی روایتی اور درایتی بحث
 سے سامنے آتے ہیں۔ شریعت نے بالاستقلال ابتدا ہی سے بیکدم دو متضاد پہلو عمل کے
 لیے سامنے نہیں رکھے۔ اب یہ دو پہلو خواہ زمانے کے تفاوت سے سامنے آئے کہ
 ابتدا میں ایک پہلو صاحب شریعت کے زیر عمل آیا اور آخر میں دوسرا جس سے ناسخ و
 منسوخ کی بحث پیدا ہوئی یا عزیمت و رخصت کے فرق سے سامنے آئے جس سے اولیٰ
 غیر اولیٰ کی بحث پیدا ہوئی یا تساوی کے ساتھ سامنے لائے گئے جس سے دونوں پہلووں میں

تجئیر کی بحث پیدا ہوئی، بہر حال کسی بھی معیار سے سامنے آئے ہوں ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو رہیں گے۔ جس میں ناسخ منسوخ اولیٰ غیر اولیٰ افضل غیر افضل عربیت، رخصت تجئیر و عدم تجئیر کے معیار سے ترجیحات سامنے آتی رہیں گی اور وہ اپنے وقت اور ظرف اور کیف و کم کی ترجیحات کے ساتھ امت کے زیر عمل آتے رہیں گے جس سے پیغمبر صادق و مصدوق کا کوئی ارشاد اور ارشاد کا کوئی پہلو متروک العمل نہ رہے گا بلکہ ہر پہلو امت کے کسی نہ کسی طبقہ میں زیر عمل رہے گا اور اس طرح پوری امت نبی کے پورے ارشادات کی حامل اور عامل رہے گی۔ اندر میں صورت ایک روایت دوسری روایت کی ایک حدیث دوسری حدیث کی اور ایک آیت دوسری آیت ہی کی خود ہی فریق نہیں ٹھہرتی چہ جائیکہ رجال حدیث یا حاملین آیت و روایت باہم ایک دوسرے کے فریق قرار پائیں اور آپس میں نبرد آزما ہوں۔ اور ہل من مبارز کہ یہیلوانوں کی طرح اکھاڑوں میں اتریں اور زور آزمائی کے جوہر دکھلائیں گویا آیات و روایات اسلحہ ہیں۔ حاملین آیات و روایات جنگی سپاہی اور شریعت ان کا میدان مبارزہ و مقابلہ، ظاہر ہے کہ حتیٰ طور پر سب سے پہلے اسلحہ نکراتے ہیں پھر سپاہی تو اس مبارزت طلبی کا مطلب یہ ہوا کہ خود آیات و روایات میں کوئی حقیقی تعارض اور تضادم ہے جس کی مجبوری سے حاملین آیات و روایات کو بھی باہم ٹکرائنا پڑا۔ حالانکہ یہ صورت حال خود کتاب و سنت مدفوع ہے اگر عیاذ باللہ تعالیٰ ان مختلف فیہ مسائل کی ذاتی خاصیت ہی یہ نبرد آزمائی اور مبارزت طلبی ہوتی تو حضرات صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین اور علمائے راہنہ کو تو اس لڑائی بھڑائی اور چیلنجوں سے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ ملتی۔ کیونکہ وہ تو ان مسائل میں مجتہد اور مدعی کی حیثیت رکھتے تھے اور مدعی کو اپنے دعوے پر بہ نسبت ناقل اور تابع کے زیادہ جمود اور استقلال ہوتا ہے جب ناقل اور تابع محض ہو کر ہمیں ان لڑائیوں سے فرصت نہیں تو مدعیوں کو تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان ہل من مبارز کے چیلنجوں سے مہلت نہ ملنی چاہئے تھی۔ اور ان کی لڑائی ہم سے کہیں زیادہ شدید اور مدید ہونی چاہیے تھی۔ لیکن صورت واقعہ برعکس ہے کہ قرون اولیٰ میں ان عملی اور فروعی مسائل کی جو انب و شقوق میں ترجیح و اختلاف کے باوجود ان حضرات کے قلوب میں ہل من مبارز اور چیلنجوں کا تصور تک نہیں ملتا چہ جائیکہ تضادم کا کوئی عمل دستیاب ہو اس لیے بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہماری مبارز طلبیاں اور شرعی لائنوں میں زور آزمائیاں ان مسائل کی خاصیت نہیں بلکہ محض ہمارے نفوس کی شرارتیں ہیں جن میں جذبات نفس

نکلانے کا جب کہیں اور موقع نہیں ملتا تو ہم یہ کار خیر اس شرعی میدان میں انجام دے لیتے ہیں۔ بنیے کی مارتراؤ کی ڈنڈی۔ اس لیے میں تو اس تصور پر ہوں کہ جب صورت تعارض کے باوجود ایک حدیث دوسری حدیث کا فریق نہیں تو ان مسائل کے سلسلے میں مرجعین کا کوئی طبقہ کوئی دوسرے طبقہ کا فریق کیسے قرار پاسکتا ہے؟ میرے خیال میں کوئی شافعی، مالکی، اہل حدیث ان مسائل کی ترجیحات کی حد تک نہ حنفی کا فریق ہے اور نہ حنفی ان میں سے کسی کا ان میں اگر ترجیحاتی بحثیں ہیں تو وہ علمی اور نظری طور پر ایک حق کو دوسرے حق پر راجح قرار دینے کی ہیں۔ نہ کہ حق کو باطل کے مقابلے پر اختیار کرنے کی جن کا لڑائی یا چیلنجوں سے تعلق ہو۔ ہاں اگر ان مرجعین کے مقابلے میں کوئی طبقہ فریق کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ طاعنوں تیشیح کنندوں اور ان افراد کا ہے جو کسی بھی اجتہادی شق کی تقبیح اور مذمت کے لیے مذہب و مشرب کے نام پر کھڑے ہوں۔ سو اس قسم کے طاعن اور تبرائی حضرات جس طرح تارکین فاتحہ خلف الامام کے فریق ہیں۔ اسی طرح قارئین فاتحہ خلف الامام کے بھی فریق ہیں۔ کیونکہ فاتحہ اور ترک فاتحہ تو حدیثی مسلک ہے لیکن طعن بر فاتحہ یا بر ترک فاتحہ (بائیں طور کہ پڑھنے یا نہ پڑھنے والے کو مطعون کیا جائے) نہ حدیثی مسلک ہے نہ قرآنی نہ فقہی نہ کلامی۔ اس لیے اگر تارکین فاتحہ اور قارئین فاتحہ حامل بالحدیث ہونے کی وجہ سے اہل حق ہیں تو یہ طاعنیں فاتحہ و ترک فاتحہ کسی سمت کے بھی ہوں۔ ان اہل حق کے فریق ہیں جن کا تقابل نہ فاتحہ سے ہے نہ ترک فاتحہ سے بلکہ حق اور اہل حق سے ہے۔ پس ایسے لوگ بلاشبہ تردید کے بھی مستحق ہیں اور تکذیب کے بھی درحالیکہ یہ تردید و تکذیب نہ کسی مسئلہ کی ہوگی نہ مسئلہ کی کسی اجتہادی شق کی بلکہ صرف ان افراد کی اور ان کے غیر معتدل کلام اور کلام کے اس رویہ کی جس کا تعلق کسی حق سے نہیں بلکہ صرف ان کے جذبات نفس سے ہے۔

مصنف مدوح نے اپنی اس متین کتاب میں اگر کہیں رد و قسح سے کام لیا ہے تو وہ درحقیقت اسی طبقہ کے مقابلے پر ہے جو مسائل کو مسائل کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ جذبات نفس کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ بقول شخصے کہ وہ نہ آئین بالبحر پر لڑتا ہے۔ نہ آئین بالسر پر بلکہ صرف آئین بالشر پر اس لیے وہ دونوں قسم کی آئین والوں کا فریق مقابل ہے۔ کیونکہ آئین کی پہلی دو قسمیں تو روایات میں ملتی ہیں لیکن تیسری سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ اس کا وجود اگر ہے تو صرف ان لوگوں کے نفس میں ہو سکتا ہے اور بس پس مصنف کو یقیناً کسی اجتہادی مسئلہ کی شق کی بھی تردید کا حق نہیں لیکن بالیقین

ایسے طعنہ زن اور ان کی ایسی غلط روشوں اور مطاعن کی تردید بلکہ تکذیب کا حق ضرور پہنچتا ہے۔ جو مسئلہ کے بجائے اپنے نفس کی مصلحت کو آگے رکھتے ہوں اور دلائل سے گزر کر جذبات کو مسئلہ کی کافی دلیل خیال کر رہے ہوں اگر مصنف نے ایسے لوگوں کی تردید کا فرض احسن الکلام کے ساتھ ادا کیا تو بلاشبہ انہیں اس کا حق تھا اور انہوں نے حق ادا کر دیا۔

اگر طعنہ زن حضرات کو حدیث کے نام پر زور آزمائی کا ایسا ہی شوق دامن گیر ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ پہلے منکرین حدیث سے ٹھیں اور نفس حدیث کے موقف کو تھامنے میں یہ زور آزمائی دکھلائیں۔ وہ ان سے کیا منٹنا چاہتے ہیں جو خود ہی حدیث، فن حدیث، فقہ حدیث اور ائمہ حدیث کے نتیجے اور ایک فانی گرویدہ و معتقد کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے یہاں حدیث رسول ہی نہیں رجال حدیث تک کی بے پناہ عظمت و بزرگی اور مخلصانہ پیروی کے جذبہ کو قائم رکھنا ایمان کا جزو و اعظم ہے۔ میزان طعنہ زن حضرات کو اگر واقعی تبلیغ حق کا جذبہ بے چین کیے ہوئے ہے تو وہ منکروں کو اصول اسلام اور اصل دین کی تبلیغ فرمائیں جس کی تبلیغ ضروری ہے تو فروعی مسائل کب ہیں کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اس کے مختار کی جانب سے ہٹا کر اپنی مختار جانب پر لانے کی کوشش کرے نیز اگر تردید ضروری ہے تو غیر اسلامی اصول کی ضروری ہے نہ کہ کسی اجتہادی شق کی سمت مخالف کی جس میں ہمہ وقت صواب کا احتمال قائم رہتا ہے اور اس پر چلنے والا ہر وقت اجر و نجات کا مستحق ہوتا ہے۔ پس تبلیغی سرگرمیاں اور بغض فی اللہ کے مجاہدانہ چیلنجوں کو اگر کام میں لانا ہے تو مخترعین دین، مخترعین کتاب و سنت اور مستحضرین اسلام کے مقابلہ میں لانا چاہئے نہ کہ فاتحہ وغیرہ جیسے فروعی اور اجتہادی مسائل کی ترجیحی شقوق و جوانب کے نام پر خود معتقدین دین و ائمہ دین کے مقابلہ پر میں تو سمجھتا ہوں کہ جو حضرات ان فروعی مسائل کو محض ترجیحی اور عملی مسلک جان کر ان پر سچے دل سے عمل پیرا ہیں خواہ وہ اہل فقہ ہوں یا اہل حدیث۔ انہیں اس دوران میں کسی حنفی غیر حنفی اور اس کی تسلیم کردہ جانب کا قصور تک بھی نہ آتا ہو گا۔ چہ جائیکہ وہ اس کے خلاف غم و غصہ سے مغلوب ہو کر چیلنجوں کی عبارتوں سے اپنے ذہنوں کو مشتوش کرتے ہوں اور ہل من مبارز کے دھیان میں غرق ہوں۔ استفسار مسئلہ کے وقت دیا نٹا اپنے نزدیک جو پہلو راجح ہو اسے راجح بتلانا اور مرجوح کو مرجوح کہنا اور چیز ہے اور مرجوح کا ابطال اور افساد کرنا یا اس کے ماننے والے کی تفسیل و

تفسیق کرنا اور چیز ہے۔ پہلا کام اہل حق کا ہے اور دوسرا اہل حق کے مقابل فریق کا۔ بہر حال جیسا کہ ایک
 حنفی کو فاتحہ خلف الامام کے ماننے والے کو مبطل یا باطل پرست کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے
 ایسے ہی کسی غیر حنفی کو ترک فاتحہ اور اس کے ماننے والوں کو باطل پرست یا مبطل یا ضال یا
 فاسق کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے کہ یہ اسم فسوق بعد الایمان اور غیر محتاط تعبیر ہم نالائقوں
 ہی تک محدود نہیں رہتی ورنہ تک جاتی ہے جس کی زد سے کوئی بڑے سے بڑا بھی نہیں بچا رہتا۔
 کیونکہ عیاذ باللہ اگر ترک فاتحہ خلف الامام کوئی ضال یا گمراہی ہے تو یہ ضلالت بہت پرانی اور
 بہت سوں کی ہے۔

مرا برندی عشق آں فضول عیب کند

کہ اعتراض بر اسرار علم غیب کند

ہاں اس حد تک ہم طعنہ زنیوں کے ممنوع کرم بھی ہیں کہ اگر وہ طعن و تشنیع کی راہ سے اس
 مسئلہ کو اپنے جذبات اور شکوک کی آماجگاہ نہ بناتے اور ایک فریق کی حیثیت سے سامنے نہ
 آتے تو مصنف محترم مولانا محمد سرفراز صاحب کے ان دقیق علوم اور اسالیب بیان سے
 ہم مستفید بھی نہ ہو سکتے جو اس جیلہ سے انہوں نے اپنی کتاب احسن الکلام میں رقم فرمائے
 ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جہل علم سے نہ نکلے تو علم کے مخفی گوشے و اشکاف نہیں ہو سکتے
 اگر کذب و صدق سے نکلے نہ کھاتے تو صدق کی مخفی قوت نمایاں نہیں ہو سکتی اگر کفر اسلام سے
 نہ نکلے تو اسلام کے مخفی گوشے دنیا کو اپنا نور نہ دکھلا سکتے بہر حال جب تک اَضداد اپنے اصول
 سے نہ بھڑیں اصول کا وجود و ثبوت نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس عالم کو عالم
 اَضداد بنایا ہے اور ہر اصول کے پیچھے اس کی ضد لگا دی ہے تاکہ وہ اس سے نکلے ہی ہے
 اور اس جیلہ سے اصول کی عظمت و قوت لپکتی رہے بایں معنی نکلے بنی طور پر طاعنوں اور
 منکروں کا وجود بھی مجموعہ کائنات کے لیے ایک حُسن ہے اور ضروری ہے وہ اگر دلوں میں سے
 اور شبہات نہ ڈالیں تو اہل عرفان سے ان کے وضعیہ کی علمی تدبیریں بھی نمایاں نہ ہوں۔ مثل
 مشہور ہے کہ ”ادب سیکھا جاتا ہے بے ادبوں سے“ یعنی وہ ذریعہ ادب دانی بن جاتے ہیں جو
 علم بھی بہت حد تک جہل سے ہی سیکھا جاتا ہے۔ یعنی جہل اور اس کے پیدا کردہ شکوک و شبہات

بھی بہت حد تک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اہل علم کی گرم جوشی آمادگی اور ان کے انکارِ علم کا جس سے مخلوق خدا علم سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ بس اس حد تک اس طبقہ کا ہم سب ہی کو ممنون ہونا چاہیے کہ علم کے بہت سے مخفی گوشے ان کے سبب سے سامنے آگئے اور اس شر میں سے ایک خیر ہمارے لیے نکل آئی۔ شر اپنی ذات سے شر سہی مگر مجبوعہ عالم اور اہل معاملہ کے لیے نسبتاً وہی خیر ہے۔ مگر محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ شر کے خیر ہونے سے۔ اس لیے تکوینی طور پر تو ہم طعنہ زنون کے ممنون ہوں گے کہ ان کی بدولت کتنے ہی علم کے مخفی گوشے ہمیں دستیاب ہو گئے مگر حقیقی طور پر ہم مصنف احسن الکلام کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس جیلہ سے مسئلہ فاتحہ کے تحقیقی اور دفاعی دونوں پہلوؤں کو بہت حد تک صاف کر دیا ہے جو موافق اور مخالف دونوں طبقوں کے لیے علمی حیثیت سے کارآمد ہوں گے۔ اگر خلاف رائے رکھنے والے حضرات کے لیے ان دلائل سے شفا ہو گئی تو ان کے خلاف میں شدت باقی نہ رہے گی خواہ وہ اپنے ہی مسلک پر عمل پیرا رہیں سو یہ کونسا کم نفع ہے اور اگر ان دلائل کے کسی مقدمہ کو کمزور یا کراٹھوں نے جواب کے طور پر اسے واضح کیا تو ہم سب کے لیے ایک مزید علم کا اضافہ ہوگا اور یہ کونسا قلیل نفع ہے جو ذہنی علما کا مصداق ہو، بہر صورت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب اس تالیف لطیف کے لیے سرفراز ہوتے ہیں تو وہ ہمارے شکر یہ کے مستحق ہیں اور احسن الکلام بحیثیت مجموعی حقیقتاً احسن الکلام ہے۔ حق تعالیٰ اس احسن الکلام کو حسن قبول سے سرفراز فرمائے اور اسے یتبعون احسنہ کا مصداق بنائے۔ آمین

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

یکم ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ

سید المناظرین سید العلماء
حضرت مولانا سید مہدی حسن رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مفتی اعظم دارالعلوم، دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

و بعد۔ آج دنیا جس دور سے گذر رہی ہے خصوصاً مسلمان عالم جن کٹھن مراحل سے گذر رہے ہیں۔

اس کا وقتی اور ہنگامی اقتضایہ تھا کہ وہ امت جس کا خدا ایک۔ رسول ایک، قرآن ایک۔ کعبہ ایک ہے

سرچوڑ کر بیٹھتی اور ان امراض کا علاج تلاش کرتی جن امراض میں مسلمان مبتلا ہیں جن کی وجہ سے ان پر

زندگی دو بھرا اور وبال ہے۔ تحریکات گمراہ کن اور فتنہ مخرب دین کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ نہیں، نہیں بلکہ

دریا کی موجوں کی طرح پلے پلے موجیں مار رہے ہیں جن کی لہروں کا اثر ساحل دریا سے باہر بھی کافی ہے:۔

بحر م کوش کہ این رہے پُر از خطر است

ہمیں کہ ابر بسیار چسپاں تصور کن

بجائے اس کے آج بھی تشنت و افراق کی صورتیں پیدا کر کے شقاق و خلاف کے راستے کو ہموار کیا

جانا:۔ ع وہ نچنے کس طرح بیٹھیں کہ جب بیٹھا نہیں جاتا

اس پر طرہ یہ کہ اس کو دینی خدمت تصور کیا جاتا ہے جو مسائل برسہا برس سے ایسے چلے آتے

ہیں جن پر ہر زبان میں خامہ فرسائی ہو چکی ہے اور قلوب کی روشنائی خشک ہو چکی ہے۔ انھیں اختلافی

مسائل میں سے فاتحہ خلف الامام کا پرانا مسئلہ ہے کوئی نئی اور جدید تحقیق نہیں ہے جس کو دنیا کے مسائ

پیش کیا جاتے اور وہ اس سے مستفید ہو۔ لیکن جن حضرات کی طبیعت ثانیہ یہ ہو گئی ہو کہ اختلاف

و وسیع ہوتا رہے وہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرتے رہیں لیکن

ایسا نہیں بلکہ دور حاضر کے ہمارے دینی بھائی اہل حدیث حد اعتدال سے باہر ہو کر اسی کے دیرپے

ہو گئے کہ جو امام کے پیچھے۔ الجھنے پڑھے اس کی نماز باطل ہے اور جب نماز ہی نہیں ہوتی تو

تاکرین صلوة ہیں بلکہ قصداً اس جرم کے مرتکب ہیں جو بجائے خود باعث نجات ہونے کے

موجب خسران اُخروی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر کہاں تک صحیح ہے۔ اس کو انھیں کے قلوب زیادہ محسوس کرتے ہوں گے کہ امرت محمدیہ کی ایک بہت بڑی جماعت کی نماز پر پُطلان کا حکم لگا کر کیا دین کی خدمت ہے، جن میں حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ و تبع تابعینؓ وغیرہم کی کافی تعداد داخل ہے۔ ایسی صورت حال پر اس کی ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر از سر نو ممانعت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی کے ساتھ مدندانہ طریق سے روشنی ڈالی جائے جو پہلو آجا کر نہیں ان کو آجا کر کر دیا جائے تاکہ انصاف پسند اور علم پرور حضرات کی بصیرت دقیقہ رس اس کو دیکھ کر اَحْسَنَتْ کہ اٹھے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آخر آندز پس پردہ تفسیر پدید!

اس ضرورت کا احساس انجی محترم فاضل نوجوان مولانا محمد سر فراز خاں صدقہ رسر حدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی نے کیا اور اس مسئلہ پر محققانہ و منصفانہ بحث کر کے کتابی صورت میں اس کو شائع کیا جو احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الایمام کے نام سے موسوم ہے جس کے دو حصے ہیں۔ میں نے جزو اول کا اول سے آخر تک لفظ بہ لفظ اور جزو ثانی کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا ہے۔ خوبی اسلوب و انداز بیان، زبان کی صفائی کے ساتھ دلائل و براہین پر منصفانہ نظر ڈالی ہے۔ فاضل موصوف نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ معترضین کے شبہات کا جواب عالمانہ دیا ہے اور تحقیق کے ساتھ مجادلانہ طریق اختیار نہیں کیا کہ کتاب کی افادیت میں کمی واقع ہو۔ اپنے ہر دعویٰ کو براہین سے مدلل کیا ہے کہ مخالفین حضرات کو بھی اگر ان کے یہاں علم و انصاف کی قدر و قیمت ہے تو تسلیم کر لینے اور سکوت اختیار کر لینے کے سوا چارہ کار نہیں ہے اس محنت و عرق ریزی اور تحقیق و تنقید کی جملہ اخلاف کی طرف سے فاضل موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور بے انصاف مخالفین کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور مخلوق کے طریقِ رشد و ہدایت کا رہبر بنائے۔ طلباء و عوام کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ علماء بھی اس کتاب کے مطالعہ سے دریغ نہ فرمائیں کہ براہین و دلائل اور آثار و اقوال ائمہ کی جاتی طور پر اس کتاب میں ملیں گے۔ بعض مباحث ایسے بھی اس کتاب میں ملیں گے جو بڑی عرق ریزی اور کافی مطالعہ کتب

بمشکل حاصل ہو سکتے ہیں جن کو فاضل مولف نے بہت خوبی کے ساتھ اپنے اپنے موقع پر پیش کیا ہے اس لیے ہر اس شخص کو اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے جو حنفیت سے وابستہ ہو تاکہ اپنے مذہب کی صداقت خصوصاً مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں ہویدا اور نمایاں ہو جائے۔ طباعت و کتابت کی کہیں کہیں کوتاہیاں ہیں جو اشاعت آئندہ میں دور ہو جائیں گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

احقر الزمن

السید مہدی حسن غفرلہ خادم دارالافتاء الواقعہ

بدارالعلوم دیوبند۔ ۳/۷/۴۵ھ

شیخ العربیۃ العجم رأس الاثقیاء مجاہد ملت

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ

سابق شیخ الحدیث دارالعلوم، دیوبند۔

حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب کی تحریر سے میں حرف بحرف موافقت کرتا ہوں اور دعا کرتا

ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

تنگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

مدرس دارالعلوم، دیوبند

رئیس المحققین قامع البدعت محی السننہ شیخ الحدیث

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی وامت برکاتہم (میتوا تم کلمہ پوری)

میتو

۱۲ ذیقعدہ، ۱۴۲۲ھ

فاضل محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا قیمتی پیر (احسن الکلام) مجھے بروقت مل گیا تھا۔ اس عنایت کے لیے میں

آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے میں اب تک آپ کی کتاب پڑھی نہیں پڑھ سکا پھر بھی متعدد مقامات سے کئی کئی ورق پڑھے، آپ کی محنت و جانکاپی پر دل سے دعا نکلی۔ میں نے آپ کی کتاب کو اس لحاظ سے بہت زیادہ پسند کیا کہ آپ نے انہیں اصول کو سامنے رکھ کر جوابات دیے ہیں جن اصول کی بنا پر معترضین نے اعتراضات کیے ہیں۔ بالخصوص آپ نے تحقیق الکلام کی طرف جو خصوصی توجہ فرمائی اس کے لیے آپ خاص طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔ اس لیے کہ ہماری جماعت کے سہیل و تغافل کی وجہ سے اس کو لا جواب سمجھا جا رہا تھا۔ حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

چونکہ یہ کتاب مقابلہ پر لکھی گئی ہے اور فریق مخالف صرف نکتہ چینی ہی کے خیال سے اس کو دیکھے گا، اس لیے مخالف کی نگاہ پڑنے سے پیشتر بعض ایسی باتیں جو میرے خیال میں صحیح نہیں معلوم ہوتیں۔ ان کی نشاندہی کرتا ہوں۔ آپ بھی غور فرمائیں۔ اگر آپ کو بھی مجھ سے اتفاق ہو تو قبھا ورنہ جانے ویجیے۔

چونکہ میں نے مسلسل پوری کتاب نہیں پڑھی اس لیے کیفیت ما اتفاق جہاں جہاں جوابات مجھے کھٹکی ہے اس کو میں نے نوٹ کر لیا ہے۔

حبیب الرحمن الاعظمی

نوٹ: حضرت نے تین صفحات پر مشتمل تحریر میں متعدد اغلاط کی نشاندہی کی تھی جن کی اب بھلا اللہ تعالیٰ تصحیح کر لی گئی ہے۔ صفحہ

حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق مفتی اعظم جامعہ رشیدیہ منگلور تلمیذ و مرید حضرت شیخ الحدیث

بخدمت جناب مولانا مولوی محمد رفیع فرزاں صاحب بارک اللہ تعالیٰ فی عمرہ و علمہ و عملہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اما بعد گزارش کہ احسن الکلام، تبرید النواظر، گلدستہ توحید، دل کا سرور میں نے پڑھا کر سنی ہیں۔ ماشاء اللہ تعالیٰ آپ بہت وسیع النظر ہیں اور ذہین۔ حافظہ و فہم بہت پایا ہے، مگر معام نہیں یہ سب کتب جن کے حوالے آپ

نے دیے ہیں۔ کیا یہ سب آپ کے پاس موجود ہیں؟ جب میری بیٹی تھی تو ہمارے سنن و جامع الائمہ
 نیموی والیضاح الاولہ و ہدایت المعتدی۔ والفرقان دیوبندی۔ وانوار نعمانیہ و ستہ ضروریہ فیض لوری
 کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر تحقیق الکلام کا جواب مصنف مرحوم کی زندگی میں کسی نے نہ لکھا۔ البتہ
 ابکار المنن کا جواب مولانا عبدالرشید ابن نیموی نے لکھا تھا۔ جس کا قلمی نسخہ انہوں نے مجھ کو بھی
 بھیجا تھا۔ جو جالندھر مولوی خیر محمد صاحب کے مکتبہ میں انقلاب کے وقت وہیں رہ گیا۔ ہمارے
 مدرسہ کی سب کتب اور مولوی خیر محمد صاحب کے مدرسہ کی کتب انقلاب میں سب ضائع
 ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مجلسی طلاقات ثلاثہ کی بابت آپ کتاب شائع کرنے کو ہیں؟ تیار ہونے
 پر پتہ کرنا۔ مولوی حبیب الرحمن اعظمی مدرس مدرسہ میو بھجن ناتھ ضلع اعظم گڑھ نے طلاقات ثلاثہ
 کی بابت دو جلدیں کتاب لکھی ہے۔ جس میں علامہ ابن قیم و غیر مقلدین کے جواب دیے ہیں۔
 وہ کتاب بھی وطن میں ضائع ہو گئی۔ شاید آپ کی نظر سے گزری ہے یا نہیں۔ ابکار المنن کا جواب
 ابن نیموی طبع نہیں کرا سکے۔ غریب ہونے کے سبب قلمی تین نسخے تیار کیے تھے۔ ایک نسخہ
 مجھ کو بھیجا اور ایک مبارک پوری صاحب کو اور ایک اپنے پاس رکھا۔ حضرت شیخ الہند فرماتے
 تھے کہ امام بخاری بڑے ذہین تھے۔ تھوڑا سا ذہن اور ہوتا تو امام ابو حنیفہ کے برابر ہوجاتے۔
 امام نووی کے متعلق فرماتے تھے کہ ان کا ذہن طویل و عریض تو بہت ہے مگر امام اعظم رحمہ
 کے عمیق ذہن تک پہنچ نہیں سکتے۔ فقط آپ کے حوالہ جات بقید صفحات لکھنے سے یہ
 معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیر چھنڈا کے مکتبہ میں لکھ رہے ہیں یا مکتبہ مدرسہ دیوبند میں کیا یہ سب
 کتب آپ کے پاس ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام فقط

خادم حبیب اللہ خلف حضرت مفتی رح

خادم طلبہ جامعہ رشیدیہ۔ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ

فقیر وقت المحقق المدقق
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ-

مولانا ابوالزہاد محمد سرفراز خان صاحب صحیفہ کی محققانہ تازہ تصنیف "احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام" دیکھنے کا موقع ملا جو اپنے موضوع میں بے نظیر کتاب ہے۔ طرز بیان نہایت سلیس ہے اور اس مسئلہ میں غلو و تعدی کرنے والوں کا بہترین جواب ہے۔

مسئلہ قراءۃ فاتحہ خلف الامام ان مسائل میں سے ہے جن میں حضرات صحابہ و تابعین کے زمانے سے اختلاف اور بحثیں چلی آتی ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں مستقل کتابیں اور رسالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں اور ایسے اجتہادی اختلافات میں تمام اہل حق کا مسلک یہی ہوتا ہے کہ ان کے جس پہلو کو وہ رائج سمجھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری جانب پر طعن و تشنیع اور زبان درازی جائز نہیں سمجھتے۔ علمی بحث و تحیص کا مقام آتا ہے تو اس میں مناظرانہ بحثیں بھی ملتی ہیں مگر اس نظر سے نہیں کہ ان کا حریف باطل پرست یا گمراہ ہے۔ اور اجتہادی اختلافات کا تمام اہل سنت و الجماعت کے نزدیک یہی مقام ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کل کی فضا میں جہاں کفر و الحاد کے طوفان نئی نئی شکلوں سے اٹھ رہے ہیں۔ سرے سے حدیث ہی کو ناقابل عمل ٹھہرایا جا رہا ہے۔ قرآن میں طرح طرح کی معنوی تحریفات کے لیے ادارے بناتے جا رہے ہیں، کسی خدا ترس ذمی علم کے لیے اس کا کوئی موقع نہ تھا کہ ان پرانی بحثوں کو تازہ کر کے ایک نیا فتنہ قرآن و حدیث کے ماننے والوں اہل سنت میں پیدا کرے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ بعض نا عاقبت انہیں کہ علم لوگ جو اپنے آپ کو فرقہ اہل حدیث سے منسوب کرتے ہیں اور درحقیقت انصاف پسند اہل حدیث بھی ان کے طرز عمل سے متنفر ہیں۔ کفر و الحاد کے دنیا میں پھیلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی فکریں صرف اس میں مبذول رہتی ہیں کہ حنفی مسلمان کو گمراہ، بے نماز بلکہ کافر و مشرک قرار دیں۔ اسی قسم کے بعض لوگوں نے حال میں کچھ رسائل شائع کر کے مسلمانوں

میں انتشار و اختلاف کا دروازہ کھولا تو ہمارے محترم مولانا ابوالزاہد محمد سر فراز خاں صاحب نے ضرورت محسوس فرما کر زمانہ حال کے طرز اور سلیبس اُردو زبان میں اس موضوع پر دو جلدوں میں یہ ضخیم کتاب تصنیف فرما کر مسئلہ کے ہر پہلو کو خوب واضح فرمادیا۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں اُردو زبان میں بھی اس مسئلہ کے متعلق نظر سے گذری ہیں اقل تو ان میں پوری مباحث کے لیے جامع کم ہیں۔ پھر خالص قدیم علمی زبان میں ہیں۔ آج کل عوام کہتے ان سے استفادہ مشکل ہے اس کتاب میں فاضل نے ماشاء اللہ تعالیٰ بڑی خوبی سے تمام جوانب کی رعایت رکھ کر اس کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے۔ جزاء اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء و تقبل منه مسعاہ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۵ شوال ۱۳۷۲ھ

علامہ عصر امام المناظرین اشد العلماء
حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ
سابق مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان، مغربی پاکستان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

بعد حمد و صلوة۔ مسئلہ قرآۃ خلف الامام سلف و خلف میں ہمیشہ مختلف فیہا رہا ہے۔ مگر اس کا اختلاف اولیت و غیر اولیت تک محدود رہا۔ مثبتین حضرات نے تارکین قرآہ پر بطلان صلوة کا جارحانہ حربہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ البتہ ہمارے زمانے کے اکثر غیر معتدل اہل حدیث علما جمہور سلف و خلف کے خلاف بڑی شد و مد سے اپنی تحریر و تقریر میں اس دلائل و حربہ کو استعمال کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ بایں ضرورت جمہور کی طرف سے بھی اصلاحی طور پر تحقیقی و جوابی رسائل کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو معاندین کے لیے مسکت اور منصفین کے لیے قانع تھا۔ مگر بعض رسائل میں جزوی مباحث پر کلام تھا اور بعض میں قدر ضرورت پر اکتفا تھا۔ اس لیے ہنوز ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں ایسی جامع اور مسکت کتاب شائع ہو جو تمام مباحث پر حاوی ہو۔ سو بھرحمد اللہ تعالیٰ فاضل نوجوان حضرت مولانا محمد سر فراز خاں صاحب سرحدی خطیب جامع مسجد گھنٹہ می ضلع

گو جز انوالہ نے کتاب احسن الکلام فی ترک القراۃ خلف الامام ہر دو جلد تصنیف فرما کر احسن طریق سے اس ضرورت کو پورا فرمادیا۔

امام شافعیؒ کے مذہب کی تحقیق اہل بیت اور رواۃ احادیث کے تراجم ووفیات اور ہر ہر مبحث پر محققانہ و منصفانہ تفصیلی دلائل و براہین اس کتاب کی خصوصیات ہیں مجھے سفر و علالت کے دوران میں صرف جلد اول کے مطالعہ کا حراً حراً موقع مل سکا۔ بفضلہ تعالیٰ اس مسئلہ کے متعلق فریقین کے بہت سے رسائل دیکھنے کا موقع مجھے بھی میسر آیا ہے اس لیے بلا تکلف عارض ہوں کہ میرے نزدیک یہ کتاب اس مسئلہ کے تمام مباحث پر حاوی اور جامع ہے۔ کوئی مبحث اس میں تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ فریقین کے لیے اس کا مطالعہ نافع ہوگا۔ خصوصاً حنفی المذہب علماء و طلباء کو خود زیر مطالعہ رکھنا اور اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور اس کی اشاعت میں سعی کرنا مذہبی فریضہ کے مراد ہے۔ حق تعالیٰ اس کتاب کو مفید عام اور نافع تام بنا دے۔ اور حضرت مولف علامہ دام فیضہ کو جزا بر احسن عطا فرماتے ہوئے اس قسم کے دیگر مسائل پر محققانہ رسائل تصنیف فرمانے کی توفیق مزید شامل حال رکھے۔ آمین ثم آمین۔

احقر خیر محمد عفا اللہ عنہ

مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان ۹ ذیقعد ۱۳۴۷ھ

شیخ کامل رئیس المجاہدین مفسر قرآن کریم
حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
امیر انجمن خدام الدین شیر انوالہ دروازہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔ اَتَابِعُوا

میں نے احسن الکلام فی ترک القراۃ خلف الامام مصنف مولانا ابوالزہد محمد سر فراز صاحب دامت معالیہم کی دونوں جلدوں کو متعدد مقامات سے بغور پڑھا ہے، مولانا ممدوح نے جس بحث اور عرق ریزی سے اپنے مجرہ موضوع کو دلائل و براہین سے مدلل فرمایا ہے۔ اگر اس عنوان

کے مخالفین انصاف اور تقویٰ سے کام لیں تو انہیں سوائے سکوت اور سر تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ ہو۔ بارگاہِ الہی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مخالفت کرنے والوں کی ہدایت فریاد فرمائے۔ آمین یا اللہ العالمین۔

العارض احقر الامام احمد علی عفی عنہ لاہوری ۱۷ شوال ۱۳۷۲ھ

امید الموحدین سید المناظرین الحافظ الحجۃ

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب دام فیضہم

سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و حال شیخ الحدیث گوجرانوالہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد عرض ہے کہ مجھے محترم دوست مولانا محمد سر فراز خان صاحب کی کتاب لاجواب احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جس کے بعد میں کتاب موصوف کی مندرجہ ذیل خوبوں اور خصوصیات پر مطلع ہوا:

- ۱۔ استیعاب اطراف میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ ۲۔ زور استدلال میں بے مثال ہے۔
- ۳۔ جامعیت مضامین میں بحر محیط ہے و معترضین کے اعتراضات کے جوابات میں دیوار فولاد ہے۔
- ۴۔ مصنف کے تبحر علمی کا زندہ ثبوت ہے۔

وبارک اللہ فی عمرہ و علمہ و شانہ و صلاتہ عما شانہ و حفظہ من آفات الزمان و عصمہ من شر الحاسدین

واصحاب العداوان۔

العبد الراجی اللہ شمس الدین عفی عنہ ۱۷ شوال ۱۳۷۲ھ

شیخ طریقت حافظ الحدیث علامہ حضرت مولانا شیخ القرآن الحدیث محمد عبد اللہ صاحب

درخواستی دام مجدہم متمم مدرس عربیہ مخزن العلوم خانپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من زہ نبی بعدہ

وعلی آلہ وصحبہ وجمیع من اقتفی اثرہ۔ اما بعد، فقد رأیت رسالۃ احسن الکلام

من تالیف المولوی محمد سرفراز خاں صفدر فریث موشحاً بدلائل و خطایا عن
الجدل فجزی اللہ تعالیٰ المؤلف احسن الجزاء وارجو من اللہ تعالیٰ ان ینتفع به العوام
والخواص وان ینتفع اهل الجدل الجدل قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما ضل
قریبہ ہدیٰ کانوا علیہ الا وتوالجدل الخ بکی شجرہ الاسلام من علمائہ فمنما
اکثر ثوا لہما رأوا من بکائہ - فاکثرہم مستحسن لخطائہ مستقبح لصواب غیرہ۔
فایہم المرجو فینالہ ینہ وایہم الموثوق فینا برأیہ ہدایۃ الدین ضلوا وقد باننا
نحسار تہم فبا عوا الدین بالدنیا فمارجحت تجارتہم -

حزیرہ افتقر الی اللہ محمد عبد اللہ درخواستی

مہتمم مدرسۃ العربیہ مخزن العلوم خانپور

استاذ الاساتذہ محقق وقت الفقیہ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد عبدالرحمن صنا
سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى - اما بعد -

احقر نے رسالہ احسن الکلام مؤلف مولانا محمد سرفراز خاں صاحب بعض بعض مقامات سے
دیکھا۔ اس مختصر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مؤلف سلمہ نے استدلال اور تنقید میں تحقیق اور ثبات سے
کام لیا ہے۔ طعن و تشنیع سے (جو آج کل کے بعض حضرات نے اختیار کر رکھا ہے) اجتناب کیا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ ایسے مسائل مختلف فیہا میں طعن و تشنیع ایک امر قبیح کا ارتکاب ہے۔ اللہ
تعالیٰ مسلمانوں کو اور خصوصاً حضرات علما کو اس سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف سلمہ کی اس
تالیف کو قبول اور مخلوق خدا کو اس سے مستفید و مستفیض فرمائے۔ اللہم وفقنا لما تحب
وترضی من القول والعمل والہدی انک علی کل شئی ع قدير۔

العبد الاحقر

عبدالرحمن غفرلہ

از بہبودی ملک مالاکیمیل پور ۱۸ شوال ۱۳۷۴ھ

شیخ المعقول والمنقول علامہ دہر فرید عصر حضرت مولانا شیخ القرآن

والحیث محمد سلطان محمود صاحب ^{تعالیٰ}

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام على رسولنا الكريم وعلى آله واصحابه اجمعين

اما بعد۔ میں کتاب احسن الکلام کو بالاستیعاب تو نہیں دیکھ سکا۔ لیکن اس کی دونوں جلدوں کے بعض بعض مقاموں کو نہایت غور و تدبیر کے ساتھ پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں مولانا محمد سر فواز خاں صاحب کے دو فریضے تھے۔ پہلا فریضہ اپنے دعوے کو دلائل سے واضح کرنا۔ دوسرا فریضہ فریق مخالف کے دلائل کا جواب دینا۔ مولف صاحب نے ان دونوں فریضوں کے ادا کرنے میں کمال کر دیا ہے۔ اپنے دعوے کو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ فریق مقابل کو ان کے دلائل کے جوابات عقلیہ و نقلیہ کا وہ نظارہ دکھایا ہے جو تا دم زبست ان کی نظروں سے غائب ہو ہی نہیں سکے گا۔

۲۔ طرز بیان نہایت ہی سلیس و عام فہم ہے صرف اردو خواں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
۳۔ اس مسئلہ کے متعلق بہت سے رسائل لکھے گئے ہیں لیکن احسن الکلام جیسا مفصل و جامع دلائل عقلیہ و نقلیہ میری نظر سے کوئی دوسرا رسالہ نہیں گزرا۔
اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی اس خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔
آمین۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خادم العلماء

سلطان محمود عفی عنہ

ناظم مدرسہ خادم علوم نبوت (کھمبالہ شیخاں) گجرات

سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی

نمونہ سلف بقیّت الخلف حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب امتیاز

مہتمم مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خشک ضلع پشاور

حضرت علامہ زید مجدّم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ - گرامی نامہ وصول پایا۔ حسب احکم احسن الکلام کے بعض مقامات دیکھے گئے۔ افسوس کہ نہایت عظیم الفرصتی کی وجہ سے مکمل کتاب کا مطالعہ نہ ہو سکا۔ تاہم جستہ جستہ مقامات کو بغور دیکھا گیا۔ بزرگوارم! ایسی جامع اور مسئلہ کے ہر پہلو پر حاوی کتاب پر تقریبی جملے لکھنا میرے خیال میں سورج کے سامنے چراغ دکھانا ہے لیکن محض تعمیل حکم کی غرض سے چند جملے تحریر کیے جا رہے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

اَلْحَمْدُ لِمَنْ تَفَرَّدَ بِاَلْقِدَامِ۔ فَكُلُّ شَيْءٍ مَّا سِوَاهُ مَسْبُوقٌ بِالْعَدَمِ وَالصَّلٰوةُ

وَالسَّلَامُ عَلٰی سَيِّدِنَا الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ مَصَابِيْحِ الْعِلْمِ

ابا بعدہ تمام مشاغل میں افضل و بہترین مشغلہ خلوص نیت کے ساتھ علوم دینیہ اور مسائل شرعیہ

کی تحقیق ہے جو افضل العبادت میں محسوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف نے اسی کو اپنی زندگی کا اہم نصب العین اور اپنی تمام سرگرمیوں کا محور قرار دیا تھا۔ اور قیمتی عمروں کو اسی مبارک مشغلہ میں فنا کیا ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل شرعیہ میں علمی تحقیقات کو امت کے سامنے پیش کرنا جن میں امت کے نقطہ ہائے نظر سلفاً و خلفاً مختلف ہے ہوں۔ علوم دینیہ کی بہترین خدمت اور امت کے ساتھ انتہائی درجہ کی خیر خواہی ہے جو ہر طرح قابل قدر اور لائق ستائش ہے کہ اسی میں امت کے مختلف النجیال حضرات کے خیالات کی ایک حد تک اصلاح اور طالب عمل کے لیے ایک واضح شاہراہ متعین ہو جانے کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں۔ مسئلہ قرأت خلف الامام بھی چونکہ ان معرکۃ الآراء مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس میں ہر زمانے کے اکابرین ملت نے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اور اس پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ جزا ہم اللہ تعالیٰ اعنا خیر الجزاء لیکن زیادہ تر ہدف ملامت اس مسئلہ میں علماء احناف ہی کو بنایا جا چکا ہے اور بنایا جا رہا ہے کہ صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے بھی علماء احناف قرأت خلف الامام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اور احادیث نبویہ سے کھلی ہوئی مخالفت کر رہے ہیں

حالانکہ مسئلہ کے تحقیقی اور استدلالی پہلو پر اگر انصاف سے نظر ڈالی جائے تو احناف اس مسئلہ میں نہ اپنی رائے میں متفرد ہیں۔ اور نہ شاہراہ اور جادہ حق سے ان کے قدم ہٹے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس اہم موضوع پر ایک ایسی علمی تحقیق پیش کی جائے جو نہ صرف توضیح مسئلہ کے لیے مفید ہو۔ بلکہ اظہار حق فی ہذا الباب کے لیے برہان ساطع کی حیثیت بھی رکھتی ہو۔ خدا تعالیٰ جزا خیر دے۔ مصنف احسن الکلام حضرت علامہ مولانا ابو الزہد محمد سرفراز خاں صفدر صاحب کو کہ اس نے اس ضرورت کو پورا فرما دیا۔ اور اپنی علمی تحقیقات کو اس مسئلہ کے بارے میں ایک ایسی کتاب کی شکل میں علماء اُمت کے سامنے پیش فرمایا جس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کچھلی تمام ان کتابوں سے یہ کتاب مستغنی کر دینے والی ہے، جو اس مسئلہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ کتاب اپنے حسن ترتیب اور مضامین کی شائستگی اور مکمل تشریح مسئلہ کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جن کی وجہ سے کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ اہل انصاف عموماً احناف خصوصاً اس کو اپنے لیے بیش بہا تحفہ اور مبارک ہدیہ سمجھیں۔ سب سے زیادہ قابل ستائش اور لائق تحسین خصوصیت یہ ہے کہ ملت کے بلند پایہ علماء کرام اور ائمہ عظام کے صحیح اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ مدعی کے اثبات اور تحقیق انساب کے لیے مستند نقول سے کام لیا گیا ہے۔ نیز مخالفین حضرات کے اعتراضات کے جوابات ایسے تسلی بخش طریقہ سے دیے گئے ہیں جو انصاف پسند حضرات کے لیے موجب تسکین ہیں۔ امید کہ اہل علم حضرات اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف مدظلہ کی اس سعی و کوشش کو قبول فرمائیں اور اس کا خیر کے بدلہ میں ان کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔ وصلى الله تعالى على اخير خلقه محمد وآله وصحبه اجمعين۔

۱۳۷۴ھ

عبدالحق عفی عنہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ ننگل ضلع پشاور (سرحد) اشوال

پیر کمال عالم بمبیل حامی سنت حاجی بدعت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ^{تعالی} _{رحمۃ اللہ علیہ}

سابق مہتمم مدرسہ عربیہ سراج العلوم سرگودھا

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَحْدَهُ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى مَنْ آتَى بَعْدَهُ۔ اِنَّا بَعْدُ نَذِيهِ دُنْيَا فِي مَنْتَقَلَاتِ

اور تعامل کو دیکھا جاتا ہے۔ قرآنہ خلف الامام کے بارے میں قرن اول سے لے کر آج تک اہل اسلام کا عدم فرضیت پر جمہور کا تعامل رہا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے امام شافعیؒ سہری نمازوں میں (وجوب قرآنہ فاتحہ کے دعوے میں) منفر وہیں۔ اسی واسطے محققین شوافع اس کے قائل نہیں۔ منقولات میں سے جہری (بلکہ جملہ) صلوات میں واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا نقص قطعی ہے۔ اطلاق الفاظ سے قطع نظر خود شان نزول بھی آیت کا بتصریح ائمہ کرام حصہ نماز ہے۔ سہری نمازوں میں آثار مرفوعہ و موقوفہ کے تبادر سے عدم قرآنہ مقتدری ثابت ہوتی ہے بلکہ بعض آثار میں وعیدیں بھی موجود ہیں۔ مجزین حضرات کی جانب سے (اصولاً) بقائتہ الکتاب پیش کی جاتی ہے جو حضرت جابر اور امام احمد اور سفیان جیسے جلیل القدر حضرات منفرہ کے حق میں فرما رہے ہیں۔ باقی جہنی حدیثیں قرآنہ خلف الامام کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں بعض صحیح نہیں اور جو صحیح ہیں وہ دلالت علی المقصود پر صریح نہیں۔ بایں ہمہ اخاف کی طرف سے جب کبھی اس مسئلہ پر کچھ لکھا گیا ان کی اس میں دفاعی حیثیت ہے۔ اقدام ہمیشہ مجزین حضرات سے ہوتا رہا وہ بھی اس طعن کیساتھ کہ اخاف کی نماز مردود اور باطل ہے وغیرہ وغیرہ۔ بقول متر کیا نہ کرتا۔ مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑا۔ حضرت محقق مولانا محمد سر فراز خاں صدقہ زید علیہ نے اس بارے میں ایک مبسوط کتاب احسن الکلام لکھی ہے۔ اس میں بلا مبالغہ محقق مصنف نے بغیر تعصب کے میر حاصل بخش فرمائی ہیں اور اس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ پر کلام مشہج فرماتی ہے: ع

آخر آمد بود فخر الاولین!

شاید اس کے بعد کسی راو اور مردود کو قلم اٹھانے کا موقع بھی نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے صالت باقیات میں اس تصنیف لطیف سے اضافہ فرمادے اور عامۃ المسلمین کو متمتع فرماوے آمین۔
احقر ابو سعید محمد شفیع عفی عنہ سرگودھا۔

اسوۃ صاحبین شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد نصیر الدین صاحب غور غشتی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔ میں نے کتاب حسن الکلام

کی دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا نہایت عمدہ اور مفید کتاب ہے اہل اسلام کو مناسب ہے کہ اس کا

مطالعہ کریں خصوصاً احناف کو (اور ان احناف کو تو علی الخصوص) اس کا مطالعہ ضروری ہے جو کہ اپنے مذہب کے معتبرات سے ناواقف ہیں۔ وصلى الله على رسوله وخير خلقه محمد وعلى آله واصحابه وجميع امته اجمعين۔

مسکین نصیر الدین غورغشوی

اُتَاذُ الْعِلْمِ بِرَأْسِ الْمُحَقِّقِينَ

حضرت مولانا محمد شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم

ترنگ زئی ضلع پشاور

سابق وزیر معارف شریعہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان۔ شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اجمیل، حالاً شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ

بہاول پور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ نَحْمَدُكَ يَا رَسُولَ الْكَرِيمِ مَا بَعَدَ أَحْسَنَ الْكَلَامِ فِي

تَرَكَ الْقُرْآنَ خَلْفَ الْأَمَلِ تصنیف مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر کو میں نے بغور خط کیا۔ اس مسئلہ پر قبل ازیں نفیاً و اثباتاً کافی رسائل و اجزاء لکھے گئے ہیں لیکن ان سب میں زیر تبصرہ کتاب کی شان نزالی ہے۔ مصنف علام کو حفاظت اصول و فروع دین و رد غلو غالین و تحریفیات مبتدعین میں ایک ممتاز ملکہ حاصل ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ مساعیہ احسنہ الکلام کے درجہ میں اور بنیادی اجزاء اٹھ ہیں۔ پہلے حصہ میں مذہب حنفی یعنی منہجیت فاتحہ خلف الانام کو کتاب اللہ و احادیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و آثار صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور اولہ عقلیہ قیاسیہ و اجتہادیہ ثابت کیا گیا ہے۔ یہ اس حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ دوسرے حصہ میں مخالفین کی دعویٰ کنیت فاتحہ کے دلائل قرآنیہ، حدیثیہ، ائمریہ اور عقلیہ کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ دوسرے حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ گویا پہلے حصے میں مذہب حنفیہ کے مثبت پہلو کا بیان ہے اور دوسرے

حصے میں منفی پہلو کا۔

بہر حال یہ کتاب بلحاظ کثرت مواد، سلاست بیان و ضبط و لائل و رد اشکالات مخالفین اور جامعیت جمیع ابحاث متعلقہ بالموضوع کے لحاظ سے اپنی شان میں بے نظیر ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف علام کی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور مسلمانوں کو اس کتاب سے نفع اٹھانے کی توفیق بخشے۔ آمین

شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ

۲۵ محرم ۱۳۹۶ھ

جامعہ اسلامیہ بہاولپور

۱۶ مئی ۱۹۷۶ء

محقق جلیل فاضل لبیب حضرت علامہ مولانا محمد عبدالرشید صانعا دافیوہم

باسمہ سبحانہ و بجزءہ اما بعد

بگرامی خدمت مخدوم و مکرم حضرت مولانا صفدر صاحب متع اللہ تعالیٰ المسلمین بفیوضہم

و برکاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بفضلہ تعالیٰ آپ کی گراں قدر تصنیف نبیہ احسن الکلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گیا کہ مطالعہ

سرسری تھا قیلولہ کے وقت تاہم مستفید ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی مشکوٰۃ

فرمائے۔ آپ نے بحث کا خوب احاطہ کیا۔ بڑی اچھی کتاب لکھی۔ تحقیق الکلام کے جواب کا قرض

جو حنفیوں کے ذمے چلا آتا تھا مع شے زائد ادا کرو یا۔ جزاک اللہ تعالیٰ عتدا و عن سائر المسلمین

خیراً۔ گو بعض جگہ بحث کا رنگ غیر مقلدوں (نام نہاد اہلحدیث) کی طرح متعنتانہ ہو گیا، مگر اس

سلسلہ میں غالباً آپ کا عذر یہ ہو گا کہ خصم نے اس طرز پر مجبور کیا کہ قدیم زمانے سے خصم نے ظلم

کا یہی طریق اپنا رکھا ہے۔ والباوی ظلم۔ والسلام

خاکسار نعمانی از گراچی

۲۹ شعبان ۱۳۹۵ھ

نوٹ: حضرت علام نے چند غلطیوں کی نشاندہی فرمائی جن کی اب اصلاح کر لی گئی ہے۔ (صفدر)

حضرت العلامة فقیہ جلیل مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم

مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ احسن الکلام کی تحقیق عمیق اور جامعیت دیکھ کر

بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں۔ فقط والسلام

رشید احمد

از اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

۱۳ رمضان ۱۳۹۸ھ

نوٹ: حضرت مفتی صاحب نے بھی چند اغلاط کی اصلاح کا مشورہ دیا۔ جن کی

اس طبع میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ (صدقہ)

دیباچہ طبع سوم

مُبَسِّمًا وَمُحَمَّدًا وَمُصَلِّيًا

ابا بعد راقم اشیم اللہ تعالیٰ کے بے حد و لا شمار انعامات و احسانات کا شکر یہ کس زبان سے ادا کئے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے اس گنہگار کو جہاں اور جتنی اور معنوی انعامات سے نوازا وہاں دین کی خدمت اور تالیف کتب کا زترین موقع بھی مرحمت فرمایا اور بفضلہ تعالیٰ راقم اشیم کی ہر کتاب اپنی اپنی جگہ مفید ثابت ہوئی۔ فی اللہ تعالیٰ الحمد زیر نظر کتاب احسن الکلام کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی سے جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔ وہ پاک و ہند کے جید اور نامی گرامی علماء کرام کی عمدہ آرا اور بلند پایہ تصدیقات سے بالکل عیاں ہے اور ان حضرات میں سے بعض وہ بزرگ ہستیاں ہیں کہ علمی اور تحقیقی طور پر وہ بین الاقوامی شہرت و حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے علم پر عوام تو کیا بلکہ خواص اور مزید براں خواص الخواص کو بھی کلی اعتماد ہے۔ اس دیباچہ میں ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ چند ضروری باتیں عرض کرتے ہیں۔

۱۔ طبع دوم کے دیباچہ میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ جو حضرات (ان کا نقطہ نظر خواہ کچھ ہی) ہماری کوتاہیوں پر ہمیں آگاہ کریں گے تو ہم ان کا شکر یہ ادا کریں گے۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ ہماری یہ آواز صد اب صراحتاً ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ خاصی مفید رہی ہے۔ چنانچہ فاضل جلیل محقق العصر حضرت العلامة مولانا محمد عبدالرشید صاحب نعمانی دامت برکاتہم اور عالم سحر پر نور سلف فقیدہ برائے

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت فیوضہم کہ اچھی نے بعض اغلاط کی نشاندہی کی جن کی اب تصحیح کر دی گئی ہے اور ہم ان حضرات کے ممنون احسان ہیں۔ اسی طرح ہمارے کرم فرما معترض صاحب نے ترجمان الحدیث میں ایک راوی کی تعیین کے بارے میں غلطی بتائی ہے۔ ہم نے اس کی بھی اصلاح کر دی ہے اور وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں بایں ہمہ اب بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ طبع ہذا اغلاط سے بالکل مبتلا ہے۔ بھلا انسان کا کام اور وہ بھی راقم اٹیم جیسے بے بضاعت اور پُرِ تَقْصیر کا کام غلطی سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ

تم تو چھوٹوں کے طلب گار نظر آتے ہو

میسرہ دامن میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر اب بھی ہم شرح صدر کے ساتھ کہتے ہیں کہ معقول اغلاط کی نشاندہی پر ہم ہر وقت شکرگزاری کے لئے تیار ہیں۔

۳۔ احسن الکلام کے معرض وجود میں آنے کی وجہ سبب تالیف میں باحوالہ مفصل مذکور ہے کہ فریق ثانی امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض قرار دیتا ہے اور نہ پڑھنے والوں کی نماز کو ناقص کا عدم، بیکار اور باطل قرار دیتا ہے۔ اور خفیوں کو بے نماز اور مفسدین صلوات کے خطاب سے نوازتا ہے اور حتیٰ کہ احناف کی عورتوں سے بلا طلاق غیر مقلدوں کا نکاح جائز قرار دیتا ہے اور امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کو کافر اور مخلد فی النار تک ناروا فتووں سے رگیدتا ہے۔ اور ظاہر امر ہے کہ فرضیت قطعی دلیل کے بغیر توہرگز ثابت نہیں ہو سکتی اور اہل علم جانتے ہیں کہ قطعی دلیل نص قرآنی، خبر متواتر اور اجماع ہی ہے ان کے علاوہ اور کوئی دلیل قطعی نہیں مگر یقین جانیے کہ فریق مخالف اپنے اس باطل اور بے بنیاد دعوے پر ایک بھی حوالہ اور دلیل نہیں پیش کر سکا اور نہ تا قیامت پیش کر سکتا ہے اور جو غیر متعلق اور بے جان دلائل انھوں نے پیش کیے ہیں ان کا حال احسن الکلام سے بفضلاً بجا بخوبی واضح ہو چکا ہے اور کتاب کو پڑھنے والا ہر منصف مزاج اس کو سمجھ سکتا ہے۔

۴۔ ترجمان الحدیث میں عین اس دور میں جبکہ تحریک ختم نبوت اپنے عروج پر تھی مسلمان تو کیا حتیٰ کہ خود کو مسلمان کہلانے والے طبقے بھی مرزائیوں کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں

قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اور ہمارے کرم فرما ترجمان الحدیث میں قسط وار احسن الكلام پر برسے میں اور اس میں کثیرے نکالنے میں مصروف تھے اور تحریک ختم نبوت کے قائد اور روح رواں حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری المتوفی ۱۳۹۷ھ کو ان کے استاذ محترم کی کتاب "نبیل الفرقین" ص ۷۰ کے ایک حوالہ کے پیش نظر بلاوجہ ان الفاظ سے خطاب کیا جا رہا تھا کہ کیا حضرت (مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) کا شمیروی اور ان کے تلامذہ بالخصوص حضرت بنوری یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل بدینہ کا مسلک ترک رفع الیدین تھا؟ بلقلم (ترجمان الحدیث) بابت ماہ نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۷۔ ہر سجدہ آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک خالص اسلامی اور مذہبی تحریک کے قائد کو تحریک کے دور میں ان کے استاذ محترم کا حوالہ نکال کر کوسنا اور مطعون کرنا اور وہ بھی محض ایک فرعی مسئلہ میں کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن اس متعصبانہ کا روائی سے ان کی شخصیت اور عظمت میں کیا فرق پڑا؟ آخر انہیں کی مبارک قیادت میں یہ مشکل ترین مسئلہ حل ہوا اور قانونی طور پر مرزائیوں کے ہر دو فرقے (قادیانی اور لاہوری) کا فر قرار دیے گئے۔ ولعمہ ما قبل ے

جنہیں حقیقہ سمجھ کر بچھا دیا تم نے

وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

۴۔ جہور اہل اسلام اور ان میں سے علی الخصوص احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم اس مسئلہ کو اختلافی مسئلہ سمجھتے ہیں اور صرف یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ سمیت کسی بھی قسم کی قرأت ممنوع اور مکروہ ہے۔ نہ تو وہ اس مسئلہ میں کسی کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ کسی کی منکوحہ بیوی چھیننے کا فتویٰ دیتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسئلہ کی وجہ سے فی النار والسقر تک پہنچاتے ہیں مگر فریق ثانی کو لفظ مکروہ بھی خاصا چھتا ہے۔ چنانچہ ترجمان الحدیث ص ۱۸ بابت ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں مشہور مؤرخ اسلام اور حنفی عالم کا شکوہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی سے سبھی اہل علم واقف ہیں کسی دور میں ان کا مشہور قول تھا کہ آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، غیر مقلد نہیں ہو سکتا یہ بزرگ فاتحہ خلف الامام کو مکروہ خیال کرتے تھے..... الخ بقول ناقل حضرت مولانا شبلی مرحوم کا مشہور قول آخر بلاوجہ توہم گز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس کی تہ میں کچھ ہوگا اور انہوں نے ضرور کچھ محسوس کیا ہوگا۔ نیز اگر واقعی احناف کی نماز کا عدم، بے کار اور باطل ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ

فاتحہ نہیں پڑھتے اور نہ اس کے قائل ہیں۔ اور مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں کہ جو حکم امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کا ہے وہی حکم نہ پڑھنے کا حکم دینے کا ہے اور ہر محقق حنفی یہی کچھ کہتا ہے تو غیر مقلدین حضرات اپنے شیخ الکل مولانا سید زبیر حسین صاحب (المتوفی ۱۳۲۰ھ) کی زندگی بھر کی جمعہ کی نمازوں کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ آیا ان کی نمازیں ادا ہوتی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ لکھنے والوں نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ بلکہ مدت العرشا ہی مسجد (دہلی) کے حنفی امام کے پیچھے نماز جمعہ ادا فرماتے رہے۔ (مقدمہ معیار الحج تصدق) اس سے یہ بات بالکل روشن اور عیاں ہو گئی کہ غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکل نہ صرف یہ کہ حنفی امام کو مسلمان سمجھتے بلکہ ان کو اپنے سے بہتر قرار دے کر مدت العمر ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز ادا کرتے رہے۔ لہذا غیر مقلدین حضرات کو اس ناروا غلو اور بے بنیاد دعوے سے فوراً رجوع کر لینا چاہیے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی قرأت نہ کرنے والے اور اسی طرح اس کو ضروری نہ قرار دینے والے مسلمان نہیں یا کم از کم بہتر مسلمان نہیں یا بے نماز اور مفسدین صلوات ہیں کیونکہ اس باطل نظریہ سے احناف کا تو کچھ نہیں بچو تا۔ البتہ خود ان کے اکابر اس کی زد میں آتے ہیں اور اس باطل دعوے سے خود ان کے بزرگوں کا دامن علم و تقویٰ مطعون و مجروح ہوتا ہے۔ غور کرنا خود ان کا کام ہے:۔

اگر کچھ کم ہے جو کچھ ہو چکا بیدار کرنے کو
تو کل افسانہ عبرت کے عنوان اور بھی ہوں گے

۵۔ ترجمان الحدیث میں کئی قسطوں میں احسن الکلام پر اکثر وہی اعتراضات قدرے تشریح کے ساتھ بد مزہ سے بد مزہ کر کے پیش کیے گئے ہیں جن کے اصولی طور پر مدلل جوابات یا حوالہ احسن الکلام میں مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت قتادہ مدلس ہیں۔ حضرت ابواسحاق مختلط اور مدلس ہیں۔ محدث ابوالنیر مدلس ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ اور امام محمد ضعیف ہیں۔ محدث ابن اسحاق اور نافع اور علامہ ابن عبد الرحمن ثقہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ انہیں یہ کہ فلاں آدمی کے بارے میں احسن الکلام میں تضعیف یا توثیق کا فلاں جملہ نقل نہیں کیا گیا اور فلاں عبارت کا معنی غلط کیا ہے اور فلاں موقوف حدیث کو مرفوع بنا دیا ہے اور فلاں حوالے میں کتب بیونت کی ہے اور فلاں عبارت کا صحیح مطلب مولف احسن الکلام اپنی جہت

کی وجہ سے نہیں سمجھ سکا اور فلاں جگہ دجل و تبلیس سے کام لیا ہے اور فلاں عبارت کو سیاق و سباق سے الگ کر کے مطلب لیا ہے اور فلاں مقام پر راوی کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اسی راوی کو متناہت اور شاہد میں پیش کر کے اس سے احتجاج کیا ہے اور ہمارے فلاں راوی کو ضعیف کہہ دیا ہے اور فلاں راوی کو اپنے ہاتھ کے کرب سے ثقہ کر دکھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بجا اللہ تعالیٰ اہل علم اور سمجھدار حضرات احسن الکلام کے مضبوط اور ٹھوس دلائل اور روشن حوالوں اور اس کی عمدہ ترتیب اور سلاست سے بخوبی واقف ہیں اور ان تمام رکیک شبہات کا رد اس میں مذکور ہے۔ ہمیں مزید کچھ کہنے اور لکھنے کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ محض کپڑے نکالنے اور اعتراضات کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ پتھرت دیا نند سر سوتی نے اپنی کتاب سیتا رتھ پرکاش کے چودھویں باب میں بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن کریم پر اعتراضات کیے ہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) لیکن اس سے کلام اللہ تعالیٰ کی صداقت و عظمت پر کیا زبردستی یا پٹریا پٹریا کی جاسکتی ہے؟ منکرین حدیث مجموعی طور پر کتب حدیث پر بیستے رہتے ہیں مگر اس سے دینی کتب کے اس عظیم ذخیرہ میں کیا کمی اور نقص پیدا ہو سکتا ہے؟ خود غیر مقلد حضرات فقہ حنفی کی مشہور اور متداول کتابوں پر اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کتاب حقیقۃ الفقہ اور نتائج التقلید وغیرہ میں اس امر کا واضح اور واضح ثبوت موجود ہے۔ اور فتاویٰ عالمگیری پر ان کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ تو قریب کے حلقوں میں پان فروشوں اور انڈے فروشوں تک پہنچ چکے ہیں لیکن اس سے ان کو بجز اپنے دل ماؤن کی بھڑاس نکالنے کے اور کیا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ تمام کتابیں بھی موجود ہیں اور ان میں مذکور ہزارہا مسائل بھی موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق برابر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی طرح اگر بعض مہربانوں کی طرف سے احسن الکلام پر بھی کچھ لایعنی سوالات ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں تو اس سے اس کے صحیح دعاوی اور قومی دلائل اور حکم برہان میں کیا فرق پڑتا ہے۔ اہل خرد جانتے ہیں کہ نرمی لفاظی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا،

الفاظ کے سچوں میں الجھتے نہیں دانا

خواص کو مطلب تک صدف سے کہ گہر سے

۶۔ ہماری دانست میں ترجمان الحدیث میں احسن الکلام پر کیے گئے جملہ اعتراضات میں

صرف دو باتیں علمی طور پر قابل توجہ ہیں۔ ممکن ہے بعض اہل علم کو ان سے مغالطہ پیدا ہو۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں نقل کر کے قدرے تفصیل سے ان کے جوابات عرض کر دیے جائیں تاکہ کسی کو غلط فہمی پیدا نہ ہو اور صحیح بات بھی سامنے آجائے۔

اقل ہم نے احسن الکلام میں اسرائیل عن ابی اسحاق کی ایک سند سے استدلال کیا تھا۔ اس سچ گرفت کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ جون ۱۹۷۴ء میں صفحہ ۷ تا ۲۸ اس مشہور محدث اور صحیحین کے مرکزی راوی امام ابو اسحاق کے اختلاط اور ان کی تدلیس پر خاصی ملاحظہ حاصل بحث کی ہے جس کی چند اہم اور مرکزی باتیں یہ ہیں:

(۱) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بخاری میں ان سے بجز ان کے اصحاب قدمائے اور کوئی روایت میں نہیں دیکھی۔ (ہدی الساری جلد ۲ ص ۱۹۹)

(۲) ابو اسحاق مدلس تھے اور ان کا غنہ صحت حدیث کے منافی ہے اور آخر عمر میں اختلاط اور تغیر کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (ترجمان مذکور ص ۲۸)

(۳) زہیر کی روایت عن ابی اسحاق امام بخاری اور محدث مبارک پوری کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ امام ابو داؤد زہیر عن ابی اسحاق کو اسرائیل عن ابی اسحاق سے بدرجہا بہتر قرار دیتے ہیں اور بقول امام احمد اسرائیل نے ابو اسحاق سے اختلاط کے بعد بھی سنا ہے۔ (ص ۲۷) لہذا ان کو ان پر کوئی مزیت حاصل نہیں۔
الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے دفع الوقتی کے سوا کچھ نہیں ترتیب وار جوابات ملاحظہ کیجیے:

(۱) خود حافظ ابن حجر ہی امام ابو زرہ رحمہ امام ابو حاتم رحمہ اور امام احمد رحمہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ زہیر نے ابو اسحاق رحمہ سے آخر عمر میں ابو اسحاق رحمہ کے غلط ہونے کے بعد سماعت کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۵۲)

اور زہیر کی ابو اسحاق رحمہ سے بخاری ج ۱، ص ۲۷ اور ج ۱ ص ۳۹ اور ج ۱ ص ۲۲۷ وغیرہ میں روایتیں موجود ہیں اور حافظ ابن حجر رحمہ زکریا بن ابی زائدہ رحمہ کے بارے میں امام احمد رحمہ اور محدث عجل رحمہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابو اسحاق رحمہ سے آخر عمر میں سماعت کی ہے۔

(دیکھیے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۳۰)

اور زکریا بن ابی زائدہ رحمہ کی ابو اسحاق رحمہ سے روایت بخاری ج ۱ ص ۲۲۲ وغیرہ میں موجود ہے۔

اور خود معترض مذکور امام ابو داؤد درج کی تحقیق کے پیش نظر اسرائیل رح کی ابواسحاق رح سے روایت ان کے اختلاط کے بعد بھی تسلیم کرتے ہیں اور بخاری ج ۱ ص ۵۰۵ و ۵۰۶ و ۵۱۲ وغیرہ میں اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کی سند سے کئی روایات موجود ہیں پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ بخاری میں ابواسحق رح کے ان قدیم شاگردوں کی روایات ہی مذکور ہیں جنہوں نے ان سے اختلاط سے قبل سماعت کی ہے۔ بس یہی کہا جائے گا کہ ابواسحق رح ایسے مختلط ہوئے ہی نہیں کہ ثقاہت سے گریز کریں اور اسرائیل رح کی روایت ابواسحاق رح سے اثبت اور راجح ہے۔ ہاں بعض کے نزدیک اگر آخر عمر میں ان کے حافظہ میں کچھ تغیر ہوا ہے تو اس دور میں زہیر نے ان سے سماعت کی ہے۔

(۲) اگرچہ امام بخاری رح اور مبارک پوری صاحبؒ کے نزدیک زہیر عن ابی اسحق رح کی روایت راجح ہے مگر امام ابو زرعہ رح، امام ابو حاتم رح، امام احمد رح اور امام ترمذی رح وغیرہم حضرات کی تحقیق کے لحاظ سے زہیر کی ابواسحاق رح سے روایت کمزور ہے اور ابو داؤد رح کے علاوہ باقی تقریباً تمام حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اصح اور راجح قرار دیتے ہیں اور اس کے متعلق احسن الکلام میں واضح حوالے موجود ہیں وہیں ملاحظہ کر لیں۔ یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) اسرائیل رح کے بارے میں امام احمد رح کی یہ رائے کہ انہوں نے ابواسحاق رح سے آخر عمر میں سماعت کی منفرد رائے ہے اور باقی حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اثبت کہتے ہیں لہذا جمہور کے نزدیک اسرائیل عن ابی اسحق رح کی سند بلاشبہ صحیح اور راجح ہے۔

دوم۔ احسن الکلام میں ابوالزبیر عن جابرؓ کی ایک سند سے احتجاج کیا گیا تھا اس پر کلام کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ فروری ۱۹۷۴ء تا ۲۹ ماہ مارچ ۱۹۷۴ء ص ۳۸ تا ۴۸ میں مشہور محدث ابوالزبیر (محمد بن مسلم بن تدریس) کے عنعنہ پر طویل اور ناکام بحث کی ہے جس کے مرکزی نکات یہ ہیں:

(۱) ابوالزبیر مدلس تھے اور محدثین کرام رح کی خاصی جماعت نے ان کے مدلس ہونے کا ذکر کیا ہے اور بعض محدثین کے حوالے بھی انہوں نے ذکر کیے ہیں۔

(۲) ابوالزبیر کی لیدت رح کے طریق اور سند سے عنعنہ والی روایت تو صحیح اور قابل قبول ہے مگر اس کے علاوہ ابوالزبیر رح کی کوئی روایت جو عنعنہ سے ہو قابل قبول نہیں ہے اس پر

بھی چند حوالے انھوں نے نقل کیے ہیں۔

(۳) ابوالزبیر کی جن روایات میں تحدیث ہے وہ تو قابل قبول ہیں اور جن روایات میں ان کا عنعنہ ہے اور وہ لیکٹ کے طریق سے بھی نہیں تو چونکہ دیگر حضرات صحابہ کرام رض سے بھی وہ روایات مروی ہیں۔ بنا بریں اگر ابوالزبیر کے سماع کی تصریح ان مخصوص الفاظ سے نہ بھی ملے تب بھی صحت حدیث پر کوئی حرف نہیں آتا۔ (محصلاً)

الجواب۔ معترض صاحب نے یہ جو کچھ بھی کہا ہے ان کو سود مند نہیں ہے۔

اول تو اس لیے کہ بلاشبہ ابوالزبیر کا نام مدلسین کی فہرست میں موجود ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں جتنے حوالے اس سلسلہ میں معترض صاحب نے نقل کیے ہیں اگر ہم چاہیں تو بحمد اللہ تعالیٰ ان سے دو گنے حوالے مزید نقل کر سکتے ہیں لیکن ابوالزبیر رح ان مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس مضر نہیں اور احسن الکلام میں توجیہ النظر کے حوالہ سے اس کی بحث موجود ہے جس کی قدر سے تفصیل یہ ہے کہ علامہ جزائری نے حافظ ابن حزم کے حوالہ سے مدلسین کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم ان مدلسین کی ہے جو حافظ و عادل ہوں اور ان کے بارے میں وہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وسواء قال اخبرنا فلان او قال عن فلان
او قال فلان عن فلان كل ذلك واجب قبوله
مالم يتيقن انه اور حدیثاً بعینہ
ایراد غیر مسند فان ایقنا ذلك
ترکنا ذلك الحدیث وحده فقط و
اخذنا سائر روایاتہ
وهذا النوع منهم كان حلة
اصحاب الحدیث وائمة المسلمین
كالحسن البصری وابی اسحاق
السبیعی وقتاده بن دعامة وعمر و
بن دینار و سلیمان الاعمش و ابی

اور برابر ہے کہ وہ مدلس اخبرنا فلاں کہے یا
عن فلاں کہے یا قال فلاں عن فلاں کہے ان سب
صورتوں میں اس کی روایت واجب القبول ہے
جب تک کہ یہ یقین نہ کر لیا جائے کہ اس نے کوئی
حدیث غیر مسند پیش کی ہے اور جب ہمیں اس کا
یقین ہو جائے کہ اس نے فلاں حدیث مسند بیان
نہیں کی تو ہم صرف وہی روایت اس کی ترک کریں گے
اور باقی اس کی تمام روایات لیں گے
اور اس قسم میں بڑے بڑے محدثین اور ائمہ المسلمین
شامل ہیں جیسے حسن بصری ابواسحاق السبیعی
قاده بن دعامة، عمرو بن دینار، سلیمان الاعمش،

الزبير وسفيان الثوري وسفيان بن عيينة
ابو الزبير، سفيان ثوري اور سفيان بن عيينہ

اصول الاحكام ج ۲ ص ۱۲۱ لابن
كتاب الاحكام في اصول الاحكام جلد ۲

حزم وتوجيه النظر ص ۲۵۱ للجزائري
لابن حزم وتوجيه النظر ص ۲۵۱ للجزائري

۱ اہل علم جانتے ہیں کہ بیشتر صحیح احادیث کے روایات یہی حضرات ہیں اس عبارت سے یہ ضابطہ معلوم ہوا کہ ان مذکورہ حضرات کی جن میں ابو الزبیر رحمہ بھی شامل ہیں معنی احادیث مطلقاً قابل قبول ہیں اور ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں اور امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ چوٹی کے محدثین نے ان حضرات کی معنی روایات سے استدلال کیا ہے چنانچہ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ

وفي الصحيح قطعة من الاحتجاج
صحيح (يعني بخاري ومسلم) في مدلس کے عنعنہ
يعتق المدلس كابي الزبير عن جابر
والى روايتوں سے احتجاج کا ایک کافی حصہ موجود
وسفيان عن عمرو بن دينار ونظائر
ہے جیسے ابو الزبير عن جابر رضی اور سفيان عن
عمر بن دينار اور اس جیسی بکثرت نظیریں۔
كثيرة لذلك - (تہذیب سنن ابی داؤد،
جلد ۷ ص ۹۸)

امام بخاری نے ابو الزبیر کی مقرون بظلمہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ جلد ۱ ص ۲۹۱ اور
جلد ۱ ص ۹۸ و جلد ۱ ص ۲۳۳ میں ابو الزبیر عن جابر رضی کو متابعات میں پیش کیا ہے اور اسی طرح جلد
ص ۱۷۶ میں بھی لیکن کتابت کی غلطی سے ابو الزبیر کی جگہ ابو زید لکھا گیا ہے۔

(دیکھیے مصری نسخہ بخاری مع شرح فتح الباری جلد ۳ ص ۲۳۱ و عمدة القاری جلد ۸ ص ۱۲)
بلکہ امام بخاری رحمہ نے ابو الزبیر رحمہ عن جابر رضی کی سند سے احتجاج بھی کیا ہے۔ اہل علم بخبری جانتے
ہیں کہ امام بخاری رحمہ فقہی مسائل بیان کرنے کے لیے باب ترجمہ اور عنوان قائم کرتے ہیں اور علماء
کا مشہور مقولہ ہے فقہ البخاری فی الابواب والترجم۔ پھر اس دعوے کے اثبات کے لیے
کبھی تو وہ مسند اور مرفوع روایت پیش کرتے ہیں اور کبھی معلق روایت اور کوئی اثر
نقل کرتے ہیں اور اس طریقے سے وہ اپنے دعوے کو مدلل اور مبرہن کرتے ہیں۔ امام بخاری

نے جلد ۲۲۳ میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ باب الاہلال من البطحاء وغیرھا للہکی.... الخ یعنی مکہ مکرمہ میں رہنے والے کا بطحی وغیرہا سے احرام باندھنے کا باب۔ (منی کے قریب ایک جگہ ہے جس میں بکثرت سنگ مرمریے ہیں اس کو بطحی، ابطح، محصب، حصبہ اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ اس وقت اس کے قریب کلثیہ عبدالعزیز یعنی عبدالعزیز کا لچ ہے) اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اس دعوے کے اثبات کے لئے وقال ابو الزبیر عن جابر رضی اللہ عنہ من البطحاء کے اثر سے احتجاج کیا ہے باب میں پیش کردہ اس دعویٰ کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل انہوں نے پیش نہیں کی انصاف شرط ہے کہ احتجاج اور استدلال اور کیا ہوتا ہے؟ اگر امام بخاری رحمہ اللہ نے اس دعوے کے اثبات کے لیے کوئی اور سند اور مرفوع حدیث پیش کی ہوتی اور ساتھ یہ اثر بھی پیش کیا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ ابو الزبیر رحمہ اللہ عن جابر رضی اللہ عنہ کا اثر صرف متابعت میں پیش ہوا ہے مگر ایسا نہیں ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

واختج الجملہ بحديث ابى الزبير
عن جابر رضی اللہ عنہ وهو الذى علقه المصنف
في هذا الباب..... الخ
جمہور نے ابو الزبیر رحمہ اللہ عن جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے
احتجاج کیا ہے اور وہ یہی حدیث ہے جس کو امام بخاری
نے اس باب میں معلق بیان کیا ہے۔

(فتح الباری جلد ۲ ص ۲۵۲)

الغرض جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ ابو الزبیر رحمہ اللہ عن جابر رضی اللہ عنہ کی سند سے احتجاج کرتے اور اس کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

دوئم اس لیے کہ اگر صرف لیث رحمہ اللہ عن ابی الزبیر رحمہ اللہ کی سند سے ہی ابو الزبیر کی معنعن حدیثیں صحیح ہیں اور باقی نہیں تو پھر مسلم شریف کی ان تمام روایات کی صحت کا انکار کر دیا جائے، جو ابو الزبیر رحمہ اللہ سے من غیر طریق لیث معنعن مروی ہیں۔ مثلاً جلد ۱ ص ۲۲۲ و ص ۲۲۳ و ص ۲۲۴ و ص ۲۲۵ و ص ۲۲۶ و ص ۲۲۷ و ص ۲۲۸ و ص ۲۲۹ و ص ۲۳۰ و ص ۲۳۱ و ص ۲۳۲ و ص ۲۳۳ و ص ۲۳۴ و ص ۲۳۵ و ص ۲۳۶ و ص ۲۳۷ و ص ۲۳۸ و ص ۲۳۹ و ص ۲۴۰ و ص ۲۴۱ و ص ۲۴۲ و ص ۲۴۳ و ص ۲۴۴ و ص ۲۴۵ و ص ۲۴۶ و ص ۲۴۷ و ص ۲۴۸ و ص ۲۴۹ و ص ۲۵۰ و ص ۲۵۱ و ص ۲۵۲ و ص ۲۵۳ و ص ۲۵۴ و ص ۲۵۵ و ص ۲۵۶ و ص ۲۵۷ و ص ۲۵۸ و ص ۲۵۹ و ص ۲۶۰ و ص ۲۶۱ و ص ۲۶۲ و ص ۲۶۳ و ص ۲۶۴ و ص ۲۶۵ و ص ۲۶۶ و ص ۲۶۷ و ص ۲۶۸ و ص ۲۶۹ و ص ۲۷۰ و ص ۲۷۱ و ص ۲۷۲ و ص ۲۷۳ و ص ۲۷۴ و ص ۲۷۵ و ص ۲۷۶ و ص ۲۷۷ و ص ۲۷۸ و ص ۲۷۹ و ص ۲۸۰ و ص ۲۸۱ و ص ۲۸۲ و ص ۲۸۳ و ص ۲۸۴ و ص ۲۸۵ و ص ۲۸۶ و ص ۲۸۷ و ص ۲۸۸ و ص ۲۸۹ و ص ۲۹۰ و ص ۲۹۱ و ص ۲۹۲ و ص ۲۹۳ و ص ۲۹۴ و ص ۲۹۵ و ص ۲۹۶ و ص ۲۹۷ و ص ۲۹۸ و ص ۲۹۹ و ص ۳۰۰ و ص ۳۰۱ و ص ۳۰۲ و ص ۳۰۳ و ص ۳۰۴ و ص ۳۰۵ و ص ۳۰۶ و ص ۳۰۷ و ص ۳۰۸ و ص ۳۰۹ و ص ۳۱۰ و ص ۳۱۱ و ص ۳۱۲ و ص ۳۱۳ و ص ۳۱۴ و ص ۳۱۵ و ص ۳۱۶ و ص ۳۱۷ و ص ۳۱۸ و ص ۳۱۹ و ص ۳۲۰ و ص ۳۲۱ و ص ۳۲۲ و ص ۳۲۳ و ص ۳۲۴ و ص ۳۲۵ و ص ۳۲۶ و ص ۳۲۷ و ص ۳۲۸ و ص ۳۲۹ و ص ۳۳۰ و ص ۳۳۱ و ص ۳۳۲ و ص ۳۳۳ و ص ۳۳۴ و ص ۳۳۵ و ص ۳۳۶ و ص ۳۳۷ و ص ۳۳۸ و ص ۳۳۹ و ص ۳۴۰ و ص ۳۴۱ و ص ۳۴۲ و ص ۳۴۳ و ص ۳۴۴ و ص ۳۴۵ و ص ۳۴۶ و ص ۳۴۷ و ص ۳۴۸ و ص ۳۴۹ و ص ۳۵۰ و ص ۳۵۱ و ص ۳۵۲ و ص ۳۵۳ و ص ۳۵۴ و ص ۳۵۵ و ص ۳۵۶ و ص ۳۵۷ و ص ۳۵۸ و ص ۳۵۹ و ص ۳۶۰ و ص ۳۶۱ و ص ۳۶۲ و ص ۳۶۳ و ص ۳۶۴ و ص ۳۶۵ و ص ۳۶۶ و ص ۳۶۷ و ص ۳۶۸ و ص ۳۶۹ و ص ۳۷۰ و ص ۳۷۱ و ص ۳۷۲ و ص ۳۷۳ و ص ۳۷۴ و ص ۳۷۵ و ص ۳۷۶ و ص ۳۷۷ و ص ۳۷۸ و ص ۳۷۹ و ص ۳۸۰ و ص ۳۸۱ و ص ۳۸۲ و ص ۳۸۳ و ص ۳۸۴ و ص ۳۸۵ و ص ۳۸۶ و ص ۳۸۷ و ص ۳۸۸ و ص ۳۸۹ و ص ۳۹۰ و ص ۳۹۱ و ص ۳۹۲ و ص ۳۹۳ و ص ۳۹۴ و ص ۳۹۵ و ص ۳۹۶ و ص ۳۹۷ و ص ۳۹۸ و ص ۳۹۹ و ص ۴۰۰ و ص ۴۰۱ و ص ۴۰۲ و ص ۴۰۳ و ص ۴۰۴ و ص ۴۰۵ و ص ۴۰۶ و ص ۴۰۷ و ص ۴۰۸ و ص ۴۰۹ و ص ۴۱۰ و ص ۴۱۱ و ص ۴۱۲ و ص ۴۱۳ و ص ۴۱۴ و ص ۴۱۵ و ص ۴۱۶ و ص ۴۱۷ و ص ۴۱۸ و ص ۴۱۹ و ص ۴۲۰ و ص ۴۲۱ و ص ۴۲۲ و ص ۴۲۳ و ص ۴۲۴ و ص ۴۲۵ و ص ۴۲۶ و ص ۴۲۷ و ص ۴۲۸ و ص ۴۲۹ و ص ۴۳۰ و ص ۴۳۱ و ص ۴۳۲ و ص ۴۳۳ و ص ۴۳۴ و ص ۴۳۵ و ص ۴۳۶ و ص ۴۳۷ و ص ۴۳۸ و ص ۴۳۹ و ص ۴۴۰ و ص ۴۴۱ و ص ۴۴۲ و ص ۴۴۳ و ص ۴۴۴ و ص ۴۴۵ و ص ۴۴۶ و ص ۴۴۷ و ص ۴۴۸ و ص ۴۴۹ و ص ۴۵۰ و ص ۴۵۱ و ص ۴۵۲ و ص ۴۵۳ و ص ۴۵۴ و ص ۴۵۵ و ص ۴۵۶ و ص ۴۵۷ و ص ۴۵۸ و ص ۴۵۹ و ص ۴۶۰ و ص ۴۶۱ و ص ۴۶۲ و ص ۴۶۳ و ص ۴۶۴ و ص ۴۶۵ و ص ۴۶۶ و ص ۴۶۷ و ص ۴۶۸ و ص ۴۶۹ و ص ۴۷۰ و ص ۴۷۱ و ص ۴۷۲ و ص ۴۷۳ و ص ۴۷۴ و ص ۴۷۵ و ص ۴۷۶ و ص ۴۷۷ و ص ۴۷۸ و ص ۴۷۹ و ص ۴۸۰ و ص ۴۸۱ و ص ۴۸۲ و ص ۴۸۳ و ص ۴۸۴ و ص ۴۸۵ و ص ۴۸۶ و ص ۴۸۷ و ص ۴۸۸ و ص ۴۸۹ و ص ۴۹۰ و ص ۴۹۱ و ص ۴۹۲ و ص ۴۹۳ و ص ۴۹۴ و ص ۴۹۵ و ص ۴۹۶ و ص ۴۹۷ و ص ۴۹۸ و ص ۴۹۹ و ص ۵۰۰ و ص ۵۰۱ و ص ۵۰۲ و ص ۵۰۳ و ص ۵۰۴ و ص ۵۰۵ و ص ۵۰۶ و ص ۵۰۷ و ص ۵۰۸ و ص ۵۰۹ و ص ۵۱۰ و ص ۵۱۱ و ص ۵۱۲ و ص ۵۱۳ و ص ۵۱۴ و ص ۵۱۵ و ص ۵۱۶ و ص ۵۱۷ و ص ۵۱۸ و ص ۵۱۹ و ص ۵۲۰ و ص ۵۲۱ و ص ۵۲۲ و ص ۵۲۳ و ص ۵۲۴ و ص ۵۲۵ و ص ۵۲۶ و ص ۵۲۷ و ص ۵۲۸ و ص ۵۲۹ و ص ۵۳۰ و ص ۵۳۱ و ص ۵۳۲ و ص ۵۳۳ و ص ۵۳۴ و ص ۵۳۵ و ص ۵۳۶ و ص ۵۳۷ و ص ۵۳۸ و ص ۵۳۹ و ص ۵۴۰ و ص ۵۴۱ و ص ۵۴۲ و ص ۵۴۳ و ص ۵۴۴ و ص ۵۴۵ و ص ۵۴۶ و ص ۵۴۷ و ص ۵۴۸ و ص ۵۴۹ و ص ۵۵۰ و ص ۵۵۱ و ص ۵۵۲ و ص ۵۵۳ و ص ۵۵۴ و ص ۵۵۵ و ص ۵۵۶ و ص ۵۵۷ و ص ۵۵۸ و ص ۵۵۹ و ص ۵۶۰ و ص ۵۶۱ و ص ۵۶۲ و ص ۵۶۳ و ص ۵۶۴ و ص ۵۶۵ و ص ۵۶۶ و ص ۵۶۷ و ص ۵۶۸ و ص ۵۶۹ و ص ۵۷۰ و ص ۵۷۱ و ص ۵۷۲ و ص ۵۷۳ و ص ۵۷۴ و ص ۵۷۵ و ص ۵۷۶ و ص ۵۷۷ و ص ۵۷۸ و ص ۵۷۹ و ص ۵۸۰ و ص ۵۸۱ و ص ۵۸۲ و ص ۵۸۳ و ص ۵۸۴ و ص ۵۸۵ و ص ۵۸۶ و ص ۵۸۷ و ص ۵۸۸ و ص ۵۸۹ و ص ۵۹۰ و ص ۵۹۱ و ص ۵۹۲ و ص ۵۹۳ و ص ۵۹۴ و ص ۵۹۵ و ص ۵۹۶ و ص ۵۹۷ و ص ۵۹۸ و ص ۵۹۹ و ص ۶۰۰ و ص ۶۰۱ و ص ۶۰۲ و ص ۶۰۳ و ص ۶۰۴ و ص ۶۰۵ و ص ۶۰۶ و ص ۶۰۷ و ص ۶۰۸ و ص ۶۰۹ و ص ۶۱۰ و ص ۶۱۱ و ص ۶۱۲ و ص ۶۱۳ و ص ۶۱۴ و ص ۶۱۵ و ص ۶۱۶ و ص ۶۱۷ و ص ۶۱۸ و ص ۶۱۹ و ص ۶۲۰ و ص ۶۲۱ و ص ۶۲۲ و ص ۶۲۳ و ص ۶۲۴ و ص ۶۲۵ و ص ۶۲۶ و ص ۶۲۷ و ص ۶۲۸ و ص ۶۲۹ و ص ۶۳۰ و ص ۶۳۱ و ص ۶۳۲ و ص ۶۳۳ و ص ۶۳۴ و ص ۶۳۵ و ص ۶۳۶ و ص ۶۳۷ و ص ۶۳۸ و ص ۶۳۹ و ص ۶۴۰ و ص ۶۴۱ و ص ۶۴۲ و ص ۶۴۳ و ص ۶۴۴ و ص ۶۴۵ و ص ۶۴۶ و ص ۶۴۷ و ص ۶۴۸ و ص ۶۴۹ و ص ۶۵۰ و ص ۶۵۱ و ص ۶۵۲ و ص ۶۵۳ و ص ۶۵۴ و ص ۶۵۵ و ص ۶۵۶ و ص ۶۵۷ و ص ۶۵۸ و ص ۶۵۹ و ص ۶۶۰ و ص ۶۶۱ و ص ۶۶۲ و ص ۶۶۳ و ص ۶۶۴ و ص ۶۶۵ و ص ۶۶۶ و ص ۶۶۷ و ص ۶۶۸ و ص ۶۶۹ و ص ۶۷۰ و ص ۶۷۱ و ص ۶۷۲ و ص ۶۷۳ و ص ۶۷۴ و ص ۶۷۵ و ص ۶۷۶ و ص ۶۷۷ و ص ۶۷۸ و ص ۶۷۹ و ص ۶۸۰ و ص ۶۸۱ و ص ۶۸۲ و ص ۶۸۳ و ص ۶۸۴ و ص ۶۸۵ و ص ۶۸۶ و ص ۶۸۷ و ص ۶۸۸ و ص ۶۸۹ و ص ۶۹۰ و ص ۶۹۱ و ص ۶۹۲ و ص ۶۹۳ و ص ۶۹۴ و ص ۶۹۵ و ص ۶۹۶ و ص ۶۹۷ و ص ۶۹۸ و ص ۶۹۹ و ص ۷۰۰ و ص ۷۰۱ و ص ۷۰۲ و ص ۷۰۳ و ص ۷۰۴ و ص ۷۰۵ و ص ۷۰۶ و ص ۷۰۷ و ص ۷۰۸ و ص ۷۰۹ و ص ۷۱۰ و ص ۷۱۱ و ص ۷۱۲ و ص ۷۱۳ و ص ۷۱۴ و ص ۷۱۵ و ص ۷۱۶ و ص ۷۱۷ و ص ۷۱۸ و ص ۷۱۹ و ص ۷۲۰ و ص ۷۲۱ و ص ۷۲۲ و ص ۷۲۳ و ص ۷۲۴ و ص ۷۲۵ و ص ۷۲۶ و ص ۷۲۷ و ص ۷۲۸ و ص ۷۲۹ و ص ۷۳۰ و ص ۷۳۱ و ص ۷۳۲ و ص ۷۳۳ و ص ۷۳۴ و ص ۷۳۵ و ص ۷۳۶ و ص ۷۳۷ و ص ۷۳۸ و ص ۷۳۹ و ص ۷۴۰ و ص ۷۴۱ و ص ۷۴۲ و ص ۷۴۳ و ص ۷۴۴ و ص ۷۴۵ و ص ۷۴۶ و ص ۷۴۷ و ص ۷۴۸ و ص ۷۴۹ و ص ۷۵۰ و ص ۷۵۱ و ص ۷۵۲ و ص ۷۵۳ و ص ۷۵۴ و ص ۷۵۵ و ص ۷۵۶ و ص ۷۵۷ و ص ۷۵۸ و ص ۷۵۹ و ص ۷۶۰ و ص ۷۶۱ و ص ۷۶۲ و ص ۷۶۳ و ص ۷۶۴ و ص ۷۶۵ و ص ۷۶۶ و ص ۷۶۷ و ص ۷۶۸ و ص ۷۶۹ و ص ۷۷۰ و ص ۷۷۱ و ص ۷۷۲ و ص ۷۷۳ و ص ۷۷۴ و ص ۷۷۵ و ص ۷۷۶ و ص ۷۷۷ و ص ۷۷۸ و ص ۷۷۹ و ص ۷۸۰ و ص ۷۸۱ و ص ۷۸۲ و ص ۷۸۳ و ص ۷۸۴ و ص ۷۸۵ و ص ۷۸۶ و ص ۷۸۷ و ص ۷۸۸ و ص ۷۸۹ و ص ۷۹۰ و ص ۷۹۱ و ص ۷۹۲ و ص ۷۹۳ و ص ۷۹۴ و ص ۷۹۵ و ص ۷۹۶ و ص ۷۹۷ و ص ۷۹۸ و ص ۷۹۹ و ص ۸۰۰ و ص ۸۰۱ و ص ۸۰۲ و ص ۸۰۳ و ص ۸۰۴ و ص ۸۰۵ و ص ۸۰۶ و ص ۸۰۷ و ص ۸۰۸ و ص ۸۰۹ و ص ۸۱۰ و ص ۸۱۱ و ص ۸۱۲ و ص ۸۱۳ و ص ۸۱۴ و ص ۸۱۵ و ص ۸۱۶ و ص ۸۱۷ و ص ۸۱۸ و ص ۸۱۹ و ص ۸۲۰ و ص ۸۲۱ و ص ۸۲۲ و ص ۸۲۳ و ص ۸۲۴ و ص ۸۲۵ و ص ۸۲۶ و ص ۸۲۷ و ص ۸۲۸ و ص ۸۲۹ و ص ۸۳۰ و ص ۸۳۱ و ص ۸۳۲ و ص ۸۳۳ و ص ۸۳۴ و ص ۸۳۵ و ص ۸۳۶ و ص ۸۳۷ و ص ۸۳۸ و ص ۸۳۹ و ص ۸۴۰ و ص ۸۴۱ و ص ۸۴۲ و ص ۸۴۳ و ص ۸۴۴ و ص ۸۴۵ و ص ۸۴۶ و ص ۸۴۷ و ص ۸۴۸ و ص ۸۴۹ و ص ۸۵۰ و ص ۸۵۱ و ص ۸۵۲ و ص ۸۵۳ و ص ۸۵۴ و ص ۸۵۵ و ص ۸۵۶ و ص ۸۵۷ و ص ۸۵۸ و ص ۸۵۹ و ص ۸۶۰ و ص ۸۶۱ و ص ۸۶۲ و ص ۸۶۳ و ص ۸۶۴ و ص ۸۶۵ و ص ۸۶۶ و ص ۸۶۷ و ص ۸۶۸ و ص ۸۶۹ و ص ۸۷۰ و ص ۸۷۱ و ص ۸۷۲ و ص ۸۷۳ و ص ۸۷۴ و ص ۸۷۵ و ص ۸۷۶ و ص ۸۷۷ و ص ۸۷۸ و ص ۸۷۹ و ص ۸۸۰ و ص ۸۸۱ و ص ۸۸۲ و ص ۸۸۳ و ص ۸۸۴ و ص ۸۸۵ و ص ۸۸۶ و ص ۸۸۷ و ص ۸۸۸ و ص ۸۸۹ و ص ۸۹۰ و ص ۸۹۱ و ص ۸۹۲ و ص ۸۹۳ و ص ۸۹۴ و ص ۸۹۵ و ص ۸۹۶ و ص ۸۹۷ و ص ۸۹۸ و ص ۸۹۹ و ص ۹۰۰ و ص ۹۰۱ و ص ۹۰۲ و ص ۹۰۳ و ص ۹۰۴ و ص ۹۰۵ و ص ۹۰۶ و ص ۹۰۷ و ص ۹۰۸ و ص ۹۰۹ و ص ۹۱۰ و ص ۹۱۱ و ص ۹۱۲ و ص ۹۱۳ و ص ۹۱۴ و ص ۹۱۵ و ص ۹۱۶ و ص ۹۱۷ و ص ۹۱۸ و ص ۹۱۹ و ص ۹۲۰ و ص ۹۲۱ و ص ۹۲۲ و ص ۹۲۳ و ص ۹۲۴ و ص ۹۲۵ و ص ۹۲۶ و ص ۹۲۷ و ص ۹۲۸ و ص ۹۲۹ و ص ۹۳۰ و ص ۹۳۱ و ص ۹۳۲ و ص ۹۳۳ و ص ۹۳۴ و ص ۹۳۵ و ص ۹۳۶ و ص ۹۳۷ و ص ۹۳۸ و ص ۹۳۹ و ص ۹۴۰ و ص ۹۴۱ و ص ۹۴۲ و ص ۹۴۳ و ص ۹۴۴ و ص ۹۴۵ و ص ۹۴۶ و ص ۹۴۷ و ص ۹۴۸ و ص ۹۴۹ و ص ۹۵۰ و ص ۹۵۱ و ص ۹۵۲ و ص ۹۵۳ و ص ۹۵۴ و ص ۹۵۵ و ص ۹۵۶ و ص ۹۵۷ و ص ۹۵۸ و ص ۹۵۹ و ص ۹۶۰ و ص ۹۶۱ و ص ۹۶۲ و ص ۹۶۳ و ص ۹۶۴ و ص ۹۶۵ و ص ۹۶۶ و ص ۹۶۷ و ص ۹۶۸ و ص ۹۶۹ و ص ۹۷۰ و ص ۹۷۱ و ص ۹۷۲ و ص ۹۷۳ و ص ۹۷۴ و ص ۹۷۵ و ص ۹۷۶ و ص ۹۷۷ و ص ۹۷۸ و ص ۹۷۹ و ص ۹۸۰ و ص ۹۸۱ و ص ۹۸۲ و ص ۹۸۳ و ص ۹۸۴ و ص ۹۸۵ و ص ۹۸۶ و ص ۹۸۷ و ص ۹۸۸ و ص ۹۸۹ و ص ۹۹۰ و ص ۹۹۱ و ص ۹۹۲ و ص ۹۹۳ و ص ۹۹۴ و ص ۹۹۵ و ص ۹۹۶ و ص ۹۹۷ و ص ۹۹۸ و ص ۹۹۹ و ص ۱۰۰۰

احتجاج کیا ہے کیا ان میں سے ہر ہر روایت کسی اور صحابی سے بھی امام مسلم نے روایت کی ہے تاکہ ان کی معنی روایات پر حرف نہ آئے ؟ اگر معترض صاحب صحیح مسلم میں سے انہیں مضامین کی روایات جو ابوالزہیر رحمہن جابر رضی کے طریق سے مروی ہیں دیگر حضرات صحابہ کرام رضی کی روایات سے باحوالہ بتادیں تو ہم علمی اور تحقیقی طور پر ان کے احسان مند ہوں گے۔ دو چار روایتوں میں ایسا کر دکھانا کوئی کمال نہ ہوگا۔ ہر ہر روایت اور مضمون میں یہ مطلوب ہے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے اور یقین چاہیے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے تو اس سے لازم آیا ہی سمجھا جائے گا کہ مسلم شریف کی بے شہادتیں ان کے اس غلط نظریہ سے غیر صحیح قرار پائیں گی اور صحیحین کی صحت کے بارے میں ان حضرات کا دعویٰ محض زبانی جمع خرچ تصور ہوگا جیسا کہ مخفی نہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی سطحی قسم کے اعتراضات اور بزرگم خود جو ابابا تہرجان الحدیث میں موجود اور مذکور ہیں لیکن ہمارا دیا تھا یہ نظریہ ہے کہ ان سے کسی اہل علم اور صاحب بصیرت آدمی کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہم ان کو نقل کر کے قارئین کرام کے اذہان کو بلاوجہ اور بے ضرورت پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله واصحابه واتباعه
الى يوم الدين وبارك وسلم۔

احقر الناس

ابوالزہاد محمد سرفراز

۱۴ صفر ۱۴۰۰ھ

۵ جنوری ۱۹۸۰ء

دیباچہ طبع دوم

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

(۱) بعض غیر مقلدین حضرات نے یہ بے جان دعویٰ کیا تھا کہ جس شخص نے ہر رکعت میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز بے کار، باطل اور کالعدم ہے اور اس پر تمام دنیا کے احاف کو کھلا چیلنج بھی کیا تھا۔ راقم اشیم نے ان کے اس غلو کے رد میں ٹھوس دلائل کے ساتھ دو جلدوں میں بسوٹ کتاب احسن الکلام لکھی جس کو نہ صرف یہ کہ عام تعلیم یافتہ حضرات ہی نے پسند کیا بلکہ ہندو پاک کے تبحر اور نامور علماء کرام نے اس کی بیحد تعریف کی اور اپنی زرتین اور قیمتی آرا اور تصدیقات سے راقم کی عزت افزائی کی اور کتاب کی اغلاط کی طرف بھی توجہ دلائی جو بمقتضائے بشریت کچھ تو راقم سے اوکچھ کتابت کی وجہ سے اور بعض کاپیوں اور پروفوں کی کما حقہ تصحیح نہ ہو سکنے کی وجہ سے باقی رہ گئی تھیں جن حضرات نے نمایاں غلطیوں کی نشاندہی کی ان میں علی الخصوص سنہ العلماء رئیس المحققین حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا ابو عبیدہ غلام سرور صاحب دام مجید (چمن ضلع گجرات) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور راقم تمہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۲) جہاں ان حضرات نے اس کتاب کے مضبوط دلائل اور براہین اور حسن ترتیب کی شاندار تحسین کی وہاں غیر مقلدین حضرات نے اس پر ضرورت سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار فرمایا چنانچہ

ان کی جماعت کے چوٹی کے مدرس عالم اور سابق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے ایک مستقل کتاب خیر الکلام تحریر فرمائی جس میں جو اباحت کا بیشتر حصہ محض سینہ زاد جو ابات اور صدی نسخوں پر مشتمل ہے۔ اس کا یہ احتمال ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یوں لینا چاہیے۔ اور اس کا مطلب یوں بھی لیا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر بات ہے کہ احسن الکلام کے ٹھوس اور معنی خیز حوالوں کا جواب محض احتمالات اور سینہ زاد باتوں سے نہیں ہو سکتا یہاں ٹھوس حوالہ جات درکار تھے اور یہی ان کے بس کاروگ نہ تھا اور روایات کے بارے میں وہ ساری کتاب میں ایک ہی ضابطہ سے کام لیتے رہے ہیں وہ یہ کہ جرح مفسر کو بھی جرح مبہم گردان کر اور ایک دو حوالے راوی کی توثیق کے نقل کر کے یہ فیصلہ صادر فرماتے ہے یہ کہ لہذا جو جرح مؤلف احسن الکلام نے کی ہے وہ مبہم ہے اور توثیق کے بعد اس کا کوئی اعتبار نہیں اور کہیں تعسوق کا سہارا لیکر حدیث کو حسن بنا ڈالا ہے۔ خیر ہم نے بقدر وسعت طبع ثانی میں اس کا خوب جائزہ لیا ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے احسن الکلام کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کیلئے اور اپنی جماعت کے جذباتی حضرات کے جذبات کو اُجھانے کیلئے آخر میں سترہ عدد مناقشہ بھی درج فرمائے ہیں جن کا ذکر کتابیں پہلے بھی اپنے خیال میں مناسب مقامات پر کر چکے ہیں اور یہ چیز ان کے پیش نظر رہی ہے کہ احسن الکلام کی اغلاط ان کے حواریوں کے ذہن میں انقش فی الحجر ہو جائیں اور اس کتاب سے اور اس کے مصنف سے بدظنی پیدا ہو جائے۔ مثلاً ایک جگہ یہ تھا کہ حضرت امام عبداللہ بن المبارک حضرت امام بخاری کے استاد استاد تھے۔ الاستاد کا لفظ کتابت سے چھوٹ گیا تو اس پر مناقشہ کھڑا کر لیا گیا کہ اس مؤلف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام ابن مبارک، امام بخاری کے استاد نہیں ہیں۔ اور ایک مقام پر فقراً اماماً کا جملہ غلطی سے رہ گیا تو اس پر بھی خوب مصالحہ لگا کر مناقشہ کی عمارت کھڑی کر دی گئی اور ایک جگہ قتادہ کا نام سند سے چھوٹ گیا تو اس کو کئی مقامات پر انھوں نے اُجاگر کیا اور یہ لکھا کہ چونکہ یہ تیسرے درجہ کے مدرس تھے۔ تب ان کو گرا دیا گیا ہے۔ حالانکہ راقم نے خود احسن الکلام میں باحوالہ یہ لکھا ہے کہ قتادہ کی تدلیس سرے سے مضر ہی نہیں تو پھر اس کو حذف کرنے کا راقم کو کیا فائدہ تھا؟ و علی ہذا القیاس۔ اکثر مناقشہ اسی نہج کے ہیں اور جہاں بعض عبارتیں مجمل اور مختصر تھیں۔

اب ان کی تشریح کر دی گئی ہے اور جہاں اغلاط معقول نظر آتیں۔ ان کی اصلاح کر لی گئی ہے۔ ہم نے جب ان کی کتاب میں اسی نہج کے بلکہ ان سے سنگین تر مناقشات کا تتبع کیا تو تقریباً ساٹھ سے زیادہ نظر آئے۔ اگر ضرورت پڑی اور ہم مجبور کر دیے گئے تو الگ ان کو شایع کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ علمی اور تحقیقی میدان میں ہم اس طعنہ بازی کو پسند نہیں کرتے اور نہ اس کا اثر اچھا رہتا ہے۔ ان مناقشات کو انھوں نے فہرست کتاب میں غلط بیانیوں، تحریفیات اور مغالطات وغیرہ سے تعبیر کر کے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی ہے۔ سچ ہے کُلُّ اِنَّا عِيَّتْرٌ شَمْعٌ بِمَا فِیْہِ۔

(۳) غیر مقلدین حضرات جب پنجویں یہ محسوس کر لیا کہ خیر الکلام تو احسن الکلام کا معقول جواب نہیں اور علماء تو کیا جذباتی مزاج جماعتی کارکن بھی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے تو ایک صاحب نے الاعتصام میں قسط وار احسن الکلام کی تردید شروع کر دی جس میں انھوں نے علمی اور تحقیقی سطح سے بہت ہی نیچے اتر کر محض تعصب مذہبی کا مظاہرہ کیلئے اور اس میں بیشتر وہی باتیں دہرائی ہیں جو پہلے حضرات مسلخہ خلف الامام کے سلسلہ میں لکھ اور کہ چکے ہیں۔ ہاں البتہ یہ سب کچھ انھوں نے صرف جذبات اور تعلق کی صورت میں ادا کیا ہے ان کی قابل جواب باتوں کا ذکر ہم نے کتاب میں کر دیا ہے۔ باقی لایعنی باتوں کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی۔ البتہ انھوں نے الاعتصام اور مغالطات احسن الکلام میں جو باتیں خوب کھل کر چیلنج بازی کی شکل میں کہی ہیں وہ اصولاً و اختصاراً یہ ہیں:

(۱) مؤلف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارت سے دھوکا دیا ہے

..... الخ

اس کا جواب اور حضرت شاہ صاحب کی پوری عبارت ہم نے طبع دوم میں ذکر کر دی ہے اور واضح کیا ہے کہ غلطی کس کی ہے؟

(۲) کہ مؤلف احسن الکلام نے محمد بن خازم کی امام ابن حبان سے یہ توثیق تو نقل کر دی ہے کہ وہ ثقہ اور متقن تھا مگر آخر کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ وہ ضعیف مرحی تھا اور یہ بددیانتی ہے۔ (محصلاً)

مگر یہ بیچارے اصول حدیث سے بالکل کورے ہیں۔ محمد بن خازمؒ بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور اصول حدیث کے رو سے ثقہ راوی کا خارجی یا جمہی معتزلی یا مرجئی وغیرہ ہونا اس کی ثقاہت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا اور صحیحین میں ایسے راوی بکثرت موجود ہیں۔ تدریب الراوی اور ہدایت السائل میں ان کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے اور خود مؤلف تیسرا کلام ص ۲۹۰ میں لکھتے ہیں: ”کہ ارجار وغیرہ بدعات کے اعتراضات سے ثقہ ہونے میں خلل پیدا نہیں ہوتا..... الخ“

یہ قاعدہ ہمارے پیش نظر تھا اور اس لیے ہم نے یہ جملہ نقل نہیں کیا اور خود جناب قاضی مقبول احمد صاحب کا یہ عالم ہے (اور حیرت ہے کہ الاعتصام کے ذمہ داروں نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی) کہ عبدالرحمن بن محمد بن زیاد جو صحاح ستہ کے راوی ہیں ان سے متعلق لکھا ہے کہ انتہا درجہ کے ضعیف ہیں۔ (الاعتصام ۲۸، ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۸ کالم ۳۔)

(۳) کہ مؤلف احسن الکلام نے راویوں کے بارے میں توثیق و تضعیف نقل کرنے میں خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ مثلاً فلاں ضعیف راوی کے بارے میں فلاں امام نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہے مگر اس قول کو وہ نقل نہیں کرتا اور فلاں ثقہ راوی کو فلاں امام نے ضعیف یا وہمی وغیرہ کہا ہے۔ اس کو بھی وہ پی گیا ہے۔ (مصلحہ)

اور الاعتصام میں ان صاحب کا بیشتر مضمون اسی عمارت پر کھڑا ہے اور خوب جذباتی رنگ میں صفحہ صفحہ پر اس کو نمایاں کیا گیا ہے مگر صد افسوس ہے کہ احسن الکلام کی اس عبارت کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس کا حوالہ دیتے۔ چنانچہ عبارت یوں ہے: ”ہم نے بعض مقامات پر ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں، لیکن اگر بعض ائمہ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ ایسا کوئی بھی ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک شخص نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریت احر کے مترادف ہے۔ حضرات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس سے مخفی ہے؟ اور الصحابة کلہم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے؟ مگر خوارج و روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ: ع زب ان خلق کو نقارہ حندا سمجھو انتہی بلفظہ

(احسن الکلام جلد اول، طبع اول ص ۱)

یہ عبارت بار بار پڑھیے اور داد دیجیے قاضی مقبول احمد صاحب کے دادیلا کی کہ مؤلف احسن الکلام نے روایت کے بارے میں بددیانتی کی ہے فلاں راوی کے بارے میں فلاں قول ترک کر دیا ہے اور فلاں راوی کے بارے میں فلاں امام کا حوالہ چھوڑ دیا ہے اور الاعتصام میں قاضی صاحب کا زیادہ زور اسی پر صرف ہوا ہے۔ ان کو یہ توحی تھا کہ اس قاعدہ کو دلائل سے غلط ثابت کرتے۔ لیکن اس واضح عبارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مؤلف احسن الکلام کو بددیانت ثابت کرنا خالص تعصب کا مظاہرہ یا اپنے ناخواندہ حواریوں کو خوش کرنے کا ایک مذموم ڈھنگ ہے۔ بجز اللہ تعالیٰ مؤلف احسن الکلام کو کالمین سے خوشہ چینی کا موقع ملا ہے اور اصول و ضوابط کو سمجھنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کو اہلیت مرحمت فرمائی ہے۔ (۴) عبد اللہ بن نافع بن عمار کے متعلق جو توثیق کے الفاظ مؤلف احسن الکلام نے نقل کیے ہیں اس میں دھوکہ اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ (محصلاً)

الحجاب۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۵۰ اور ۵۱ میں (نمبر ۹۷ اور ۹۸) دو راوی ہیں۔ ایک کا نام عبد اللہ بن نافع بن عمار ہے اور دوسرے کا نام عبد اللہ بن نافع بن ابی نافع الصائغ الخزومی ہے۔ غلطی سے ثانی کا ترجمہ پہلے کے ترجمہ میں نقل ہو گیا ہے۔ اور اب طبع دوم میں اس کو بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے ہم نام راویوں کے بارے میں بڑے بڑے اکابر محدثین سے غلطیاں چلی آ رہی ہیں۔ نہ تو ان کو کسی نے دعوت مبارزت دی اور نہ بددیانت کہا ہے اور ان کی بات ہی چھوڑ لیے خود مؤلف خیر الکلام بعض مقامات میں اس غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ خیر الکلام ص ۴۲۴ میں لکھتے ہیں: کہ دوسرا راوی اس میں علی بن احمد الحامی مقرنی ہے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں ابن ابی الفوارس کہتے

ہیں۔ ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔“

(میزان جلد ۲، ص ۲۱۷، لسان المیزان جلد ۲، ص ۱۹۳)

لیکن یہ مؤلف خیر الکلام کی غلطی اور نرا وہم ہے۔ کیونکہ ابن ابی الفوارس نے جس کی تضعیف کی ہے وہ علی بن احمد بن ابی القیس المقرئ الرفاعی ہے جس کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوئی ہے۔ دیکھیے: (لسان المیزان جلد ۲، ص ۱۹۳) اور ہماری پیش کردہ سند میں علی بن احمد بن عمر بن حفص ابو الحسن المقرئ المعروف بابن الحامی ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی ہے۔

(ملاحظہ ہو۔ بغدادی جلد ۱۱، ص ۳۳۰)

الغرض ہم نام راویوں کے بارے میں ایسے اوہام کا پیش آجانا کوئی مستبعد بات نہیں ہے اور نہ کسی دیانت دار عالم نے آج تک ایسے امور میں کسی کو چیلنج کیا ہے۔

(۵) بایں ہمہ ہم نے الاعتصام میں پیش کیے گئے اعتراضات میں سے جو قابل جواب تھے ان کی قدرے وضاحت کر دی ہے اور ہم ان غیر مقلدین حضرات کے ممنون ہیں کہ انھوں نے احسن الکلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گو ان کا نظریہ ان کا مذہبی تعصب ہے تاہم وہ شکر یہ کے مستحق ہیں۔

(۶) مؤلف خیر الکلام سے ہم بجا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ اپنی جماعت کے مدرس عالم اور شیخ الحدیث ہیں کہ وہ اپنی جماعت کے ان غالی لوگوں کو ناصحانہ طور پر ترک غلو کا کوئی مفید مشورہ دے دیتے اور چند سطریں اس پر بھی تحریر فرما دیتے کہ جو لوگ ترک قرآنہ خلف الامام کی صورت میں لوگوں کی نمازوں کو باطل، بے کلام اور کالعدم کہتے ہیں وہ اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ اختلافی مسائل میں یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن یقین جانیے کہ انھوں نے صحیح طور پر آج کل کی عدالتی و کالت کا حق ادا کر دیا ہے کہ ہر طرح سے اپنے منوکل کو خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو سچا ثابت کیا جائے یہ الگ بات ہے کہ عدالت اس کی راتے سے متفق نہ ہو اور اس کو مجرم گردان کر قرار واقعی سزا دے۔ اپنی جماعت کے تمام علیوں پر پردہ ڈال کر اس کو برحق قرار دینے پر بلاوجہ ایٹری چوٹی کا زور لگانا کوئی مستحسن امر نہیں ہے۔ ان سے تو خیر الکلام کے صاحب مقدمہ ہی قدرے اچھے رہے کہ انھوں نے ص ۷۵ میں کچھ اشارہ

کیا ہے اگرچہ اپنی جماعت کے چیلنج کو مدافعت کہہ کر حق پوشی کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے بھائیوں کے حملوں کی مدافعت میں رد کے طور پر جماعت اہل حدیث کے ایک قبیل طبقے کا ایسا رویہ ضرور رہا کیا جو غیر معتدل ہونے کے علاوہ مسلک اہل حدیث کے شایان شان نہ تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غلو کے مقابلہ میں غلو ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔“ ۱۷

اگر تو کسی حنفی نے تمام روئے زمین کے غیر مقلدین حضرات کو ایسا کوئی چیلنج کیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس کی نماز باطل ہے، بیکار ہے، کالعدم ہے۔ تو وہ بلاشک اس کو مدافعت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کیا تو یہ خالص جماعتی ملی بھگت ہی ہے کہ سیدھی سادھی بات میں تاویل کا پیوند لگا کر اس کو حق ثابت کیا جائے۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا۔

(۷) اگرچہ اپنی دانست کے مطابق ہم نے اب کتاب کو اغلاط سے پاک کر دیا ہے۔ تاہم ان حضرات کا (خواہ ان کا نقطہ نظر کچھ ہی ہو) شکریہ ادا کریں گے جو ہمیں ہمارے کوتاہیوں کا آگاہ کریں گے۔ اور ہمیں معقول اغلاط کی درستی میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ وَصَلَّى
اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَآحِبَائِهِ أَجْمَعِينَ ۞

ابوالتراب

۲۴ شوال ۱۳۸۴ھ

۲۸ فروری ۱۹۶۵ء

دیباچہ طبع اول

کتاب احسن الکلام جلد اول و دوم کی تالیف و ترتیب میں گو بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا گیا تھا مگر اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کو صفت اول کے محقق اور جید علماء کرام بھی بے حد پسند فرمائیں گے جیسا کہ تصدیقات اور تقاریر سے بھی ظاہر ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اُس نے اس حقیر سے یہ خدمت لی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

میں اپنی اس کتاب کا حضرت الاستاد المحقق، المدق، الفقیہ، المحدث، شیخ المعقول، والمنقول مولانا عبد القیوم صاحب کیمیل پوری دامت برکاتہم (حال اداکارہ) کے نام گرامی سے انتساب کرتا ہوں کیونکہ اس حقیر کا دینی کتب کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق حضرت موصوف کی خالص توجہ اور نوازش کار بہین منت ہے اور اکثر بڑی اور دقیق کتابیں راقم نے حضرت سے ہی پڑھی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو تادیر سلامت رکھے اور دین کی خدمت کا مزید موقع

دے۔ ع ”وَبِحَمْدِ اللَّهِ عَمَّادًا قَالًا آمِينَ“

احقر

ابوالزاہد

۱۸ ذوالقعدہ ۱۳۷۴ھ

۹ جولائی ۱۹۵۵ء

سخن ہائے گفتنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ - وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ
وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ ط

علم انسانی میں ہر چیز کا وجود اسباب و علل اور محرکات و دواعی کے وجود پر موقوف ہے۔ جب تک علت وجود اپنے تمام لوازم کے ساتھ معرض وجود میں نہ آجائے کسی چیز کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں یہ ایک عقلی اور فطری قاعدہ ہے۔ اور انسانی افعال و اغراض کا ناگزیر محور جس کے گرد انسان کے سبب افعال چکر لگاتے اور گھومتے رہتے ہیں۔

سبب تالیف

علی اور علی، فنی اور تحقیقی لحاظ سے قرآۃ الفاتحہ خلف الامام کا مسئلہ اپنے مثبت اور منفی پہلو کے اعتبار سے قرن اول سے تاہنوز بحث و تمحیص اور تطبیق و ترمیم کا محتاج رہا ہے۔ حضرات ائمہ میں و محققین علماء نے مختلف زمانوں اور متعدد زبانوں میں اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ محرم اور ہجری پہلو اور راجح و مرجوح گوشہ کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے انتہائی کوشش اور کاوش کی ہے۔ اور سینکڑوں کتابیں اور رسالے اس پر لکھے گئے ہیں۔ مگر اس خاص شکل و صورت

اور ترتیب کے ساتھ نہایت سہل اور آسان طریقہ پر اس کتاب کو پیش کرنے کا بڑا سبب فریق ثانی کی حد سے زیادہ تجاوز اور گرم گفتاری ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ اس کی نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اور بعض نے تو یہاں تک غلو سے کام لیا کہ جملہ احناف کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازا ہے۔

اور بعض نے قسم اور حلف اٹھا کر کہا، کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ اور ہم نے ان میں سے بعض کو سلسلہ تقریر و درس حدیث اور نبی مجلسوں میں منطق یونان سے بھی استعانت کرتے دیکھا ہے اور یوں صفحہ و کبرای جوڑ کر نتیجہ نکالتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں

پڑھتا۔ قرأت سورۃ فاتحہ نہیں کرتا۔ اس کی نماز نہیں ہوتی اور من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر کہ جس شخص نے دیدہ و دانستہ نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے والا کافر ہے۔ (گو بعض بڑے محتاط اور منصف مزاج حضرات کچھ نزدیک عملی طور پر ہی وہ کافر ہو گیا۔ مگر ہے ضرور) اور ہمارے زمانے کے ایک صاحب نے جو اپنی جماعت

لے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگو بی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں بعض مدعیان عمل بالحدیث نے یہ غرغراچا یا کہ حنفیہ مفسدین صلوٰۃ اور بے نمازیں (ہدایت المہندی ص ۲)

لے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب (المتوفی ۱۳۱۷ھ) لکھتے ہیں: کہ بالخصوص قسم کھا کر کہے کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ ان کی بیبیوں سے غیر مقلدین کو بلا طلاق نکاح جائز ہے۔۔۔ الخ (تنقیح التفتیح ص ۳۵)

لے ایک غیر مقلد مگر منصف مزاج عالم ایسے ہی ایک عالی اور بے باک مفتی کا حوالہ دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: "اول تحریر ایک ہمارے ہی علماء اہل حدیث کی پرچہ تنظیم میں طبع ہوئی تھی جس میں مولانا موصوف نے مدرک رکوع کے اعتداد والوں کو غلطی التاریک کا حکم صادر فرما دیا تھا۔ نتیجہ اس طرح نکالا تھا کہ مدرک رکوع سے

فاتحہ مفقود ہوتی ہے۔ لہذا اس کی نماز نہیں۔ جس کی نماز نہیں وہ بے نماز ہے، بلکہ نماز کافر ہے اور وہ غلطی التاریک ہے" (بلفظہ، اتام الركوع فی ادراک الركوع ص ۱، طبع کردہ منیجر رسالہ صحیفہ المدینہ ص ۱) مؤلف

خیر الکلام نے بزعم خود چند دلائل پیش کیے ہیں پھر لکھتے ہیں: لہذا فاتحہ ہر نمازی پر خواہ امام ہو یا منفر دیا مقتدی فرض ہوگی۔ (ص ۵۱۲)۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس فرض کے منکر اور تارک پر فتویٰ کیا صادر ہوگا؟ آیا وہ مسلمان

رہے گا یا مسلم؟ (العیاذ باللہ) کیونکہ اصول کے لحاظ سے فرض کا منکر مسلمان نہیں بننا چاہیے۔ دیکھیے کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے؟

کے روج رواں اور چوٹی کے مناظر و مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک مشہور قصبہ میں دورانِ تقریر
یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہرگز نہیں ہوتی۔ آؤ
ہمارے ساتھ اس مسئلہ پر مباحلہ کر لو۔

آپ اس کتاب میں پوری تفصیل سے پڑھیں گے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے کے قابل
کون کون ہیں؟ نہ معلوم مباحلہ کس کس سے ہوگا؟ اور تاسف بالائے تاسف یہ کہ مباحلہ بھی
فَجَعَلَ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ط کے الفاظ کے ساتھ اور لطف یہ ہے کہ وہ صاحب نہ
بیوی رکھتے ہیں اور نہ بچے۔ گویا آیت مباحلہ میں نَدْعُوا أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَ كُمْ وَنِسَاءَنَا وَ
نِسَاءَكُمْ کا ان کے نزدیک کوئی مفہوم ہی نہیں۔ اور اب کراچی سے ایک کتابچہ کو شائع ہوا
جس کا نام ہے "فصل الخطاب فی قرآۃ فاتحۃ الكتاب" جو کتب خانہ اہلحدیث، ۱۱۹-نیو کلا تھ مارکیٹ،
کراچی (پاکستان) کی طرف سے شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ تمام
روئے زمین کے احناف کو انعامی چیلنج کیا ہے۔ اور روئے زمین کی چیدہ چیدہ ہستیوں کو نام بہ
نام لگا رہے۔ اصل الفاظ میں ان کا اعلان یہ ہے:

انعامی چیلنج: تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اہل
حدیث امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے
(بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا) دکھاتے ہیں۔ ایسا ہی وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے
نہ پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا)
میدانِ مناظرہ میں دکھادیں تو ہم ان کو اس حق محنت، داد ہمت، تمنعہ صداقت کے صلہ میں فاتحہ کے
ہر حرف کے بدلے میں مبلغ ایک سو روپے دینے کو تیار ہیں۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل حنفی جو میدانِ مناظرہ میں اور امام کے پیچھے خاص لفظ
فاتحہ کے نہ پڑھنے کا دکھا کر مبلغ پانچ سو روپیہ انعام حاصل کرے (دیدہ باید) اس انعامی چیلنج کو
شائع کیے ہوئے آج تیرہ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور تقریباً یہ چیلنج بارہ ہزار کی
تعداد میں طبع کر کے علماء اور جملات کے ہاتھوں میں پہنچا چکے ہیں۔ دیوبند، ڈابھیل، ہندوستان
پاکستان کے احناف کے بڑے بڑے ملائیس میں بھی پہنچ چکا ہے۔ احناف کے مقتدر علماء

مفتی کفایت اللہ صاحب (المتوفی ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۵۳ء) مولانا حسین احمد صاحب مدنی (المتوفی ۱۲ رجب الاولیٰ ۱۳۷۷ھ) اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ (المتوفی ۲۱ صفر ۱۳۷۹ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۹۴۹ء) کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت تک کسی حنفی کو یہ جرأت نہ ہوئی اور نہ ہی آئندہ ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کہ وہ دنیا کی کسی کتاب سے ایک حدیث ہی بموجب شرائط مندرجہ در چیلنج پیش کر کے انعام حاصل کرنے کے علاوہ مذہب حنفی پر احسان کرتا۔ لیکن کتنا کہاں سے۔ جب کہ اس طرح کی ایک حدیث کسی دنیا کی اسلامی کتب میں موجود نہ ہو اور یقیناً نہ ہو۔ (انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص ۱۸) اس شاہی اور فرار خدا لانا انعام چیلنج کے بعد اسی کتابچے کے آخری صفحہ پر یہ اعلان ان الفاظ سے دہرایا گیا ہے۔

تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج ہم تمام علماء احناف ہند، سندھ، پنجاب، بنگال، خراسان، عربستان، چین، جاپان، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، یورپ، مصر، عراق وغیرہ کو بذریعہ چیلنج و اشتہار ہذا کے دعوت دیتے ہیں کہ ان مسائل مندرجہ ذیل کو کسی آیت یا حدیث صحیحہ مرفوعہ متصل سے اور وہ حدیث جس مسئلہ کے ثبوت میں پیش کریں۔ نص صریح ہو صحاح و ماوائف ثبوتی سے ثابت فرمائیں تو ہم ان کو اس حق محنت، داد و ہمت، تمغہ صداقت کے صلہ میں ہر آیت اور حدیث کے بدلہ میں پچیس روپے انعام دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

(۱) آل حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ کے پڑھنے سے منع کرنا۔
(پھر نو عدد مسائل اور لکھ کر اور تلك عشرة كاملة تحریر فرما کر بحث کو اس اعلان پر ختم کیا ہے)
هل من قبار زئبار زنی۔ یعنی کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل اور خوش نصیب حنفی بھائی جو میدان میں کودے اور ہم سے سینکڑوں روپے کا انعام حاصل کرے۔ (دیکھو بائیں)
(انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص ۱۸)

اور اب فصل الخطاب ص ۱۸ کے جدید ایڈیشن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیجا رہے اور باطل ہے۔ (بلفظہ)

ان تمام اقتباسات کو پیش نظر رکھ کر پڑھے لکھے آدمی کو ضرور یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والے کافر اور گمراہ ہیں اور نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ بے نماز اور اقل درجہ یہ ہے کہ وہ بلا دلیل ہیں حتیٰ کہ ان کے ساتھ لعنة الله على الكاذبین کے الفاظ سے مبالغہ کرنا بھی کارِ ثواب اور جائز ہے اور عوام پر اشتہار می رعب ڈالنے کے لیے انعامی چیلنج بھی دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کو بھی خالی الذہن ہو کر محض اپنی قلبی تسکین اور سنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی خاطر سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں اور اوراق لٹنے پڑنے ہیں اور صد ہا مسائل اور کتاہچوں کی ورق گردانی کرنا پڑی ہے تاکہ دلائل کی صحت اور سقم کا موازنہ کر کے نجاتِ آخروی کی فکر کی جاتے۔ لیکن میں نے فریقِ ثانی کے جلد دعووں کو بالکل بے حقیقت، مبالغہ آمیز اور انتہائی غلو پر مبنی پایا ہے۔ گو مسئلہ زیر بحث میں ائمہ دین کا اختلاف رہا ہے، مگر جو بے اصل دعویٰ فریقِ ثانی کے اہل علم حضرات نے کیے ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں اور ان حضرات کی ان کارستانیوں پر مطلع ہونے کے بعد قرین انصاف تو یہ تھا کہ ہم بھی اپنی لمن ترانیوں آجاتے اور ان کی سرابی حقیقت کو الم نشرح کرتے ہوئے کہہ دیتے۔

محتسب خم شکست من سراد

السنن بالسنن والجرؤح قصاص

لیکن قرآنِ کریم کی تعلیم اور حدیثِ نبویؐ کے صریح ارشادات اور جن اکابر سے ہمیں لگاؤ اور تعلق ہے ان سے ربط و نسبت ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس قسم کی لچر پوچھ اور فتنہ انگیز باتیں کہتے پھریں۔ ہمیں تو اصلیت اور حقیقت کو بے نقاب اور آشکارا کرنا ہے اور بس اور اس کتاب کی تالیف و ترتیب سے جو ناراضگی فریقِ ثانی کو پیدا ہوگی اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ع:

”اے بادِ صبا میں ہمہ آوردہ ٹسٹ“

یہ بات تو پوری تفصیل کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہوگی کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے والے صرف ہم احناف ہی نہیں، بلکہ جمہور صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین رضوان علیہم اجمعین اور اکثر سلف و خلف کی معیت سے ہمارا دامن تحقیق وابستہ ہے۔ اور جمہور اپنے اس محقق نظریہ پر نص

قرآنی اور بے شمار حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ اور ایسے اختلافی مسائل میں (خصوصاً جن میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کا اختلاف ہو) ہمارا یہ منصفانہ عندیہ ہے کہ جو بات ظاہر قرآن کریم وحدیث اور جہور کے عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ اس کے سامنے تسلیم خم کر دیتے ہیں بلکہ اس کو اپنا دینی سرمایہ اور باعث صداقت و سچائی سمجھتے ہیں اور جن مسائل میں طرفین کے پاس قرآن و حدیث کے دلائل ہوں۔ ہم اس پہلو کو جو قرآن و سنت کے قریب تر ہوتا ہے۔ اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلک کی تائید میں تطبیق اور ترجیح کے ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں اور فریق ثانی کے حق میں غلط مویشگافی اور غیر محتاط لفظ زبان سے نکالنا ہرگز جائز نہیں سمجھتے اور تمام مسائل اختلافیہ اور اجتہادیہ میں ہمارا یہی نظریہ ہے جس کی مزید تحقیق آپ کو راقم الحروف کی کتاب الکلام المفیدی فی اثبات التقلید میں ملے گی۔ مع ہذا معصوم ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ والعصمة بید اللہ تعالیٰ وحده۔

ہم حیران ہیں کہ مسئلہ زیر بحث میں تکفیر اور تفسیل کس کی ہوگی؟ اور تحقیق و تجسس کس کی؟ بے سند اور بے دلیل ہونے کا الزام کس پر عائد ہوگا؟ اور لعنتہ اللہ علی الکاذبین کے الفاظ سے مباہلہ کس سے ہوگا؟ کیونکہ مسئلہ کے اختلافی ہونے میں فریق ثانی کا بھی اتفاق ہے۔ چنانچہ حضرت امام بیہقی رحم (المتوفی ۴۵۶ھ) نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب (کتاب القراءۃ) لکھی ہے۔ اس میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس وقت تک باقاعدہ اس مسئلہ میں اختلاف چلا آتا ہے۔

(کتاب القراءۃ ص ۱۲۴)

اور مولانا مبارک پوری صاحب المتوفی ۱۳۵۳ھ جن کی کتاب تحقیق الکلام پر فریق ثانی کے مسئلہ زیر بحث پر مناظرہ کا دار و مدار ہے امام خطابی رحم (المتوفی ۳۸۸ھ) کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

سا ولفظہ: فی مسئلۃ معروفۃ مشہورۃ بما فیہا من الاختلاف منذ عصر الصحابۃ
رضالی یومنا ہذا۔ یعنی یہ مسئلہ معروف و مشہور ہے۔ اس میں اختلاف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے تا ہنوز چلا آتا ہے۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۲۴)

۲۔ یہ بحث امام خطابی رحم (المتوفی ۳۸۸ھ) کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ علمائے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے امام کے پیچھے قراءۃ کرنے کو واجب کہا ہے اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ امام کے صحابہ کی عورتیں نہیں کیا کرتے تھے اور فقہائے تین قول ہیں: (باقی ص پر)

”کہ اس مسئلہ میں صحابہ کرام کا اختلاف تھا۔ ایک گروہ وجوب قرآنہ خلف الامام کا قائل تھا تو دوسرا منکر۔ اس لیے فقہاً اور ائمہ کا بھی اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ مطلقاً وجوب کا قائل ہے اور دوسرا مطلقاً مانعت کا۔ تیسرا گروہ ستری نمازوں میں قائل ہے اور چہری نمازوں میں قائل نہیں ہے۔“

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

اندریں حالات انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ فریق ثانی جس پہلو کو حق اور صحیح سمجھتا۔ شدت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا۔ لیکن تکفیر اور تفسیق وغیرہ اور تعدی و تجاوز کے الفاظ سے گریز کرتا نہ تو مبادلہ کا چیلنج دیتا اور نہ حلفیہ طور پر دوسرے فریق کو بے نماز اور مفسدین صلوة کا خطاب دیتا اور ایسے اختلافی مسئلہ میں سنجیدگی اور متانت سے کام لیتے ہوئے تعصب، عناد، غلو اور زبان درازی سے اجتناب کرتا، مگر کاش کہ اس نے ایسا نہ کیا۔

ہمارا تہ عاچو کہ عامۃ المسلمین کو مسئلہ زیر بحث سے شناسا کرنا ہے۔ اس لیے ہم نے عوام کی رعایت کرتے ہوئے نہایت سہل اور حتی الوسع سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر عربی عبارات پیش نہیں کی گئیں بلکہ ان کے حوالہ درج کر دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ہاں البتہ جہاں کسی خاص مصلحت سے اصل عربی عبارت پیش کرنا ضروری معلوم ہو اسے تو وہاں اصل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے تاکہ خواص اور عوام دونوں برابر استفادہ کر سکیں۔

ہم نے بعض مقامات پر حتی الوسع متانت اور سنجیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی چوٹیں بھی کی ہیں جن سے ان اکابر کے طرز استدلال کی خامی اور اس کا نقص واضح کرنا مقصود ہے اور جن سے بڑے بڑے اکابر کے خیالات اور نفسی میلانات کی پردہ درمی ضرور ہوگی لیکن پردہ درمی کے بغیر درون پردہ کا نظارہ کس نے کیا ہے؟ ورنہ عاشا و کلا ہمارے اس علمی اور تحقیقی طنز سے نہ سلف صاحبین سے بذہنی ہے اور نہ تمسخر اور نہ زمانہ حال کے حضرات کی دل آزاری۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

(بقیہ صفحہ ۱) امام کھول، اوزاعی، شافعی اور ابو ثور فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے چہری اور ستری سب نمازوں میں قرآنہ کرنا ضروری ہے اور امام زہری، مالک، عبداللہ بن المبارک، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ مقتدی ستری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآنہ کرے لیکن چہری نمازوں میں قرآنہ نہ کرے۔ اور امام سفیان ثوری اور اصحاب الزہری یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے کوئی شخص قرآنہ نہ کرے۔ امام جہر سے قرآنہ کر رہا ہو یا آہستہ۔ ۱ھ

(معالم السنن جلد ۲ ص ۳۹۴ طبع مصر)

ہم نے اپنے استدلال میں جملہ پیش کردہ احادیث اور آثار کی اسانید نقل کر کے ہر روایت اور اثر کے جملہ راویوں کی کتب اسماء الرجال سے توثیق نقل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والوں کو ہر قسم کی گستاخاں سے اور دشواری پیش نہ آئے۔ البتہ متابعات اور شواہد میں نیز ضمنی اور استطرادی اباحت میں روایات کی توثیق کا التزام نہیں کیا گیا اور فریق ثانی کی طرف سے جملہ نقل کردہ روایات و اثبات میں جو ضعف و کمزور اور مجروح و متکلم فیہ راوی ہیں۔ ان پر کتب رجال سے جرحی کلام نقل کر دیا ہے تاکہ بلند و بالا دعویٰ کرنے والوں کو اپنے دلائل کا معیار بھی معلوم ہو جائے اور جن حضرات صحابہ کرام رض و تابعین اور ائمہ دین کی مسئلہ زیر بحث میں معیت جہود کو حاصل ہے۔ ان کی ثقاہت اور بعض صفات عالیہ کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ عوام کو بھی یہ بات بخوبی معلوم ہو جائے کہ ان اکابر کا اسلام اور مسلمانوں میں کیا رتبہ ہے؟

ہم نے بعض مقامات پر ائمہ جرح و تعدیل اور جہود مخدنین کرام کے مسئلہ اور طے شدہ اصول و ضوابط کے عین مطابق ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں لیکن اگر بعض ائمہ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ کوئی بھی ایسا ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کہ بیت ائمہ کے مترادف ہے۔ حضرات صحابہ کرام کا رتبہ کس سے مخفی ہے؟ اور الصحابة کلہم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے؟ مگر خوارج اور روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہم نے توثیق و تضعیف میں جہود ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا۔

زبان خلق کو نقارۃ خدا سمجھو

تا حد ممکن اسانید کو پورا پورا نقل کیا گیا ہے اور ترجمہ میں اخیر تا، اخیرنی، حد ثنا، حدثنی، قال فلاں عن فلاں، رَوَى فلاں اور رَوَى عن فلاں وغیرہ اصطلاحات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے تاکہ ایک طرف نقل سند کے سلسلہ میں کسی قسم کی غیانت واقع نہ ہو۔ اور دوسری طرف سندت کو دیکھ کر صحیح و ضعیف، متصل اور منقطع وغیرہ کا فرق سمجھنے کی اہلیت رکھنے

دواوں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر جتنی کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کے حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔ بعض متن میں اور بعض حاشیہ میں (تاکہ اصل عبارت کی ترتیب اور تسلسل میں گنجلک اور اضطراب پیدا نہ ہو) اور یہ حوالے اس لیے درج کیے گئے ہیں تاکہ جو کتاب بھی آسانی کے ساتھ کسی صاحب کو میسر اور دستیاب ہو سکے۔ اس کی طرف مراجعت کر کے اصل عبارت یا اس کا ترجمہ بنظر انصاف دیکھ لیا جائے اور اکثر تاریخی واقعات اور ضمنی اجاث کو حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے حضرات اصل مضمون کو مرتب اور مربوط طور پر دیکھا سکیں۔ اور مزید تفصیل اور تشریح کے لیے حاشیہ دیکھ لیں۔ بسا بریں توضیح بیان، دفعہ شبہ، دفعہ ابہام، توشیح رجال، جمیع روایات اور دیگر نہایت ضروری امور کے لیے بہت سے تشریحی حواشی بڑھادیے گئے ہیں تاکہ خواص کے علاوہ عوام کے لیے بھی یہ کتاب چراغِ راہ کا کام دے۔

حضرات سلف صالحین کی عبارات کے پہلو پہ پہلو ہم نے فریق ثانی کی عبارات اور تحریرات سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی عبارتیں اپنی تائید میں نقل کی ہیں۔ مگر ان کی عبارات سے احتجاج کرنے میں سینہ زوری سے کام نہیں لیا گیا بلکہ ان سے جو منطوق اور مفہوم کے لحاظ سے ہمارا سمجھ میں آیا ہے وہ لکھ دیا ہے۔ ہاں اگر کسی موقع پر مناظرانہ رنگ میں ان کی عبارت کی تشریح میں طنز اور ظرافت کے طور پر کچھ لکھا گیا ہے تو اس کا انکار نہیں، لیکن بجز اللہ تعالیٰ انصاف کا دامن حتی الوسع ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ والعصمة بید اللہ تعالیٰ وحده۔

ع : یہ اپنی حد نظر ہے کسی کی مید کہاں

جہاں تک انسانی اور امکانی کوشش کا تعلق ہے۔ حوالہ جات کی تصحیح کا پورا التزام کیا گیا ہے۔ معذرا اگر جلد اور صفحہ کا نمبر اور ہندسہ کسی وجہ سے بدل جائے تو غوغا آرائی کے بجائے اس کی تصحیح کر لی جائے۔ دل میں پورا احترام موجود ہے اور ارادہ بھی تھا کہ محدثین کرام، فقہائے عظام اور ارباب جرح و تعدیل کے ناموں کے پہلے امام علامہ حافظ اور شیخ و حضرت وغیرہ کے توصیفی الفاظ لکھے جائیں، مگر ان کے ناموں کے بار بار آنے سے ہر جگہ ایسا لکھنا ایک دشوار امر ہے۔ لہذا اس فعل کو گستاخی پر حمل نہ کیا جائے، بلکہ ایک مجبوری امر سمجھا جائے اور جہاں ہم نے راویوں

کے ناموں میں تصحیف اور غلطی کو درست کیا ہے اور اس پر تاریخی اور ٹھوس واقعات اور شہادتیں نقل کی ہیں۔ ان کو بنظر انصاف دیکھا جائے اور جلد بازی سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔ اور اگر کسی مقام پر طرز استدلال میں کوئی خامی یا کمزوری نظر آئے تو قصور اور لغزش کو مجھ سے منسوب نہیں نہ کہ ہورسلف و خلف سے۔ کیونکہ

میرے ساتی نے عطا کی ہے نئے بے درد و وفا

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس کے علاوہ کہیں کہیں میرے اپنے استنباطات اور اجتہادات بھی ہوں گے۔ ان میں غلطی کا واقع ہونا بہت اغلب ہے۔ اور ان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ :

”چند رخ راہ ہیں مسندل نہیں ہیں“

مسئلہ زیر بحث کی اہمیت کے پیش نظر اس کے کسی گوشہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا میرے لیے اپنی تہی مائیگی اور بے بضاعتی کے باعث چھوٹا سا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلہ پر ایسے حضرات خامہ فرسائی کرتے جو خود بھی کچھ ہوتے۔ یہاں اپنا حال یہ ہے کہ اس پر کچھ لکھنا ہی اس بڑے اہم اور مبارک کام کی توہین ہے لیکن جب میں نے اس مسئلہ کے جمع و ترتیب اور تحقیق و تمحیص کے لیے قدم اٹھایا تو صورت حال کا یہ نقشہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی اور طاقت ہے جو بے اختیار یہ کام لے رہی ہے۔

میری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے

قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ضروری التماس: حتی الوسع میں نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو مکمل اور واضح کرنے میں انتہائی کوشش کی ہے لیکن باوجود اس کے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آخری کتاب ہے۔ یا باوجود اتنی محنت اور کاوش اٹھانے کے یہ کتاب غلطیوں سے بالکل میرا ہے کیونکہ اقل تو انسان کا کوئی کام لغزش اور خطا سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خطا اور نسیان انسان کا خمیر ہے۔ اور پھر کام بھی اس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر و خطا ہو۔ اس کی نسبت بالکل صحت کا دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟ لہذا التماس ہے کہ

مذہبِ ملامت بنانے کے بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو غلط بات کی تلافی کرنے اور حق کے تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
الغرض کتاب کی معنوی صورت ہو یا صورتی، بہر حال نگاہ مقصود پر رکھیے اور میری کوتاہیوں پر مجھے مطلع کیجیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

نغمہ کجا و من کجا
سوزِ قطری کشم ناقہ بے زمام را

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ قلب میں اپنی محبت، ارادہ میں قوت، جسم میں صحت اور عمر میں درازی عطا فرمائے اور کتاب و سنت کی پیروی اور حضرات سلف صالحین کی اتباع اور اطاعت کا صحیح جذبہ مرحمت فرمائے اور ہر نیک عمل میں اخلاص و احسان کی توفیق دے۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو کتاب کا ہر عیب حسن ہے اور اگر یہ نہ ہو تو تمام خوبیاں بے معنی ہیں اور اس فقیر بے زاد اور ماہی بے آب اور تہی دست علم و عمل کی خدائے برتر و بزرگ سے نہایت اخلاص سے یہ دعا ہے کہ جب تک دنیا میں زندہ رکھنا ہے تو اپنی رضا اور خوشنودی کی توفیق دے۔ اور جب دنیا سے اٹھانا منظور ہو تو خاتمہ یا نخر ہو۔

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر

یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ط

ابوالزاہد محمد مسرور فرار خاں صدقہ

خطیب جامع گگھر، ضلع گوہر انوالہ

۲۰ رجب ۱۳۷۲ھ

۱۵ مارچ ۱۹۵۵ء

مقدمہ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَاتَمِ نَبِيَاءِ
وَالْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ الْمُهْتَدِينَ وَعَلَى جَمِيعِ أُمَّتِهِ
وَالْوَثَمَةِ الْمُقَرَّبِينَ الَّذِينَ بَلَّغُوا كَلَامَ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَأَحَادِيثَ
رَحْمَتِهِ لِلْعَالَمِينَ إِلَى النَّاسِ كَمَا قَدْ لِيَدْخُلُوا بِهَا جَنَاتِ الْخُلْدِ وَالْبَسَائِتِ

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصول موضوعہ کے طور پر محل نزاع کو اور اس کے اہم اجزائے بحث کو متعین کر لیا جائے۔ تاکہ مسئلہ زیر بحث کی تہ تک پہنچنے میں وقت پیش نہ آئے۔ سو ہماری تحقیق یہ ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے نہ جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اور نہ ستری نمازوں میں۔ مقتدی کا وظیفہ تمام نمازوں میں یہ ہے کہ پوری وجمعی اور نہایت خاموشی کے ساتھ امام کی قرآۃ کی طرف توجہ کرے، سُننے یا نہ سُننے، ہمارے اس دعویٰ پر نص قرآنی موجود ہے جس کا معنی اجماع اور اتفاق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرآۃ سے منع کیا گیا ہے۔ اور صحیح و صریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں بھی اس پر موجود ہیں اور حضرات خلفائے راشدینؓ اور ان کے علاوہ جہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واتباع تابعین رحمہم اور محدثین رحمہم و فقہاء رحمہم کی اکثریت بھی ہمارے ساتھ ہے۔ خصوصاً جہری نمازوں میں۔ ان میں ہر ایک امر کی پوری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات صحابہ کرام رض

وہ حضرات صحابہ کرام رض جو امام کے پیچھے تمام نمازوں میں قرآن کے قائل نہ تھے؛
حضرات خلفائے راشدین رض، حضرت عبداللہ بن عمر رض، حضرت جابر بن عبداللہ رض، حضرت
زید بن ثابت رض، حضرت عبداللہ بن مسعود رض، حضرت ابوالدرداء رض اور حضرت عبداللہ بن
عباس رض وغیرہ۔

اور وہ حضرات جو بہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔ ان میں؛
حضرت عائشہ رض اور حضرت ابوہریرہ رض وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غرض کہ امام
کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رض میں شایع نہ تھا۔
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح لکھتے ہیں کہ

زیرا کہ خواندن فاتحہ با امام در صحابہ رض چنانچہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا
شایع نبود۔ (مصطفیٰ جلد ۱ ص ۱۳۱ طبع جمینی پٹی) حضرات صحابہ کرام رض میں شایع نہ تھا۔
حضرات تابعین رح

جو تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔ ان میں سے حضرت سید رح بن عقیل رض،
سعید بن جبیر رح، سعید بن السیب رح، محمد بن سیرین رح، اسود بن زید رح، علقمہ بن قیس رح اور حضرت
ابراہیم نخعی رح وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

اور جو اکابر بہری نمازوں میں قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت عروہ بن زبیر رض، قاسم بن محمد رض،
امام زہری رح، نافع بن جبیر رض، حسن بصری رح، مجاہد بن جبیر رح، محمد بن کعب القرظی رح، ابو حلیہ
ریاحی رح اور امام شعبی رح وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرات اتباع تابعین رح

جو حضرات مطلقاً امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت سفیان بن عیینہ رح،
سفیان ثوری رح اور امام اوزاعی رح وغیرہ مشہور و معروف ہیں۔ و علیٰ ہذا القیاس۔ امام
لیث بن سعد رح اور عبداللہ بن وہب رح مشہور ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور قرأت
خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ اور امام بخاری رح کے استاد استاد حضرت عبداللہ بن مساکن رح

جہری نمازوں میں قرآنہ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار اتباع تابعین ہیں، جن کا احصار اور احاطہ اگر محال نہیں تو آسانی کے ساتھ ممکن بھی نہیں ہے۔ ان تمام اکابر کے اقوال و مسالک پورے حوالہ جات کے ساتھ اور ایک ایک سند مع توثیق و راست اور دفع شبہات و تصحیح کے ساتھ اپنے موقع پر پوری بسط کے ساتھ بیان ہوں گے۔
انشاء اللہ العزیز۔

حضرات ائمہ اربعہ رحم

چونکہ ائمہ اربعہ کے پیروکار ہر دور میں اکثریت کے ساتھ رہے ہیں اور آج بھی اکثریت مقلدین حضرت ائمہ اربعہ رحم کی ہے۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ان حضرات کا مسلک بھی عرض کر دیں۔ اور ان کے بعد ان جلیل القدر ہستیوں کا نظریہ بھی تحریر کر دیں جن کے بارے میں فریق ثانی کو خاص طور پر غلط فہمی ہوتی ہے اور ان ائمہ کرام رحم میں سے علی الخصوص حضرت امام ابو حنیفہ رحم کا ذکر پہلے مناسب ہے، جو علم، عمر، تقویٰ و ریح اور شرفِ تابعیت کے حاصل کرنے میں دوسرے جلد ائمہ سے خاص درجہ اور فضیلت کے مالک تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحم (المتوفی ۱۵۰ھ)

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے مطلقاً قائل نہ تھے۔ نہ جہری نمازوں میں اور نہ ستری میں۔ چنانچہ مولانا عبد الرحمن صاحب مبارک پوری رحم تحریر فرماتے ہیں کہ امام محمد رحم موطا میں لکھتے ہیں: ”کہ امام کے پیچھے قرآن نہ کرنی چاہیے خواہ امام ہر سے قرآن کرتا ہو یا آہستہ، اسی پر عام اتفاق و دلالت کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحم کا مسلک اور مذہب بھی یہی ہے۔“

۱۔ تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص: ۲۵۸۔ یہ عبارت موطا امام محمد ص ۹۴۔ جامع المسانید جلد ۱ ص ۳۳۶۔ فتح القدر جلد ۲ ص ۲۴۱۔ اور روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ وغیرہ میں بھی نقل کی گئی ہے۔

۲۔ امام موصوف سے متعلق بھی نہ جاننے والوں اور متعصب لوگوں نے کیا کیا الزام نہیں لگائے؟ کسی نے ان کو ضعیف کہا اور کسی نے یتیم فی الحدیث کے خطاب سے نوازا۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ علامہ ذہبی (المتوفی ۴۸۸ھ) ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ”کہ وہ الامام الاعظم، (باقی اگلے صفحہ پر)“

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) فقیہ العراق، امام متورع، عالم، عامل، متقی اور کیرا نشان تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ
 جلد ۱ ص ۱۵۸)۔ حافظ ابن عبد البر (المتوفی ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام وکیع رحمہ نے ان سے بہت سی
 حدیثیں سنی ہیں۔ (کتاب الانتصار ۲ ص ۱۵) اور لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے امام موصوف سے روایتیں کیں
 اور ان کی توثیق و تعریف کی۔ وہ ان سے بہت زیادہ ہیں جنہوں نے (بلاوجہ) ان میں کلام کیا ہے۔ (مختصر کتاب العلم
 ص ۱۹۲) امام ابن معین رحمہ (المتوفی ۲۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام موصوف ثقہ تھے۔ وہ صرف اسی حدیث کو
 بیان کرتے تھے جو ان کو اچھی طرح یاد ہوتی تھی۔ امام عبد اللہ بن المبارک رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم نے فقہ میں امام
 ابو حنیفہ رحمہ جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام الحجرج والتعیل، یحییٰ بن سعید القطان (المتوفی ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں ہم نے
 قدوس کی تکذیب نہیں کرتے، ہم نے امام موصوف سے بہتر رائے اور بات کسی کی نہیں سنی۔ (تہذیب
 التہذیب جلد ۱ ص ۲۲۹)۔ امام شافعی رحمہ فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ کے عیال اور شا
 چیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۲۶) تہذیب جلد ۱ ص ۲۲۹)۔ علامہ تاج الدین سبکی رحمہ (المتوفی ۸۴۸ھ)
 لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کی فقہ بڑی مشکل اور دقیق ہے (طبقات کبریٰ جلد ۲ ص ۱۴۴)۔ سزا یہ اسی وجہ سے
 ناہل اور سطحی قسم کے لوگ ان کی فقہ سے نفرت کرتے ہیں۔ غلام خطیب بغدادی (المتوفی ۴۶۳ھ) باوجود امام
 موصوف پر انتہائی جرح نقل کرنے کے ان کی ذاتی خوبیوں اور علمی قابلیتوں کا انکار نہیں کر سکے اور صاف
 لکھتے ہیں کہ علم عقائد اور کلام میں لوگ ابو حنیفہ رحمہ کے عیال اور شاخچیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۸۱)۔
 مشہور محدث اسرائیل (المتوفی ۱۶۲ھ) کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ کیا ہی خوب مرد تھے جنہوں نے ہر
 ایسی حدیث کو اچھی طرح سے یاد کیا جس سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے۔ اور وہ بڑی احتیاط
 کرنے والے اور فقہی مسائل پر عبور رکھنے والے تھے (بغدادی جلد ۱ ص ۳۲۹) امام ابن معین رحمہ
 فرماتے تھے کہ علماء تو صرف چار ہیں۔ سفیان ثوری، ابو حنیفہ رحمہ، مالک اور ازاعلیٰ (البیہ والنہایہ،
 جلد ۱ ص ۱۱۶) حافظ ابن کثیر رحمہ (المتوفی ۷۴۴ھ)۔ امام موصوف کی ان الفاظ سے تعریف کرتے
 ہیں۔ الامام، فقیہ العراق، احمد ائمہ الاسلام و السادة الاعلام، احدا رکان العلماء۔ احد الامتہ الاربعہ
 اصحاب المذاهب المتبعۃ، امام عبد اللہ بن داؤد الخریزی (المتوفی ۲۱۳ھ) کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں
 کے لیے مناسب ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ کے لیے نماز میں دعا کیا کریں کیونکہ انہوں نے فقہ اور سنت کو
 محفوظ رکھا جو لوگوں تک پہنچی۔ امام سفیان ثوری رحمہ اور عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں

فاتحہ لا: اس عبارت سے امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) کا مسلک بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ

(نقیہ حاشیہ) سب روتے زمین پر بستے والوں سے بڑھ کر فقہ جاننے والے امام ابو حنیفہؒ تھے۔ امام مکی بن ابراہیم رحمہ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ علم اہل الارض تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۰) علامہ ابن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں کہ امام موصوف علم حدیث کے بڑے مجتہدین میں سے تھے (مقدمہ ص ۲۲۵) اور لکھتے ہیں کہ فقہ میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ کوئی دوسرا ان کی نظیر نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے تمام ہم عصر علمائے ان کی اس فضیلت کا اقرار کیا ہے۔ خاص طور پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے۔ (مقدمہ ص ۲۲۷) علامہ محمد طاہر رحمہ (المتوفی ۹۸۶ھ) لکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک امام موصوف کی مقبولیت کا کوئی خاص راز اور بھید نہ ہوتا۔ تو امت محمدیہ (علی صاحبنا الف الف تحیة) کا ایک نصف حصہ کبھی ان کی تقلید پر مجتمع نہ ہوتا (مکملہ مجمع البحار جلد ۳ ص ۵۲۷) مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رحمہ، امام شعبہؒ اور سفیان ثوری رحمہ سب ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تحقیق الکلام ص ۱۲) نیز تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث (کی قیود اور شرائط) کے بارے میں جتنی تشدید پابندی اور احتیاط امام ابو حنیفہ رحمہ نے کی ہے اور کسی نے اس کا ثبوت نہیں دیا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۱۵) ہم نے اپنی کتاب مقام ابی حنیفہ رحمہ میں امام صاحبؒ کے امام حدیث و فقہ ہونے پر باحوالہ سیر حاصل بحث کی ہے اور عناد و تعصب کی وجہ سے جن لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے ہیں ان کے ٹھوس جوابات بھی ہم نے اسی کتاب میں عرض کر دیے ہیں۔

نواب صدیقی حسن خاں صاحبؒ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) رقم طراز ہیں:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کو کافی وی۔ چنانکہ در علم دین منصب امامت وارد۔ ہم چنان در زہد و عبادت

امام سالکان است۔ (تقصیر جمہور الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۹۳)۔

حضرت اگر امام موصوف میں کوئی خوبی نہ ہوتی۔ تو امت کی اکثریت کے علاوہ امام یحییٰ بن سعیدؒ

امام وکیع بن الجراح رحمہ امام ابن معین یحییٰ بن زکریا وغیرہ ایسے امام حدیث کبھی ان کی تقلید نہ کرتے۔ (دیکھیے

طائفہ منصورہ) شاید نواب صاحبؒ نے بھی امام اعظم کا خطاب متعصب لوگوں کے لوش کو کم کرنے کے لیے

اختیار فرمایا ہے اور علامہ ذہبیؒ بھی ان کی تعریف الامام الاعظم سے شروع کرتے ہیں۔ "وَالْفَضْلُ مَشْهُدٌ بِرِ الْاَعْلَامِ"

بعض قاصر اور غیر بالغ نظروں نے امام محمدؒ کی شخصیت کو بھی پچھانا نہیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بھی کسی نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ اور یہی مضمون ان کی کتاب الآثار ص ۲۱ میں بھی منقول ہے جن لوگوں نے امام محمدؒ کا یہ مسک نقل کیا ہے کہ وہ سترمی نماز میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے کو مستحسن سمجھتے تھے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رح (المتوفی ۷۸۸ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ امام محمد رح کا یہ مذہب نقل کرتے ہیں کہ وہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کو جائز اور مستحسن سمجھتے ہیں وہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔

(فقید حاشیہ کچلا صفحہ) والد نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے، پندرہ ہزار میں نے نخر، شعر اور ادب کی تعلیم پر صرف کیے اور پندرہ ہزار حدیث اور فقہ کی تعلیم پر (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۳) امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کی اتنی راہیں نہ کھلتیں جتنی اب کھلی ہیں۔ اور میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۲۳) امام ابو عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۵) امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس سے کوئی مشکل مسئلہ پوچھا جائے اور اس کے تیوروں پر بل نہ پڑے ہوں۔ البتہ ہاں محمدؒ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (ابن خلکان جلد ۲ ص ۴۵) امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے امام مالکؒ اور امام محمدؒ..... دونوں کی رفاقت کی ہے۔ ان دونوں میں بڑا فقیہ کون ہے؟ فرمایا امام محمدؒ باعتبار نفس کے امام مالکؒ سے بڑے فقیہ ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۲ ص ۳۲۲) اس سے ملتے جلتے الفاظ یحییٰ بن صالح رح سے بھی منقول ہیں (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۵) امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) باوجود متعصب ہونے کے امام محمدؒ کو ثقات اور حفاظ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بیس عدد ثقات اور حفاظ حدیث نے بیان کی ہے جن میں امام محمد بن الحسن الشیبانی، یحییٰ بن سعید القطان، عبد اللہ بن المبارک، عبد الرحمن بن مہدی، اور ابن وہب وغیرہ شامل ہیں (سجوال نصب الرأیہ جلد ۱ ص ۴۰۹) امام دارقطنیؒ ان کو ثقات اور حفاظ میں پہلے نمبر پر بیان کرتے ہیں۔

تیرے نام سے ابستہ کر رہا ہوں

میری انتہائے نگارش یہی ہے

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں امام محمدؒ سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں دیکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۰۷) امام ابن عجمہؒ فرماتے ہیں کہ امام محمد بن الحسن فقیہ اور عالم تھے۔ انھوں نے امام مالکؒ سے بہت حدیثیں لکھی ہیں اور اسی طرح ثوریؒ وغیرہ بھی۔ (صاحب درختار نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کی طرف یہ نسبت کہ وہ امام کے پیچھے (باقی لکھے صفحہ ۱۷۶) (الانتقار ص ۱۷۶)

ان کا قول حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اور امام ابو یوسف رحمہ کی طرح ممانعت کا ہے۔ (بخاری فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۵)
 امام ابو یوسف (المتوفی ۱۸۳ھ) کا مسکب بھی اس سے واضح کاف اور آشکارا ہو گیا ہے کہ وہ بھی جملہ
 نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قرآن کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ضعیف ہے اور علامہ شامی لکھتے ہیں کہ امام محمد
 نے کتاب الآثار میں تصریح کی ہے کہ ہم جہری اور سبئی کسی نماز میں امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہیں ہیں۔

و دعوی الاحتیاط ممنوعہ بل اور یہ دعویٰ ہے کہ امام کے پیچھے قرآن کرنے میں
 الاحتیاط ہے تو یہ دعویٰ ممنوع ہے بلکہ احتیاط ترک
 باقوی الدلیلین ۱۵۔ قرآن میں ہے کیونکہ یہاں دو دلیلوں میں سے قوی تر

(رد المختار جلد ۱ ص ۳۶۶) دلیل پر عمل ہو رہا ہے۔

۱۵ امام ابو یوسف کے بارے میں فریق ثانی بعض محدثین کا ترک کوہ کا جملہ لیے لیے پھرتا ہے۔ حالانکہ بات
 یہ نہیں ہے۔ امام نسائی رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۵۵)۔ امام بیہقی لکھتے ہیں: وہ
 ثقہ تھے (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۳۲۷) حافظ عبدالقادر القرشی محنتی رحمہ (المتوفی ۷۷۵ھ) فرماتے ہیں کہ امام محمد اور امام
 ابن معین اور امام علی بن المدینی رحمہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (الجواهر المضية جلد ۲ ص ۲۲۱)

علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رحمہ اور امام احمد بن حنبل اور علی بن مدینی سب کا اس بات
 پر اتفاق ہے کہ امام ابو یوسف ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۲۳) علامہ ذہبی ان کو امام العلماء اور فقیہ القراء
 لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶۹) امام مزنی رحمہ کا بیان ہے کہ فقہاء اور اصحاب الرائے میں وہ سب سے
 زیادہ حدیث کی اتباع کرنے والے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۸۰) امام ابن قتیبہ (المتوفی ۲۷۶ھ)۔
 ان کو صاحب سنت اور حافظ لکھتے ہیں۔ (معارف ابن قتیبہ ص ۱۶) امام ابن معین ان کو صاحب حدیث اور
 صاحب سنت کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶) اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب رائے میں وہ سب سے
 زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے اور اثبوت فی الحدیث تھے۔ (ایضاً) علامہ ابن خلکان (المتوفی ۴۸۱ھ) لکھتے
 ہیں کہ امام ابو یوسف حافظ اور کثیر الحدیث تھے (ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۰۳) علامہ عبدالقادر (المتوفی ۴۹۶ھ) لکھتے
 کہ مشرق سے مغرب تک قضاة کی تقرری ان کے سپرد تھی (الجواهر المضية جلد ۲ ص ۲۲۱) امام ابن جریر ابن جوزی اور
 ابن جان ان کو عالم حافظ اور فقیہ کہتے ہیں (مقدمہ زبلی ص ۱۴) اور امام بھیمی بن معین سے امام ابو یوسف کے

حضرت امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) بھی امام کے پیچھے پھر ہی نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے حق میں نہ تھے۔ اور ستر ہی نمازوں میں گو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کی مقتدی کو اجازت دیتے ہیں۔ لیکن مع نفاذ وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ ستر ہی نمازوں میں وجوب قرآۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

(بقیہ حاشیہ) بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ثقہ صدوق (مناقب کردی جلد ۱ ص ۲۲ و مناقب موفق ۱۹۲) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جب طلبِ حدیث کا شوق حاصل ہوا تو سب سے پہلے میں قاضی ابویوسف کی خدمت میں حاضر ہوا (بغدادی جلد ۱ ص ۲۵۵) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ اور متقن تھے۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۳) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ حسن الحدیث ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۳۷) امام ابن عبدالبرؒ امام طبرہنی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابویوسفؒ فقیہ عالم اور حافظ تھے پچاس اور ساٹھ تک حدیثیں وہ ایک مجلس میں یاد کر لیا کرتے تھے اور وہ کثیر الحدیث تھے۔

(الانتقاء ص ۱۷۲)

امام مالکؒ کا یہ مذہب و مسلک ان کی مشہور کتاب موطا ص ۲۹ اور تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۵۰ و معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۲۳ و روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ و فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۷ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۵ وغیرہ میں منقول ہے۔

امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، فقیہ الامت، شیخ الاسلام اور امام دار ہجرت تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ اگر امام مالکؒ اور ابن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا اور ابن وہبؒ فرماتے ہیں اگر امام مالکؒ اور امام لیثؒ نہ ہوتے تو ہم گمراہ ہو جاتے۔ (تذکرہ ص ۱۹۴)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں۔ میں نے امام اسحاق بن ابراہیم کو کہتے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالکؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کسی مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو وہی مسئلہ حق اور سنت ہوگا۔ اگرچہ اس میں نص موجود نہ بھی ہو۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۵) راقم السطور کہتا ہے کہ امام ثوریؒ اور اوزاعیؒ سب نمازوں میں اور امام مالکؒ پھر ہی نمازوں میں ہمارے ساتھ ہیں اور ستر ہی نمازوں میں بھی وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ لہذا اس مسئلہ میں یہی مسئلہ حق اور سنت ہے اور نص قرآنی اور احادیث صحیحہ کے صریح حوالے اس مسئلہ میں جو سونے پر سہاگہ ہے۔

حضرت امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) امام موصوف کا مسئلہ زیر بحث میں صحیح مسلک کیا تھا؛ اس کے سمجھنے اور نقل کرنے میں بڑے بڑے ائمہ فن نے بیچ در بیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور اس کو ایک معمر اور عقده لانیل بنا دیا ہے۔ کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف سب نمازوں میں قرآن الفاتحہ خلف الامام کے وجوب کے قائل تھے۔ اور کسی نے کہہ دیا کہ ان کا قدیم قول یہ ہے کہ جس ہی (بقیہ حاشیہ) امام عبد الرحمن بن ہمدانی، امام مالکؒ پر کسی کو ترجیح نہ دیتے تھے۔ (تمہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۰۷)

علامہ ابن سعد فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ ثقہ، مومن، مثبت، متورع، فقیہ، عالم اور حجت تھے۔

(تمہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۰۷)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمة الاربعۃ، اصحاب المذہب المتبعہ تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۰۷)

امام ابن عبد البرؒ نے کتاب الانتقار میں کم و بیش ۶۶ صفحات میں ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ فرماتے ہیں۔ امام دار ہجرت و امامت از ائمہ مذاہب (تقصیر جلد ۹)

لہ علامہ ذہبی ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام العلم۔ جبر الامت اور ناصر السنۃ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۹) امام سنان بن راہویہؒ فرماتے ہیں۔ مجھ سے امام احمدؒ نے فرمایا۔ آؤ تمہیں ایسا شخص بتاؤں جس کا نظیر اور ثقیل تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر مجھے امام موصوف کے پاس لے گئے۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۷۱) امام ابو ثورؒ فرماتے ہیں میں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود انھوں نے بھی اپنا نظیر نہیں دیکھا ہوگا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۹)۔ امام ابن عبد الحکم لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ ہر بات میں حجت ہیں (تمہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۰۷)

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ احد العلماء ثقہ اور مومن تھے۔ (تمہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۰۷) حافظ ابن کثیر نے ان کی ایسے شاندار الفاظ اور عبارات سے تعریف کی اور عقیدت کے پھول برسائے ہیں جن کے واقعی امام موصوف اہل اور مستحق ہیں۔ (دیکھیے البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۵) علامہ ابن عبد البرؒ نے ابن عبد الحکم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ صاحب سنت و اثر اہل فضل و فصاحت اور مضبوط عقل کے مالک تھے۔

(الانتقار ص ۷۳)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں۔ امام شافعیؒ ہم فضل وقت وہم علم عہد وہم حجت الامم وہم مقدم الامم۔ (تقصیر ص ۹۳) یہ قول علامہ بدر الدین علیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۳ میں اور اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی نقل کیا ہے۔

نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کی جائے۔ اور قول جدید یہ ہے کہ جہری ہوں یا ستر ہی، تمام نمازوں میں قرآن واجب ہے۔ اور کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف کے دو قول ہیں۔ ایک جہری نمازوں میں ممانعت کا اور دوسرا اجازت کا۔ لیکن حقیقت ان تمام باتوں کے بالکل عکس ہے۔

امام موفق الدین ابن قدامہ الحنبلیؒ (المتوفی ۴۲۸ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وجملة ذلك ان القراءة غير واجبة
على المأموم فيما جهر به الامام ولا فيما
استربه نص عليه احمد في رواية
الجماعة وبذلك قال الزهرري والثوري
وابن عيينه ومالك وابو حنيفة وأصحابهم
اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت واجب
نہیں نہ جہری نمازوں اور نہ ستر ہی میں امام احمد
بن حنبلؒ نے صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے جیسا کہ
علماء کی ایک جماعت نے ان سے نقل کیا ہے اور امام
زہریؒ، ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور

ابن کثیر بھی ہیں۔ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۳)

یہ قول امام مزنیؒ (المتوفی ۲۶۲ھ) نے مختصر مزی جلد ۱ ص ۴۹ میں امام بیہقیؒ نے (کتاب القراءۃ ص ۱) میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے (تنوع العبادات ص ۱۰) میں نقل کیا ہے۔

آپ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر تھے اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تلامذہ میں تھے۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور طبقات روایات کے متبحر اور بے مثل عالم تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے۔

عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ دمشقی جو الفقیہ، الزاہد، الامام، شیخ الاسلام اور اہل اعلام تھے۔ علامہ ابن سناجہ کا بیان ہے کہ وہ امام الحنابلہ، ثقہ، حجت، نبیل، غزیر الفضل، کامل العقل اور شدید التثبت تھے۔

امام ابو شامہؒ کہتے ہیں کہ وہ شیخ الحنابلہ، امام من ائمة المسلمين، علم من اعلام الدين في العلم والعمل تھے۔ محدث ضابطہ لکھتے ہیں کہ وہ علوم قرآن و حدیث، فقہ و علم خلافت کے امام اور بکتائے روزگار تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

کہتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کے بعد ملک شام میں ان سے بڑا کوئی امام داخل نہیں ہوا۔ علامہ ذہبیؒ نے ان کے اوصاف حمیدہ پر دو مستقل جلدیں لکھی ہیں۔ (ترجمہ الشیخ فی بدر المنفی ص ۲، ۳، ۴) علامہ عمر الدین بن عبدالسلامؒ (المتوفی

۶۶۰ھ) فرماتے ہیں۔ میں نے اسلام میں دو کتاہوں کی مثال نہیں دیکھی۔ ایک محلی (علامہ ابن حزمؒ (المتوفی ۵۵۶ھ)

وقال الشافعي وداؤد لعوم قوله عليه
السلام لا صلوة لمن لا يقرأ بفاتحة الكتاب
غيرا نه خص في حال الجهل بالامر
بالانصات فبما عداه يبقى على العموم -
(النتی بلقطہ) (مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۱۱۱)
اسحاق اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعی اور داؤد فرماتے
ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کہ جس شخص
نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوگی۔ عام ہے مگر
جہری نماز میں اس حدیث سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان میں
خاصش رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہری نمازوں کے علاوہ

یہ حدیث اپنے عموم پر باقی رہے گی۔

اس عبارت سے یہ امر بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک جہری نمازوں میں امام کے
پچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نص قرآنی اور حدیث صحیحہ اَنْصَبُوا کے خلاف ہے۔
فائدہ ۱۔ اس عبارت سے جس طرح امام شافعی کا مسلک واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے
اسی طرح امام داؤد و ظاہری کا مسلک بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پچھے
سورۃ فاتحہ کی قرآہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ جہری نمازوں میں امام کے پچھے فاتحہ الکتاب
کا پڑھنا انصاف مامور بہ کے منافی ہے۔ ممکن ہے کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ ہو سکتا ہے
امام ابن قدامہ ہی کو امام شافعی کے مسلک کے سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی واقع ہوئی ہو۔
اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود امام شافعی کی تحریروں سے اس مسئلہ کو حل

بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اور دوسری مغنی ابن قدامہ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۲۵ و لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۰۲) حافظ
تقی الدین علی بن عبد الکریم (المتوفی ۵۶۷ھ) لکھتے ہیں کہ مغنی ابن قدامہ حنبلی کی بلند پایہ اور معتمد کتاب ہے
(شفاء السقام ۲ ص ۱۲۹) اور حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام تھے۔ جمہیہ اور معتدلہ کے بغیر
باقی تمام فرقہ ان کی مقبولیت، تعظیم اور امامت پر متفق ہیں (اجماع الجیش الاسلامیہ ص ۶۹ طبع امرتسر)
لہ امام داؤد بن علی (المتوفی ۲۷۰ھ) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ اصحاب ظاہر کے امام متبرع، عابد
اور زاہد تھے (بغدادی جلد ۸ ص ۳۶۹)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ المحافظ، الفقیہ، المجتہد اور

فقیہ اہل النظاہر۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۳۶)

کردیں۔ امام موصوف تحریر فرماتے ہیں؛
 فالصمد في ترك القراءة بامر القرآن
 والخطأ سوا في ان لا تجزئ ركعة
 الا بها او بشئ معها الا ما يذکر
 من المأموم انشاء الله تعالى۔
 (کتاب الامم جلد ۱ ص ۹۹)

سورۃ فاتحہ کا دیدہ دانستہ ترک کرنا اور بھول کر
 ترک کرنا دونوں کا حکم ایک ہے کہ کوئی رکعت سورۃ
 فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کے
 بغیر جائز نہیں ہو سکتی۔ ماں مگر مقتدی کا حکم آگے
 ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

امام موصوف کی اس عبارت کو بار بار پڑھتے اور ملاحظہ کیجئے کہ مقتدی کے لیے سورۃ
 فاتحہ کے پڑھنے کو کیوں مستثنیٰ قرار دیتے ہیں؟ اگر مقتدی کے لیے بھی سورۃ فاتحہ کا پڑھنا
 ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ امام اور منفرد کے لیے تو ان کی اس تفریق کا کیا مطلب؟ پھر آگے
 تحریر فرماتے ہیں:

فواجب علی من صلی منفردا او
 اماما ان یقرأ بام القرآن فی کل رکعة
 لایجزئہ غیرها واجب ان یقرأ
 معها شیئا آیة او اکثر وسا ذکر
 المأموم انشاء الله تعالى۔

سو منفرد اور امام پر واجب ہے کہ وہ ہر رکعت
 میں سورۃ فاتحہ پڑھیں اس کے علاوہ کوئی اور سورۃ
 کفایت نہیں کر سکتی اور میں اس کو بھی زیادہ
 پسند کرتا ہوں کہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ کچھ اور بھی
 پڑھیں ایک آیت ہو یا اس سے زیادہ۔ اور میں
 مقتدی کا حکم آگے بیان کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(کتاب الامم جلد ۱ ص ۹۳)

اس عبارت میں بھی امام موصوف، امام اور منفرد کی تصریح کرتے ہوئے ان کا یہ فریضہ اور
 وظیفہ بتلاتے ہیں کہ ان کو نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے۔ مگر یہ بھی تصریح
 کرتے ہیں کہ مقتدی کا وظیفہ اور فریضہ کچھ اور ہے۔ جس پر ہر نماز اور ہر رکعت میں سورۃ
 فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ میں انشاء اللہ العزیز خود اس کا حکم
 بیان کروں گا۔ وہ کونسا حکم ہے جس کا دو مرتبہ وعدہ کیا ہے؟ تحریر فرماتے ہیں۔

اور ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی
 جائے اور امام ایسی قرآءت کرتا ہو جو سنی نہ جاتی ہو

و نحن نقول کل صلوة صلیت
 خلف الامام والامام یقرأ قرآءة لا

یسمع فیہا قرآ فیہا۔ تو مقتدی ایسی نماز میں قرآ کرے۔

(کتاب الامم جلد ۷ ص ۱۵۳)

امام شافعیؒ کی یہ عبارت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ مقتدی کو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا درست نہیں ہے اور نہ واجب ہے۔ بلکہ مقتدی صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھ سکتا ہے جن میں امام کی قرآ نہ سنی جاسکتی ہو اور وہ ستری نماز ہے۔ اسی لیے انھوں نے قرآ لا یسمع ارشاد فرما کر جہری اور ستری نمازوں میں مقتدی کا وظیفہ متعین کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ حضرت امام شافعیؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ خوش فہمی اور غلطی کا شکار ہے بلکہ اس کو تعدیل مزاج کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

فائدہ: راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی تعیین میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اور قول قدیم و جدید کا جو جھگڑا چل نکلا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہی کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ امام الحرمینؒ (المتوفی ۲۴۷ھ) وغیرہ نے غلطی سے کتاب الامم کو امام شافعیؒ کی کتب قدیمہ میں شامل سمجھ لیا ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے بھی اس امام عالی مقام کی جلالت شان کی وجہ سے اس بات پر بھروسہ اور اعتماد کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے اور یہ سارا جھگڑا ہی اس مفروض پر مبنی ہے۔ ہم اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی اس تاریخی غلطی پر دو تاریخی شہادتیں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

ثم انتقل منها الى مصر فاقام بها الى ان مات في هذه السنة (سنہ ۲۴۷ھ) و صنف كتاب الامم وهو من كتب الجديدة لانه من رواية الربيع بن سليمان وهو مصري

پھر حضرت امام شافعیؒ بغداد سے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور وہیں اقامت پذیر ہوئے حتیٰ کہ سنہ ۲۴۷ھ میں اسی جگہ ان کی وفات ہوئی اور مصر میں ہی انھوں نے کتاب الامم تصنیف کی ہے اور وہ ان کی جدید کتابوں میں ہے۔

لہٰذا ان کا نام عبد الملک، ابو العالی کنیت، اور الجویسی (ان کے والد ابو محمد عبد اللہ الجویسیؒ کی طرف) نسبت ہے۔ یہ امام خزانہؒ (المتوفی ۵۰۵ھ) کے استاد تھے۔ حدیث، فقہ اور اصول اور دیگر علوم اور فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ میں علماء شوافع کے سربراہ تھے۔ حرم مکہ اور حرم مدینہ میں عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اس لیے امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (الجواہر المفصیہ جلد ۲ ص ۲۳۶-۲۳۷ و فوائد البیہ ص ۲۳۶ طبع مصر)

وقد زعم امام الحرمين وغيره
انها من القديمر وهذا بعيد وعجيب
من مثله -
البدایہ والنہایۃ جلد ۱۰ ص ۲۵۲

کیونکہ اس کے راوی ربیع بن سلیمان (المتوفی ۲۷۰ھ) ہیں جو مصری تھے اور امام الحرمین وغیرہ نے یہ خیال کیا ہے کہ کتاب الام کتب قدیمہ میں ہے۔ لیکن یہ امام الحرمین ایسے امام سے بڑی ہی بعید اور نرالی بات ہے۔ حافظ موصوف کی یہ عبارت بڑی واضح اور صاف ہے کہ امام الحرمین وغیرہ کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ کتاب یعنی کتاب لام امام شافعی کی قدیم کتابوں میں شامل ہے نہ صرف تاریخی لحاظ سے باطل اور مردود ہے بلکہ اس کے مدعی صواب سے بڑے دور اور بڑی عجیب بات کے مرتکب ہوئے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بنا بر اس مفروض کے اجازت کا قول امام شافعی کا قول جدید قرار دیا ہے لیکن چونکہ البدایہ والنہایہ تفسیر کے بعد کی تصنیف ہے جیسا کہ خود انہوں نے البدایہ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس لیے ان کی اس جدید تاریخی تحقیق کے بعد تفسیر کا حوالہ قابل التفات نہیں ہے۔

دوسری شہادت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۹۱۱ھ) کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
ثم خرج الى مصر وصنعت بها كتيبه
پھر حضرت امام شافعی مصر کی طرف روانہ ہوئے۔
الجدیدۃ کا اہم الخ (حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۲۷) اور وہاں کتب جدیدہ تصنیف کیں جن میں کتاب الام بھی ہے
ان تاریخی شہادتوں سے ثابت ہو گیا کہ کتاب لام حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی کتب جدیدہ میں ہے۔ اور امام کے پیچھے مقتدی کا سورۃ فاتحہ کو جہری نمازوں میں ترک کرنا ان کا قول جدید ہے نہ کہ قول قدیم۔
مصنف خیر الکلام نے ان خصوص حوالہ جات سے اپنے جواب کے سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے:

(۱) کہ امام شافعی مصر میں پانچ سال رہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے مصر جا کر پہلے یہی فتویٰ دیا ہو مگر بعد میں اس سے رجوع کیا ہو جیسا کہ ہم نے انور شاہ صاحب سے عبارت میں نقل کیا ہے کہ امام شافعی نے وفات سے دو سال قبل مقتدی کو جہری نماز میں قرآۃ کے روکنے سے رجوع کیا ہے بس محض اس عبارت کا مصری کتاب میں ہونا آخری قول ہونے کی کیسے دلیل بن سکتا ہے بلکہ اس جگہ تصریح کی ضرورت ہے۔ اھ (خیر الکلام ص ۲۴)

(۲) مختصر مرنی امام شافعی کے ان مسائل کا مجموعہ ہے جو مصر میں بیان فرمائے اور اختیار کیے ہیں۔

(ضحی الاسلام جلد ۲ ص ۹۱) بلکہ مزنی رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مصری شاگردوں سے ہے۔ (ضحی الاسلام جلد ۲ ص ۲۲۲)
(خیر الکلام ص ۲)

(۳) امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا صحیح قول یہی ہے کہ قرأت واجب ہے امام جہر کرے یا نہ کرے۔ (خیر الکلام ص ۲)

(۴) امام ترمذی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز کسی کام کی نہیں رہتی اکیلا پورا امام کے پیچھے ہو امام شافعی رحمہ اللہ اور امام اسحاق رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ اور علماء کا یہی مسلک ہے۔ (خیر الکلام ص ۲)

(۵) امام ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے مندرجہ ذیل ائمہ قائل ہیں امام اوزاعی رحمہ اللہ، امام لیث رحمہ اللہ، امام سعد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ جب مصر میں گئے اور یہی ان کے اکثر شاگردوں کا مذہب ہے۔ ان سے امام مزنی رحمہ اللہ اور امام بو یطی رحمہ اللہ ہیں امام ابو ثور رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(تمہید ابن عبد البر - تحقیق) (خیر الکلام ص ۲)

(۶) کتاب الام کی پہلی اور دوسری عبارت میں تصریح نہیں کہ مقتدی پر جہری نمازوں میں فاتحہ واجب نہیں منفرد اور امام کے متعلق دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ان پر صرف فاتحہ واجب ہو۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور ما زاد دونوں واجب ہوں مگر مقتدی کے بارے میں دو احتمال نہیں صرف ایک ہی احتمال ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۲۵، ۲۴)

(۷) کتاب الام کی تیسری عبارت میں فاتحہ کا ذکر نہیں مطلق قرآن کا ذکر ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۲)

(۸) البدایہ والنہایہ تفسیر سے پہلے کی کتاب ہے۔ کیونکہ تفسیر میں دو جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

(محصلہ خیر الکلام ص ۲۷، ۲۸)

(۹) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں بھی پڑھے

اسی طرح امام لیث رحمہ اللہ، امام اوزاعی رحمہ اللہ، امام ابن عون رحمہ اللہ، امام کحول رحمہ اللہ اور امام ابو ثور رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

(جلد ۱ ص ۶) (خیر الکلام ص ۲)

(۱۰) معالم التنزیل میں ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک قرآن واجب ہے خواہ امام قرآن بلند

آواز سے پڑھ رہا ہو یا آہستہ یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور

معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ (خیر الکلام ص ۲۸، ۲۷)

(۱۱) علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ ایک جگہ یہ نقل فرماتے ہیں کہ امام کے لیے فاتحہ کے بعد سکتہ کرنا مستحب ہے تاکہ اس

میں آرام کرے اور مقتدی فاتحہ پڑھ لے تاکہ مقتدی کی طرف سے امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے منازعہ واقع نہ ہو۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام اسحاق کا یہی مذہب ہے۔ (خیر الکلام ص ۲۵)

اجواب : ہم بفضلہ تعالیٰ خیر الکلام کے ترتیب وار جوابات عرض کرتے ہیں غور فرمائیں۔
(۱) ٹھوس تاریخی حوالوں اور شہادتوں کو رد کرنے کے لیے صرف ہو سکتا ہے۔۔۔۔ الخ

کوئی جواب نہیں۔ مصنف خیر الکلام پر اخلاقی طور پر لازم تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ دو تاریخی اور ٹھوس حوالوں کے ساتھ یہ نقل فرماتے کہ فلاں کتاب حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام کے بعد لکھی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ یا قرآۃ کا پڑھنا واجب ہے اور عبارت یہ ہے۔ جب وہ ایسا نہیں کر سکے تو یقین کامل رکھیں کہ کتاب الام کی صریح عبارتوں کا جواب تاہنوز کوئی نہیں ہوا۔ رہا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کا حوالہ تو وہ مؤلف

خیر الکلام کو چنداں مفید نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے جہری نمازوں میں ترک قرآۃ سے رجوع کیا ہے۔ اس سے وجوب کیسے ثابت ہوا؟ چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے نقل

کرتے ہیں کہ پھر مجھے علم نہیں کہ امام شافعیؒ نے جہری میں وجوب پسند کیا جیسے کہ شافعیہ کا مسلک ہے یا صرف استحباب کو۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۶۱) اور فصل الخطاب میں فرماتے

ہیں کہ میرے خیال میں امام شافعیؒ بھی جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے ہیں فرض نہیں سمجھتے۔ (خیر الکلام ص ۲) باقی رہا فیض الباری جلد ۱ ص ۳۵۳ کا حوالہ جس میں لکھا ہے

کہ امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی پر قرآۃ کے وجوب کے قائل ہو گئے تھے۔ (محصلاً) تو ظن غالب یہ ہے کہ یہ مترجم صاحب کی غلطی ہے جنہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی املاتی تقریر

کو اپنی صوابدید کے مطابق عربی کا جامہ پہنایا ہے ورنہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ جلد اول میں وجوب کا حکم بیان فرمائیں اور جلد ثانی میں فرمائیں کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ آیا وہ وجوب کے قائل

تھے یا استحباب کے؟ اور فصل الخطاب میں یہ فیصلہ صادر فرمائیں کہ امام شافعیؒ جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے تھے فرض نہیں سمجھتے تھے۔ غور فرمائیے کہ تحقیقی طور پر اس سے

زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور خود مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کہتے ہیں:

ونقل ابن تیمیہ الاجماع عندہ
یدل علی ان وجوب القراءة فی
الجماع تعلق کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا
ہے کہ جہری نمازوں میں وجوب قرآنہ خلاف
الجماع ہے یا اہل اسلام میں سے اس کا ایک شخص
زیف الباری جلد ۲ ص ۲۷۲) بھی قائل نہیں ہے۔

پھر کیونکر سمجھ لیا جائے کہ ان کے نزدیک امام شافعی جہری نمازوں میں وجوب قرآنہ کے قائل
ہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعی امام شافعی وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے وجوب
قرآنہ کے قائل ہو گئے تھے تب بھی ایک بات نہایت ہی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ تقریباً چھ سال
تک جو نمازیں حضرت امام شافعی نے پڑھی ہیں جن میں وہ جہری نمازوں میں قرآنہ خلف الامام کے
قائل نہ تھے کیا ان کی وہ نمازیں درست اور صحیح ہیں یا نہیں؟ اور کیا صرف دوسرے حضرات کی
نمازیں ہی جن میں قرآنہ فاتحہ نہ کی گئی ہو باطل کا عدم اور بیکار ہیں یا حضرت امام شافعی کی ان نمازوں
کا بھی یہی حشر ہے؟ اگر کسی اور کی تحقیق بھی دیا تا وہی ہو جو وفات سے دو سال قبل تک حضرت امام
شافعی کی تھی تو فرمائیے کہ اس کی نماز کیوں کا عدم، بیکار اور باطل ہوگی؟ یا یہ چورن اور
امرت دھار صرف حنفیوں کے لیے ریزرو اور وقف ہے۔ کیا خوب؟

ابھی کیا ہے ابھی تو ابتدا ہے دیکھتے جاؤ

ہمارے حال پر یاروں کے احسان اور بھی تنگے

(۲) چونکہ باقر صاحب خیر الکلام حضرت امام شافعی مصر میں پانچ سال رہے تھے اس
لیے اگر مختصر مزنی ان کے مصری مسائل کا مجموعہ بھی ہو اور مزنی ان کے مصری شاگرد بھی ہوں تب
بھی اس سے یہ کیونکر ثابت ہو کہ یہ مجموعہ کتاب الام سے بھی بعد کا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ
پہلے کا ہو اور کتاب الام ان کی صحیح طور سے کتب جدیدہ میں ہو اور امام مزنی نے باوجود مصری
ہونے کے مختصر مزنی کی تدوین کتاب الام سے پہلے کی ہو۔ یہ جواب صحیح ہونے کے علاوہ مصنف
خیر الکلام کی اپنی پسند کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ
امام مزنی رح اور امام بولیطی رح اصحاب شافعی رح اور بڑے پائے کے محدث اور فقیہ تھے۔

لیکن ربیع بن سلیمان المرادی رح (المتوفی ۲۷۰ھ) کو ان دونوں پر ترجیح ہے۔ چنانچہ امام خلیلؒ فرماتے ہیں کہ

تقدمتفق علیہ والمزنی مع جلالہ
 استعان علی ما فاتہ عن الشافعی بکتاب
 الربیع وقال مسلمة من کبار اصحاب
 الشافعی رح - (۵۱)
 ربیع بن سلیمان ثقہ اور متفق علیہ ہیں اور
 امام مزنی رح نے باوجود جلالہ شان کے جو مسائل
 امام شافعیؒ کے ان سے چھوٹ گئے تھے ان میں
 ربیع کی کتاب سے استعانت کی ہے اور مسلمہ
 فرماتے ہیں کہ ربیع امام شافعیؒ کے بڑے اصحاب میں
 شمار کیے جاتے ہیں - (ص ۲۳۶)

اس سے معلوم ہوا کہ امام مزنی کو حضرت امام شافعیؒ کے تمام مسائل معلوم نہ تھے بلکہ ان سے کچھ چھوٹ بھی گئے تھے اور امام شافعی رح کے مسائل میں وہ ربیع بن سلیمان رح کے خوشہ چیں تھے۔ پھر کیوں نہ ہو کہ حضرت امام شافعی رح کے مسائل میں امام ربیع بن سلیمانؒ پر اعتماد کیا جاتے جن پر خود امام مزنی نے اعتماد کیا ہے۔ اور مولیٰ احمد بن مصطفیٰ المعروف بطاش کبریٰ زادہ رح (المتوفی ۱۹۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ

الربیع بن سلیمان - الثقة الثبت
 فیما یروید حتی رجوا روایتہ عند تعارض
 المزنی مع علوقدر المزنی علماً ودیناً و
 جلالہ - ۵۱
 ربیع بن سلیمان - جو کچھ بھی روایت کرتے
 ہیں اس میں وہ ثقہ اور ثبت ہیں حتیٰ کہ محدثین رح
 نے ان کی روایت کو مزنی کی روایت پر جب کہ دونوں
 کی روایت کا تعارض ہو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ امام
 مزنی علم اور دین اور جلالہ میں بلند مرتبہ تھے۔
 (مفتاح السعادة ومصباح السيادة جلد ۲
 ص ۱۶۲ طبع حیدرآباد دکن)

اس سے بھی ثابت ہوا کہ جب امام ربیع اور امام مزنی رح کی روایت میں تعارض ہوتو محدثین کرام کے نزدیک امام ربیع بن سلیمانؒ کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور امام ابوالحسین رح فرماتے ہیں کہ

البویطی کان یقول الربیع اثبت فی
 امام بویطی فرماتے تھے کہ امام شافعیؒ سے روایت

الشافعی رحمہ منی ۱۵ (تمہذیب التہذیب کرنے میں ربیعؓ مجھ سے بھی زیادہ اثبت ہیں۔

(جلد ۳ ص ۲۳۶)

قطع نظر کتاب الام اور مختصر منزی اور مختصر بولیطی کے تقدم و تاخر کے خود امام بولیطیؓ اور محدثین کے فیصلے کی رو سے امام ربیع بن سلیمانؓ کی روایت کو تاریخی اور صریح حوالوں کے پیش نظر ترجیح ہے۔ اس لیے اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کتاب الام پہلے کی ہے اور مختصر منزیؓ اور مختصر بولیطیؓ بعد کی ہیں تب بھی ترجیح امام ربیع بن سلیمان ہی کی روایت کو ہوگی جو کتاب الام کے اور امام شافعیؒ کے مسائل کے راوی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بقول حافظ ابن تیمیہؒ حذاق اصحاب الشافعیؒ مثلاً امام رازیؒ اور ابن عبدالسلامؒ وغیرہ نے اسی پر عمل کیا ہے کہ جہری نمازوں میں قرآنہ خلف الامام درست نہیں۔ (عبارت آگے آ رہی ہے)

(۵۲۳ د) کا جواب یہ ہے کہ یہ سب حوالے اس امر پر مبنی ہیں کہ مختصر منزی اور مختصر بولیطیؓ (جو امام یوسف بن یحییٰ البولیطیؒ (المتوفی ۲۳۱ھ) کی تالیف ہے) کے حوالوں کو غلطی سے ربیع بن سلیمانؓ کی روایت پر ترجیح دی گئی ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں حضرت امام شافعیؒ کو وجوب قرآنہ خلف الامام کا قائل گردانا گیا ہے اور مصنف خیر الکلام نے تحقیق الکلام کے حوالہ سے بحوالہ تمہید ابن عبدالبرؒ امام شافعیؒ سے وجوب کا جو قول نقل کیا ہے اس میں خصوصیت سے یہ درج ہے کہ امام شافعیؒ کے اکثر شاگردوں کا یہی مذہب ہے جن میں امام منزی رحمہ اور بولیطیؒ بھی ہیں۔ بس یہیں سے اس غلطی کی بنیاد قائم ہوتی ہے کہ امام منزیؒ اور امام بولیطیؒ کے آئینہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مذہب اور مسلک متعین کرنے کی شدید غلطی کی گئی ہے۔

اور اسی پر بیچ دیر بیچ غلطیاں مرتب ہوتی ہیں؛

سخن شناس نہ دلبر اخطا میں جا است

(۶) حضرت امام شافعیؒ تو صاف طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کا جان بوجھ کر ترک کرنا یا خطا ترک کرنا دونوں اس حکم میں برابر ہیں کہ کوئی رکعت سورہ فاتحہ یا سورہ فاتحہ اور کچھ دیگر حصہ قرآن کے بغیر جائز نہیں۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم الگ ہے جو آگے بیان ہوگا اور دوسری عبارت میں تصریح کرتے ہیں کہ امام ومنفرد دونوں پر ہر رکعت میں سورہ فاتحہ

واجب ہے اس کے بغیر کوئی اور سورت جائز نہیں اور اس سے زیادہ ایک آیت یا اکثر ٹرھیں تو مجھے پسند ہے۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم کچھ اور ہے اور میں خود اس کو بیان کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ان عبارتوں میں تو وہ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ امام اور منفرد دونوں پر واجب ہے۔ اور اس سے ماخذ واجب نہیں بلکہ بہتر ہے جب سورۃ فاتحہ اور ماخذ کا الگ الگ حکم بیان فرما رہے ہیں کہ ایک واجب ہے اور دوسرا مستحب (وَأَحَبُّ) تو پھر یہ احتمال حضرت امام شافعیؒ کی عبارت میں کہاں سے پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور ماخذ دونوں واجب ہوں۔

۱۱۔ (خیر الکلام: ص ۲۵) اسی کو کہتے ہیں توجیہ القول بما لا یرضی بدقائمہ۔ اور پھر مصنف خیر الکلام کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کتاب الام سے حضرت امام شافعیؒ کا وہ حوالہ جس کا دودفعہ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے نکال کر یقید حروف تباہتے کہ یہ لو امام شافعیؒ کی معہود عبارت یہ ہے جس میں بیماری خانہ ساز توجیہ کی تصدیق ہو رہی ہے۔ مصنف خیر الکلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ خواہ مخواہ کچھ لکھ دینے سے جواب نہیں ہو جایا کرتا۔ حضرت امام شافعیؒ کی یہ دونوں عبارتیں سورۃ فاتحہ اور ہر رکعت اور امام و منفرد کے واضح الفاظ کے ساتھ بالکل صریح ہیں اور مقتدی اور ماموم کی استثناء اور وعدہ بھی ان میں صاف طور پر موجود ہے جس کا ایک ایک حرف پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ صاحب خیر الکلام کی تاویل بالکل سینہ زوری پر مشمول ہے اور قطعاً باطل اور مردود ہے۔ علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

(۷) بلا شک کتاب الام کی تیسری عبارت میں مطلق قرآۃ کا ذکر ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ نے جن پہلی دو عبارتوں میں وعدہ فرمایا ہے۔ ان میں اُم القرآن کی تصریح موجود ہے اور رو سخن نقول سے اسی وعدہ کو انھوں نے پورا کیا ہے۔ مصنف خیر الکلام اور ان کی جماعت کا اخلاقی فرض ہے کہ اگر یہ عبارت ان کے دو مرتبہ وعدہ کے ایقانے لیے نہیں تو بتلائیں کہ کتاب الام میں وہ کونسی عبارت ہے جس کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا ہے؟ (دیدہ باید)

(۸) البیایہ والنہایہ اور تفسیر ابن کثیرؒ کی ان عبارات سے قدر مشترک یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو کلمۃ البیایہ تفسیر ابن کثیر سے مقدم ہے اور نہ مکمل طور پر تفسیر اس سے پہلے کی ہے۔ کچھ

اجزاء اس کے پہلے لکھے گئے اور کچھ حصص اس کے پہلے تصنیف ہوئے اور مناسب مواقع پر ایک کے حوالے دوسری کتاب میں ذکر کر دیے گئے لیکن بایں ہمہ اس سے کتاب الام کے صریح حوالوں اور امام ربیع بن سلیمان کی راجح روایت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے کہ کتاب الام ٹھوس تاریخی شہادتوں کی بنا پر امام موصوف کی کتب جدیدہ میں سے ہے اور امام ربیع کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔

(۱۰، ۹) کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری تحقیق اس بات پر مبنی ہے کہ امام مزنی اور امام یوطی کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے اور ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ اصل غلطی کا سبب ہی یہ غلط نظر یہ ہے۔ سچ ہے کہ ۵

نخست اول چون نہر معمار کج

تا شریا می رود دیوار کج

(۱۱) کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شافعیؒ جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرآۃ کے قائل نہ تھے بلکہ امام کے سورۃ فاتحہ ختم کر چکنے کے بعد سکتہ میں سورۃ فاتحہ کے قائل تھے کیونکہ بحالت جہر امام مقتدی کی قرآۃ خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ یہ عبارت تو مؤلف خیر الکلام کے مدعی کے مطابق نہیں۔ وہ تو جہر میں بھی قرآۃ فرض قرار دیتے ہیں۔ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وقال فی الجدید یقرأ الفاتحۃ فقط فی سکنات الامامہ امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھے لیکن سکنات امام میں۔

(تفسیر جلد ۲، ص ۲۸۰)

اس سے معلوم ہوا کہ بحالت جہر امام شافعیؒ بھی مقتدی کے لیے قرآۃ کے قائل نہ تھے اور ہم نے اسی کتاب میں باحوالہ مبسوط بحث کر دی ہے کہ سکنات امام کا جن میں مقتدی قرآۃ کر سکیں (شریعت سے کوئی ثبوت نہیں جس کا کوئی معقول جواب مؤلف مذکور نے نہیں دیا۔ الغرض امام شافعیؒ کی کتاب الام کی احسن الکلام میں پیش کردہ عبارات اپنے مدلول پر بالکل نص صریح یعنی اور تاویلات بارودہ کو بالکل قریب نہیں آنے دیتیں۔ یوں تعصب و عناد اور انکار وجود کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے جب تک نگاہ تعصب نہ بدلے گی نظریات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہو سکتی؛

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی !
میں کیسے اختیار انقلاب آسمان کر لوں !

امام احمد بن حنبلؒ: (الموتوی ۲۴۱ھ) کا مسلک یہ ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرآۃ کے قائل نہ تھے۔ بلکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآۃ کرنے کو شاذ اور خلاف اجماع فرماتے تھے۔ اور سب سے نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرآۃ کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔
(تحفۃ الاحوذی، جلد ۱ ص ۲۵۷)

علامہ ذہبیؒ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں: شیخ الاسلام سید المسلمین، الحافظ اور الحجۃ (تذکرہ جلد ۶) محدث ابراہیم حمیریؒ کہا کرتے تھے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اولین اور آخرین کے علوم جمع کر دیے ہیں (ایضاً) امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے: میں نے بغداد میں امام احمدؒ سے بڑا فقیہ و عالم اور افضل کوئی نہیں دیکھا۔ (بغدادی جلد ۴ ص ۳۱۹، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸، البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۳۳۵) اور نیز فرماتے ہیں کہ جب میں بغداد سے نکلا تو میں نے امام احمدؒ سے بڑا فقیہ، زاہد اور متوسع اور عالم کوئی وہاں نہیں چھوڑا (تہذیب التہذیب ص ۷۳) علامہ خطیب ان کی تعریف یوں کرتے ہیں: امام الحدیث، الناصر للمدین، المناضل (یعنی ملافعت کرنے والے) عن السنۃ اور الصابر فی المحنتہ (بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۲) نواب صدیقی حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: امام احمدؒ امام سنت و مقتدا تھے ملت است (تقصیر ص ۹۴)

۱۵ امام احمدؒ کا یہ مسلک معنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۶، تنوع العبادات ص ۸۶، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵۔ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں مذکور ہے۔

۱۶ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۹، تنوع العبادات ص ۸۷ میں اس کی تصریح ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف وجوبہا فی حال الجہرفانہ
یعنی سورۃ فاتحہ کا جہری نمازوں میں امام کے پیچھے
شاذ حتیٰ نقل احمدؒ الایجماع علیٰ
بطور وجوب پڑھنا شاذ ہے۔ حتیٰ کہ امام احمدؒ نے اس
کے خلاف اجماع اور اتفاق نقل کیا ہے۔
(فتاویٰ: ۲ ص ۱۳۹)
(نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ائمہ اربعہ کے مسک کی تشریح کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی کہ ہم دوسرے ائمہ، محدثین اور فقہائے حوالے پیش کریں۔ بجا حضرات ائمہ اربعہ کے اقوال کی موجودگی میں اور کس کے قول کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں اکثریت ان ائمہ کی ہے جو حضرات ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی امام کے مقلد اور ان کی علمی تحقیق کے خوشہ چیں تھے۔ مگر چونکہ فریق ثانی کی طرف سے بعض ائمہ کے مساک نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم بعض ائمہ کے اقوال عرض کرتے ہیں۔

ان میں وہ ائمہ کرام بھی شامل ہیں جو خود مستقل طور پر امام تھے اور انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ عرصہ دراز تک ان کی تقلید ہوتی رہی ہے۔

امام ابراہیم النخعی: (المتوفی ۹۶ھ) کسی نماز میں امام کے پیچھے قرآن سورہ فاتحہ کے قائل نہ

تھے۔ (معنی ابن قدامہ: ۱ ص ۶۰۶، البحر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱) ان کی پوری عبارت مع تشریح کے باب سوم میں ذکر کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(نوٹ پچھلا صفحہ مصنف خیر الکلام (دیکھو ص ۳۱) کا یہ کہنا کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام کے ساتھ ساتھ نہ پڑھے بلکہ سکنات میں پڑھے (محصلاً) قطعاً باطل اور مردود ہے کیونکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سکنات کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ ان کے حوالے سے آگے اپنے مقام پر بحث آئیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر ان کی مرضی کے خلاف ان کی عبارت کا مطلب لینا کہاں کا انصاف ہے؟ اور شیخ منصور علی ناصف لکھتے ہیں:

فلا فاتحة على المأموم وعليه الجهم ورو
مقدمي پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے یہی
مالك وابو حنیفہ واحمد (فتاویٰ المأمول جلد ۱)
جمہور اہل اسلام اور ابو حنیفہ اور امام احمد کا مسک
اور مذہب ہے۔

ص ۱۸۳، شرح التاج الجامع للاصول)
لے امام نووی (المتوفی ۶۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق۔ جلالہ شان اور فقہی کمال پر سبکی اتفاق ہے۔
امام شیبانی نے اہل ذمات کے وقت کہا کہ ابراہیم نے اپنے بعد اپنے سے بڑا عالم اور فقیہ کوئی نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا حسن
بصری اور ابن سیرین بھی نہیں؟ تو شیبانی نے کہا کہ نہ صرف حسن بصری اور ابن سیرین بلکہ اہل بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام
میں کوئی بھی نہیں۔ (تہذیب الاسرار واللغات جلد ۱ ص ۴۴) علم حدیث میں ان کے اس قدر وسیع معلومات تھے کہ مشہور
حدیث اعمش رحمہ کا بیان ہے کہ میں نے جب کبھی ابراہیم رحمہ کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام زہریؒ؟ (المتوفی ۲۴۲ھ) ہماری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن سورہ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔
(کتاب القراءۃ ص ۷۵، مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۴۰۹، شرح مقنع جلد ۱ ص ۱)

(بقیہ پچھلا صفحہ) سامنے کوئی حدیث پیش کی تو انھوں نے اس میں میرے معلومات اور بڑھائے۔ بڑے
بڑے فقہاء فقہی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ سعید بن جبیرؒ کے پاس جب کوئی فتویٰ پوچھنے
کے لیے آتا تو اس سے کہتے، ابراہیمؒ کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو؟

الودائل کے پاس جب کوئی مستفتی آتا تو اس کو ابراہیمؒ کے پاس بھیج دیتے۔ اور اس سے کہ
دیتے۔ جب وہ جواب دیں مجھے بتانا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۸۹) وہ اتنے محتاط تھے کہ

اکثر یہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور اب
یہ زمانہ ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے مفسر بن بیٹھتا ہے۔ مجھے زیادہ پسند ہے کہ علم کے متعلق ایک
کلمہ بھنی سے نہ نکالوں جس زمانہ میں میں فقیہ ہوا وہ بہت ہی انحطاط کا زمانہ ہے۔ (طبقات الکبریٰ شعرائی

جلد ۱ ص ۱۳۹) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ العراق اور صاحبِ خلاص بلند پایہ علماء میں تھے اور احادیث
کے پرکھنے میں وہ مہر اف اور نفاذ تھے۔ اور گنما کی زندگی کو بہت پسند کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۷۹)

۱۵ امام زہریؒ، امام ابن مدینیؒ کا بیان ہے کہ جاز میں ثقات کا سارا علم زہریؒ اور عمرو بن دینار کے درمیان تقسیم
تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۹) عمرو بن عبد العزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اب زہریؒ سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا

کوئی نہیں رہا (ایضاً) عمرو بن دینارؒ جو خود بھی بہت بڑے محدث تھے فرماتے تھے کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ
حدیث میں کسی کو انص نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۲۸) فقہ میں وہ بہت بلند مقام رکھتے تھے۔

مدینہ کے ساتوں مشہور فقہاء کا علم ان کے سینہ میں محفوظ تھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۵) اسی فقہی کمال کی وجہ سے وہ

مدینہ کی مجلس ائمان کے مسند نشین تھے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ محمد بن نوحؒ نے فقہی ترتیب سے ان کو

تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا تھا۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۶) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ کے زمانہ
میں ان سے بڑھ کر بڑا حافظ حدیث، عالم اور احادیث کی جمع و ترتیب کرنے والا اور کوئی نہ تھا (کتاب القربۃ

ص ۷۵) حافظ ابن کثیر ان کو احد الاعلام من ائمة الاسلام اور تابعی جلیل واعلم الناس لکھتے ہیں۔ (البدایہ و

النهاہ جلد ۹ ص ۳۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ ہمارے نزدیک حدیث تفسیر اور رجال کی توثیق کرنے

کے امام ہیں۔ (الرسالہ للامام الشافعیؒ ص ۶۲) اور حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور اسی طرح امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۶۱ھ)۔

امام لیث بن سعد (المتوفی ۱۷۵ھ) امام عبداللہ بن المبارک (المتوفی ۱۸۱ھ)

(بقیہ پچھلا صفحہ) اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵)۔
 امام سفیان ثوری، علامہ ذہبی ان کو الامام، شیخ الاسلام، سید الحفاظ اور الفقیہ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱۹ ص ۱۹)۔
 امام شعبہ و ابن معین اور ایک بہت بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ سفیان فن حدیث میں امیر المؤمنین تھے۔
 ابن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے گیارہ السوشیوخ سے احادیث کی سماعت کی ہے جن میں سفیان ثوری سے افضل
 کوئی بھی نہ تھا۔ ان کی تعریف و توصیف کے لیے یہ الفاظ کیا کم ہیں؟ شعبہ فرماتے ہیں۔ سفیان مجھ سے بڑے
 حافظ ہیں۔ ورنہ فرماتے ہیں: سفیان نے اپنا نظیر خود بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ امام احمد فرماتے تھے میرے
 نزدیک سفیان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اس سرزمین پر کوئی ایسا نہیں رہا جس نے تمام
 امت متفق ہو۔ ہاں مگر وہ صرف سفیان ثوری ہی ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱)۔

امام قسطلی فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری، امام مالک سے سب چیزوں میں بڑھ کر ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱)۔
 علامہ خطیب کہتے ہیں کہ وہ ائمہ مسلمین کے بہت بڑے امام اور اعلام دین کے بہت بڑے علم تھے۔ سنبل
 ان کی امامت پر اتفاق ہے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۵۲، تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۱۳) حافظ ابن کثیر کہتے
 ہیں کہ وہ احدث الاسلام اور عابد متقی اور بے شمار تابعین سے روایتیں کرنے والے تھے۔ (البدایہ النہایہ جلد ۱ ص ۱۳۲)۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب کہتے ہیں کہ امام سفیان ثوری از اصحاب مذاہب متبوعہ بود و محدث
 جلیل و عارف نبیل علم را با سلوک کبیا داشت۔ (تقصیر ص ۲۷)۔

امام لیث بن سعد علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام احمد ان کو کثیر العلم اور صحیح
 الحدیث کہتے تھے۔ ابن مدینی ان کو ثقہ اور ثبت کہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۲۶۱) ابن وہب کا بیان
 ہے کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہم نے لیث سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۲۳۵)۔
 امام نووی کا بیان ہے کہ لیث کی مہارت فقر پر علماء کا اجماع ہے۔ اس کمال فقر کے باعث اپنے زمانہ میں مہر کے
 سب سے بڑے مفتی ہی تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۷۷) علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ الامام، الحافظ اور دیار مصر
 کے علماء کے شیخ اور رئیس تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۰۰) یحییٰ بن بکیر کا بیان ہے کہ لیث سے زیادہ کامل اور فقیہ البدن
 (باقی اگلے صفحہ پر نمبر بھی)

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۵۷ھ)

(نقیہ اور نمبر پچھلے صفحہ) میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ سعید بن یوسف کہتے ہیں اگر امام مالک اور لیث کسی موقع پر مجتمع ہوتے تو مالک کو ان کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۶) امام شافعی کا بیان ہے کہ لیث امام مالک سے زیادہ احادیث اور آثار کا اتباع کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲) حافظ ابن کثیر ان کو امام فی الفقہ والحديث والقرآن سے یاد کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۶۶) امام احمد فرماتے ہیں کہ لیث کثیر العلم اور صحیح الحدیث تھے۔

اور نیز فرمایا کہ اہل مصر میں ان سے زیادہ صحیح الحدیث اور کوئی نہ تھا (بغدادی جلد ۱۳ ص ۱۲)

۱۱ امام عبداللہ بن المبارک علامہ ذہبی ان کو امام العلما، الحافظ، شیخ الاسلام، فخر المجاہدین اور قدوة الزاہدین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۳) امام ابن جبان کا بیان ہے کہ ان میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہ ہوئے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۸۶) امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی

امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے۔ علامہ ابن سعد ان کو مقتدا رحمت اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۵) حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ حفظ فقہ، عربیت، زہد، شجاعت اور شعر کے مسلم امام تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۷۱)۔ علامہ خطیب فرماتے ہیں کہ وہ علم میں حتیٰ پرستوں کے گروہ میں تھے۔

اور حفظ و زہد کے ساتھ متصف تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۵۲) مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۲۰)

۱۲ امام اوزاعی: علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام اور حافظ تھے۔ اور وہ اس قابل تھے کہ ان کو وقت کا

خلیفہ بنایا جاتا۔ امام ابواسحاق فراری کا بیان ہے کہ اگر تمام امت کا خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار مجھے دیا جائے

تو میں امام اوزاعی کا انتخاب کروں گا۔ اہل شام اور اندلس میں ایک عرصہ تک ان کی تقلید ہوتی رہی۔

(تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۸) امام ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ امام اوزاعی سے فقہ اور دین کی بہت سی روایتیں منقول ہیں۔

اسی علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اہل شام کے مفتی اعظم تھے۔ امام ابن ہمدانی کا بیان ہے۔ حدیث کے مرکزی امام

صرف چار ہیں۔ امام اوزاعی (۶) امام مالک (۳) امام ثوری (۴) امام حماد بن زید۔ نیز ان کا بیان ہے کہ

اہل شام میں ان سے بڑا کوئی سنت کا عالم نہ تھا۔ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۳۹) حافظ ابن کثیر ان کو امام الجلیل

علامۃ الوقت اور فقیہ اہل شام لکھتے ہیں۔ امام عبید اللہ بن عبد البر فرماتے ہیں: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۳۷ھ) اور امام سفیان بن عیینہ رحم

(المتوفی ۱۹۸ھ) وغیرہ جہری نمازوں میں مطلقاً اور سرسری میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اختصاراً اپنے اس دعوے کی دلیل بھی عرض کر دیں۔ چنانچہ امام موفق الدین ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں نے امام اوزاعی سے بڑا عقلمند، پرہیزگار، عالم، فصیح، باوقار، حلیم اور خاموش طبع کوئی اور نہیں دیکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۱۵) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام الشام فی وقتہ اور احد ائمتہ الدنیاء تھے۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۸۰)

لے امام اسحاق بن راہویہ، علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حافظ کبیر عالم نیشاپور بلکہ جملہ اہل مشرق کے شیخ تھے۔ محدث ابو زرعہ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی حافظ دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابو حاتم کا بیان ہے کہ ان کے اتقان اور اصابت رائے پر آفرین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑا حافظ عطا فرمایا تھا۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹)

امام ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ یقیناً ان کے علم اور فقہ کا قرار کرتے۔ امام احمد ان کو امام من ائمتہ المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۵) ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانے میں فقہ، علم اور حفظ میں کینا تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۶) سعید بن ذویب کا بیان ہے کہ وہ عدیم النظر تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۵۰)

۳ امام سفیان بن عیینہؒ: امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۱۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت جلالت شان اور عظمت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہؒ سے بڑا کوئی عالم سنن نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۲۳) ابن حبانؒ انھیں شیخ المجاز اور احد الاعلام لکھتے ہیں: ابن ناصر الدین لکھتے ہیں: سفیان بن عیینہؒ امام عالی مقام اور حرم محترم کے محدث تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۵۴) ابن وہب لکھتے تھے۔ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآن مجید کا عالم نہیں دیکھا۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۵۶)

علامہ ذہبیؒ ان کو علامہ، الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، حجت، وسیع العلم اور بلند قدر تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا کہ فتویٰ دینے میں احتیاط کرنا ہو اور حدیث کی تفسیر میں بھی ان سے بہتر کوئی نہیں دیکھا۔ (تذکرہ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴۲)

وجملہ ذلك ان القراءة غير واجبة
على العموم فيما جهر به الامام وادفعا لستر
به نقص عليه احمد في رواية الجماعة و
بذلك قال الزهري والثوري وابن عيينة
وما لك وابو حنيفة واسحاق بن راهوية۔

(مغنی جلد ۱ ص ۷۸)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا
نہ جہری نمانوں میں واجب ہے، نہ سرری میں، ایک
بڑی جماعت نے امام احمد سے اس کی تصریح نقل کی ہے
اور یہی امام زہری، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ،
مالک، ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ کا مسلک اور
مذہب ہے۔

امام شمس الدین ابن قدامہ الحنبلیؒ (المتوفی ۶۸۲ھ) جن کا نام عبد الرحمن بن ابی عمر محمد بن

احمد بن محمد بن قدامہ ہے۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ الامام اور شیخ الاسلام تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۷۶۳)۔
فرماتے ہیں کہ

وواجب القراءة على المأموم هذا قول اكثر
اهل العلوم من كان لا يرى القراءة خلف
الامام علي وابن عباس وابن مسعود والوسعي
وزيد بن ثابت وعقبة بن عامر وجابر بن
عمر وحذيفة بن اليمان وبه يقول الشدي و
ابن عيينة واصحاب الرأي ومالك والزهري والاسود
وابراهيم وسعيد بن جبيل قال ابن سيرين
لا اعلم من السنة القراءة خلف الامام
اھ (شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۰ طبع مصر)

یہ حوالہ بھی اس بات کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ اکثر اہل علم کے نزدیک مقتدی پر قرأت
واجب نہیں ہے اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین واتباع تابعین میں مذکورین حضرات قرأت
خلف الامام کے قائل نہ تھے اور امام محمد بن سیرین قرأت خلف الامام کو خلاف سنت قرار دیتے
ہیں اور ہم پہلے مغنی کے حوالہ سے عرض کر چکے ہیں کہ امام احمد، امام زہری، امام سفیان بن عیینہ

امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ سب حضرات کے نزدیک مقتدی پر جہری اور سترمی کسی نماز میں قرآء واجب نہیں ہے۔ اور قاضی شوکانی نے تصریح کی ہے کہ امام اسحاق بن راہویہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ وغیرہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآء کے قائل نہ تھے۔
(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۳)

مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں:

وقال الزهري ومالك وابن المبارك
واحمد واسحاق يقرأ فيما ستر فيه
الامام ولا يقرأ فيما جهر به۔
امام زہری، امام مالک، ابن المبارک، احمد اور
اسحاق فرماتے ہیں کہ جن نمازوں میں امام آہستہ قرأت
کرتا ہو، ان میں مقتدی قرآء کر سکتا ہے اور جہری نمازوں
میں مقتدی کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔
(تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵)

امام ابن قدامہ کے حوالہ سے ابھی نقل کیا جا چکا ہے اور مبارک پوری صاحب کے حوالہ سے
عنقریب آئے گا کہ یہ آئمہ باوجودیکہ سترمی نمازوں میں قرآء خلف الامام کے قائل تھے۔ لیکن وجوب کے قائل نہ تھے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: (مئی ۱۹۶۱ء) بھی مقتدی کے لیے قرأت کو درست نہیں سمجھتے

تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ان كان ما موما ينصت الى قراءة
الامام ويفهمها۔
اگر نماز پڑھنے والا مقتدی ہے تو اس کو امام کی
قرأت کے لیے خاموش رہنا چاہیے اور اس کی قرآء
کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔
(فتیۃ الطالبین، طبع مصر، ص ۶۴)

اگر ظاہری الفاظ پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ موصوف مقتدی کا تمام نمازوں
میں یہ وظیفہ تیار ہے ہیں کہ وہ نہایت توجہ اور دلجمعی کے ساتھ امام کی قرآء کو سنے اور خود خاموش رہے
اور اگر اس امر پر بھی دھیان رکھا جائے کہ صاحب موصوف امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد تھے۔ تو اس عبارت
میں علامہ ذہبیؒ ان کو ایشیخ اور القدودہ لکھتے ہیں۔ (مذکرہ جلد ۴ ص ۱۷۲) علامہ سیوطیؒ ان کو ایشیخ لکھتے ہیں۔

(تاریخ الخلفاء ص ۳۰۵) اور حافظ ابن القیمؒ ان کو ایشیخ الامام العارف اور قدودہ العارفين لکھتے ہیں (اجماع البحیث
الاسلامیہ ص ۱۱) نواب صاحب ان کو امام الصوفیہ لکھتے ہیں۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنتہ ص ۳۷)
۱۵ اگلے صفحہ پر دیکھیے

سے جہری نمازوں میں ممانعت ثابت ہوگی۔ اور چونکہ امام احمد ستری نمازوں میں وجوب قرآن کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے صاحب منصف کا مسکب بھی یہی ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (المتوفی ۷۲۸ھ) مسکب خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ امام کے جہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ پڑھے اور مقتدی سنیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں جب وَلَا الضَّالِّینَ پڑھتا ہے تو مقتدی بھی آمین کہتے ہیں اور ستری نمازوں میں چونکہ مقتدی سنتے نہیں۔ اس لیے وہ آمین بھی نہیں کہتے۔ اگر امام بھی قرأت کر رہا ہو اور مقتدی بھی پڑھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو سننا جو اس کے لیے آمادہ نہیں اور ایسی قوم کو خطبہ اور وعظ کو جو توجہ نہیں کرتی۔ اور یہ ایسی کھلی حماقت ہے جس سے شریعت مطہرہ کا دامن بالکل پاک ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص خطبہ امام کے وقت باتیں کر رہا ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا ہو۔ ایسا ہی وہ شخص ہے جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو۔“

(فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، جلد ۲ ص ۱۴۴)

یعنی نہ گدھا کتابوں سے منتفع ہو سکتا ہے اور نہ مقتدی قرأت امام سے۔ غور کیجئے کہ کتنی نازک تشبیہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو گدھے سے مثال دی گئی ہے۔

(بڑا کچھ صفحہ ۱۰۰) نواب صاحب فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کہ در طبقات صوفیہ سرخیل طوائف اولیاء است انجام کار در مذہب احمد بن حنبل انتقال بر حمت النبی فرمود اور انیز در مجتہدین شمرده اند جم غفیر از حنفیہ قدیماً و حدیثاً مریدان خانوادہ و آخذ طریق اوست۔“ (ہدایۃ السائل ص ۲۸۷)

لے علامہ ذہبیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام، العلامة، الحافظ، الناقد، المفسر، المجتہد، عالی قدر، رئیس الزہاد، یگانہ دریاں، بحر العلوم، الذکی، الشجاع، السخی اور لکھتے ہیں کہ مخالف اور موافق سب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔“ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲۷۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں: کہ وہ شیخ الاسلام، امام الائمہ اور مجتہد مطلق تھے۔ علامہ

ابن حجرؒ کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ہم پایہ کوئی امام پیدا نہیں ہوا۔“ (تقصیر ص ۶۶)

مولانا محمد امجد علیؒ نے کہا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علماء اسلام میں بلحاظ جامعیت علوم و فنون خصوصاً ممتاز ہیں۔ (تفسیر واضح البیان ص ۳۸)

قارئین کرام! اگر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآءہ کرنے کی کچھ بھی اجازت ہوتی یا شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خزانہ معلومات میں ممانعت پر کوئی وزنی دلیل اور امت کی اکثریت کی معیت نہ ہوتی تو یقیناً وہ کبھی ایسی نازک تشبیہ نہ نقل کرتے اور یہی شیخ الاسلام ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں:

والد مرى استماع قرآءة الامام و
الانصات له مذکور فی القرآن و فی
السنة الصحیحة و هو لجماع الامم
فیمازاد علی الفاتحة و هو قول جمیع
السلف من الصحابة فی الفاتحة و غیرها
و هو احد قولی الشافعی و اختارہ طائفة
من حدّاق اصحابہ كالرازی و ابی
محمد بن عبد السلام فان القرآءة مع
جہل الامام منکر مخالف القرآن و
السنة و ما کان علیہ عامۃ الصحابة
(تنوع العبادات ص ۸)

کے خلاف بھی ہے۔ اور فی نفسہ بڑا بھی ہے اور اکثر حضرات صحابہ کرام کے تعامل کے بھی سراسر خلاف ہے۔ حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کا مسلک پوری تفصیل کے ساتھ پہلے نقل کیا جا چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شیخ الاسلام کی عبارت بھی بڑی صاف اور واضح ہے۔ مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے اور ہم شیخ الاسلام کے حوالہ سے پہلے نقل کر آئے ہیں کہ امام احمدؒ سے وہ نقل کرتے ہیں کہ جہری نمازوں میں مقتدی کا امام کے پیچھے قرآءہ کرنا شاذ بھی ہے اور خلاف اجماع بھی۔ اور لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک نہ جہری نمازوں میں مقتدی پر قرآت واجب ہے اور نہ ستری نمازوں میں۔

(تنوع العبادات ص ۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ستری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآءہ کرنے کے قائل تھے جیسا کہ

انہوں نے اپنے فتاویٰ (جلد ۲ ص ۱۲۹) میں اس کی تصریح کی ہے، لیکن چونکہ وہ حنبلی تھے اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ ان کا مسلک بھی امام احمد بن حنبلؒ کی طرح صرف استحباب کا ہونا چاہیے، نہ کہ وجوب کا۔ اور امام ابن قدامہ کی عبارت سترہ نمازوں میں عدم وجوب کی پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں سکنا ت امام میں پڑھنے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے (محصلاً) لیکن اپنے مقام پر تفصیل کے ساتھ آئے گا کہ شیخ الاسلام سکنا ت کے قائل نہیں ہیں اس لیے یہ توجیہ دو ہے۔ رہا شیخ الاسلام کا حنبلی ہونا؛ تو اس پر سینکڑوں حوالے نقل کیے جا سکتے ہیں مگر ہم صرف نواب صدیقی حسن خاں صاحب کے ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام کو شیخ الخباہلہ لکھتے ہیں۔

(الجنة في الاسوة الحسنة بالسنة ص ۳۸)

حافظ ابن القیمؒ: (المتوفی ۷۵۱ھ) مسئلہ خلف الامام کی تحقیق میں ارشاد فرماتے ہیں:

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقتدی پر سے سجدہ سہو ساقط کر دیا ہے۔

بایں طور کہ امام کے پیچھے مقتدی کے بھولنے سے مقتدی پر سہو لازم نہ ہوگا۔ یعنی جب امام کی نماز صحیح ہو گئی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ہوگی۔ اسی طرح آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی ساقط کر دیا ہے، کیونکہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

فقرأة الامام وسنقره قرأة لمن خلفه

یعنی امام کی قرأۃ مقتدیوں کی قرأۃ ہے اور امام

وسنقره له۔ (کتاب الروح لمن القیم ص ۱۶۶) کاسترہ مقتدیوں کا سترہ ہے (ذکر کواکب فنیۃ کی ضرورت ہے اور نہ سترہ کی)

لے امام سیوطی لکھتے ہیں کہ انہوں نے تصنیف کتب، مناظرہ اور مسائل کے استنباط میں بڑی جہرت کی اور محنت اٹھائی ہے۔ حتیٰ کہ علم حدیث، تفسیر اور فقہ میں وہ کبار ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ (بغیۃ الوعاة ص ۲۵)

ملا علی قاری حنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیمؒ کا برابر السنۃ والجماعت میں تھے۔ اور اس امت کے اولیاء میں ان دونوں کا شمار ہوتا ہے۔ (جمع الوسائل شرح شامل طبع مصر، جلد ۱ ص ۲۰)

نواب صدیقی حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ وہ المتکلم الحافظ اور الامام تھے۔ (دلیل الطالب ص ۹۳)

اور دوسرے مقام پر یوں بھول برساتے ہیں۔ علامہ کیہ مجتہد مطلق تمام علوم و فنون میں اپنے معاصرین پر تفوق رکھنے والے اور مذاہب کے جاننے میں تمام آفاق میں مشہور اور علوم کے سمندر تھے۔ (تقصار ص ۸۱)

یہ مضمون بھی نہایت روشن ہے اور غیر مبہم۔ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔
 امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ؛ (المتوفی ۱۱۶۷ھ) ان کو بھی بعض حضرات نے (جن میں
 مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوریؒ بھی شامل ہیں۔ دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۷ وغیرہ)
 مجوزین قرآنہ خلف الامام میں شامل کر لیا ہے۔ حالانکہ معاملہ یوں نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ
 صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان جہل الامام لم یقرأ الا عند الرسکات
 اگر امام جہر سے قرأت کرتا ہو تو مقتدی کو اس کے
 وان خافت فله الخیرة۔
 پیچھے قرآنہ نہیں کرنی چاہیے، ہاں مگر سکتا امام میں اور
 (حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص ۷ طبع مصر) ستری نمازوں میں مقتدی کو اختیار ہے چاہے پڑھے چاہے نہ پڑھے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا** ولالت نمی دارو مگر
 در جہر۔ (انفاس العارفين ص ۷) یہ بحث تو اپنے مقام پر آئے گی کہ سکتا امام کا کیا کہاں اور کتنا ثبوت
 ہے؟ اور یہ بھی کہ آیت مذکورہ ستری نمازوں کو بھی شامل ہے نہ کہ فقط جہری نمازوں کو۔ لیکن یہ بات
 بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ شاہ صاحب قرآنہ خلف الامام کے جہری نمازوں میں مطلقاً اور ستری نمازوں میں
 وجوب کے قائل نہ تھے۔

قاضی مقبول احمد صاحب نے مغالطات احسن الکلام ص ۱ اور الاعتصام ص ۱۳۱ اگست ۱۹۲۲ء،
 ص ۵۵ کالم ۳۲ میں خاصا وادیا کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف احسن الکلام نے حضرت شاہ
 ولی صاحب کی عبارت کے نقل کرنے میں خیانت کی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی غلط ترجمانی
 کی بخلاف اس کے مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری نے صحیح ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے
 ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ عبارت، مضمون کئی گئی ہے اور اگر پڑھے تو سورہ فاتحہ کو اس طرح پڑھے کہ
 امام کو خلیفان میں ڈال دے۔ اور میرے نزدیک یہ بہتر قول ہے۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۷ مغالطات احسن الکلام ص ۱۳۱)

لہٰذا اب صاحب لکھتے ہیں: کہ وہ المحدث اور المشہور تھے۔ (الکیرۃ ص ۷) نیز لکھتے ہیں کہ وہ الشیخ الاجل اور المحدث تھے۔
 (الجنۃ ص ۳۳) مولانا میرزا گوئی رح لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد اس وقت تک ہندوستان میں تو
 ایسا شخص نہیں ہوا۔ کہ اسے امام کہہ سکیں اور دوسرے ممالک کا حال خدا جانے۔

اور الاعتصام میں لکھتے ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری کی یہ عبارت بھی نقل کر دی جائے تاکہ قارئین اچھی طرح اندازہ فرما سکیں کہ شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کا مسلک بیان کرنے میں کس نے غلطی کی ہے۔ مولانا مبارک پوری نے یا مولانا سرفراز نے؟

مولانا عبدالرحمن مبارک پوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی باوجود حقیقی المنہ ہونے کے امام کے پیچھے الجھ پڑھنے کو اولی الاقوال بتایا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۰) آپ دونوں عبارتیں ملاحظہ فرمائیں اور بتائیں کہ کیا مولانا عبدالرحمن مبارک پوری نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی غلط ترجمانی کی ہے یا مولوی سرفراز نے؟

اجواب: قاضی صاحب غصہ جانے دیجئے احسن الکلام کے ٹھوس دلائل اور حکم پر ہیں نے آپ کے اور آپ کی جماعت کے دماغ کو ضرور موقوف کر دیا ہے اور دل کی بھر اس نکالنے کے اور اپنے متعصب حواریوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ مغالطات احسن الکلام ہماری طرف سے مکمل جو آپ نے یا الاعتصام میں سوچے سچے چند مضامین درج کر کے احسن الکلام کا جواب تصور کر لینا علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہاں اپنے جذباتی حواریوں کو جماعت میں مسلک رکھنے کے لیے قدرے سنبھالا ہو سکتا ہے۔ مگر تاہم کے ہر لوگ دلائل دیکھا کرتے ہیں۔ ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی مکمل عبارت نقل کرتے ہیں اور قارئین کرام سے اتماس کرتے ہیں کہ وہ انصاف سے فرمائیں کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت میں خیانت کس نے کی ہے؟ آیا مولانا مبارک پوری صاحب اور ان کے وکیل قاضی مقبول احمد صاحب نے یا سرفراز نے؟ حضرت شاہ صاحب کی عبارت مع ترجمہ یہ ہے:

اور اگر وہ مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننے

کے لیے توجہ کرنا واجب ہے۔ پس اگر امام جبر سے پڑھے تو

مقتدی قرآنہ نہ کرے مگر سکتے ہیں اور اگر امام آہستہ پڑھے

تو مقتدی کا اختیار ہے پس اگر مقتدی پڑھے تو فاتحہ پڑھے

اس طرح کہ امام کو خلل میں نہ ڈالے اور یہ میرے نزدیک سب سے

بہتر قول ہے اور یونہی اس باب کی حدیثیں باہم جمع کی جاسکتی

ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ شارع نے صراحت کی سزا

وان کان مأموماً وجب علیہ الانصات

والاستماع فان جہل الامام لم یقرأ الا

عند الاستمات وان خافت فله الخیر فان

قرأ فلیقرأ الفاتحة قرآناً (یشوش علی الامام)

وهذا ولی الاقوال عندی ویدعیج بین

احادیث الباب والشر فیہ ما نصت علیہ من

ان القرآنة مع الامام تشوش علیہ وتفوت

التدبر وتخالف تعظیم القرآن ولم يعزم
 عليهم ان يقرؤا سوا من العامة متى
 ارادوا ان يصححوا الحروف باجمعهم
 كانت لهم لجة مشوشة فسجل في
 النهي عن التشویش ولم يعزم عليهم ما يؤد
 الى المنهى وابقى خيرة لمن استطاع و
 ذلك غايته الرحمة بالامة انتهى -

(حجة الله البالغة جلد ۲ ص ۷ طبع مصر)

بتایا ہے کہ امام کے ساتھ قرآن کرنا اس کو خلل میں ڈالتا ہے
 اور تدبیر کو فوت کر دیتا ہے اور تعظیم قرآن کے مخالف ہے۔
 اور تاکید ان کو نہیں فرمایا کہ وہ ضرور آہستہ پڑھیں کیونکہ
 عام لوگ جب مل کر تصحیح حروف کا ارادہ کریں گے تو ان کی
 آواز بلند ہوگی جو باعث تشویش ہوگی سواں تشویش کی
 نہی میں تو تاکید کی ہے مگر آہستہ پڑھنے کی تاکید نہیں کی
 جو اس ممنوع چیز تک ان کو پہنچائے اور اختیار دیا گیا ہے کہ جو
 پڑھ سکتا ہے پڑھے اور یہ امت کے ساتھ انتہائی رحمت ہے۔

یہ تمام خط کشیدہ عبارت قاضی مقبول احمد صاحب شیر مادر سمجھ کر پنی گتے ہیں جس سے سرسری نمازوں
 میں قرآن کرنے اور نہ کرنے کے اختیار کا راز نکلتا ہے۔ اور فان قرأ فليقل الخ کا (جو ولد خافت
 فله الخيرة کی تفسیر ہے) معنی اور اگر پڑھے الخ کر کے اپنی لیاقت کا ثبوت دیا ہے اور غصہ سم
 پر آ رہا ہے کہ غلط ترجمانی ہم نے کی ہے۔ یہ ہے فریق ثانی کے علماء کا علم اور لیاقت سبحان اللہ تعالیٰ
 قاضی صاحب! حضرت شاہ صاحب حرف فلک کے ساتھ (جو تفسیر اور ترتیب کے لیے ہوتا ہے)
 یہ فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی نے سرسری نمازوں میں پڑھنے کی شق کو اختیار کیا تو اس طرح فاتحہ پڑھے کہ
 امام کے لیے باعث تشویش نہ ہو حرف واؤ کے ساتھ بیان نہیں کر رہے جس کا معنی اور اگر پڑھے
 الخ اور والسرفیہ سے آہستہ پڑھنے کا اور الخیرۃ کا راز بیان فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحب
 نے تمام سرسری اور جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کو اولی الاقوال نہیں فرمایا جیسا کہ مبارک پوری صاحب

دھوکہ کھایا ہے اور قاضی صاحب موصوف دھوکہ وہی پر کہ بستہ ہیں کسی عربی کے ماہر ثالث سے فیصلہ
 کوالین کہ اس کا مطلب سرفراز ٹھیک بیان کر رہا ہے؟ یا مبارک پوری صاحب جو فرماتے ہیں وہ درست ہے؟

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی

خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر!

قارئین کرام! آپ کو اس ماسبق بحث سے یہ اندازہ بہ خوبی ہو گیا ہو گا کہ حضرات صحابہ
 کرام اور تابعین و تبع تابعین اور ائمہ اربعہ اور ان کے علاوہ امت کی اکثریت کے نزدیک

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرآۃ کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کا سورۃ فاتحہ پڑھنا شاذ، مخالف قرآن و سنت اور مخالف اجماع سمجھتے تھے اور سنی نمازوں میں بھی اُمت کی اکثریت وجوب قرآۃ کی قابل نہ تھی۔ اس بحث کے پیش نظر فریق ثانی کے یہ باطل اور بے بنیاد و عادی کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والے بے نماز مفسدین صلوات اور تارکِ سنت ہیں اور ان کے ساتھ مباہلہ تک کتنا بھی صحیح ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ کہاں تک صحیح ہیں؟ اور ان کے ان غلو آمیز اور شرانگیز گستاخانہ کلمات سے کون امام بچ سکتا ہے؟ ہم نے محض نمونہ کے طور پر بعض حضرات ائمہ کی عبارتیں مقدمہ میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ باب اول میں آیت کی تفسیر میں حضرات تابعین و تابعات کے جو آثار بیان ہوں گے۔ نیز باب سوم میں آثار حضرات صحابہ و تابعین کے تحت جو آثار ذکر کیے جائیں گے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں اور اگر آپ کی نزاکت طبع و قلبت فرصت کا خیال دل کی گہرائیوں میں دب دب کرنے اُبھرتا تو ہم ان کو بھی مقدمہ میں جگہ دیتے۔ کیونکہ یہ

رہ رواں راہ کی راہ نیست
عشق ہم راہ ہست ہم خود منزل است

اب ہم مقدمہ میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے صرف حضرت امام احمد بن حنبل کی ایک جامع و مانع عبارت نقل کرتے ہیں۔ بغور پڑھیے۔ امام ابن قدامہ فرماتے ہیں:

قال احمد ما سمعنا احداً من اهل
الاسلام يقول ان الامام اذا جهر
بالقرآۃ لا يجزئى صلوة من صلّى
خلفه اذا الحريقاً وقال هذا النبي
صلّى الله عليه وسلم واصحابه والتابعون
وهذا ما لث في اهل الحجاز وهذا الثوري

امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ ہم نے اہل اسلام میں کسی سے نہیں سنا۔ جو یہ کہتا ہو کہ جب امام جہر سے قرآۃ کرتا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے قرآۃ نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے اور فرمایا یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ آپ کے صحابہ اور تابعین ہیں اور یہ امام مالک ہیں اہل حبشہ میں اور یہ امام ثوری ہیں

لہ اور نواب صدیق حسن خان صاحب دارقطنی کے حوالہ سے ایک روایت رجالہ کلام ثقات کے الفاظ سے نقل کر کے آگے لکھتے ہیں کہ حدیث دلیل اسنت بر عدم قرآۃ چیزیں در پس امام در حالت ہجر امام و لہذا احمد گفتہ ما سمعنا احداً يقول ان الامام اذا جهر بالقرآۃ لا يجزئى صلوة من لم يقراء۔ اھ
(هدایۃ السائل ص ۱۹۳)

فی اهل العراق و هذا الزاعی فی اهل الشام
 و هذا الیث فی اهل مصر ما قالوا الرجل
 صلی و قرأ اماماً ولم یقرأ هو صلواته
 باطله۔ (معنی ابن قدامح اثنی بعینہا
 یہ عبارت شرح متفق جلد ۲ ص ۱۳ میں بھی ہے)

اہل عراق میں اور یہ امام اوزاعی ہیں اہل شام میں اور یہ
 امام لیث بن سعد ہیں اہل مصر میں ان میں سے کسی نے
 یہ نہیں کہا کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے اور اس کا امام
 قرآن کرے اور مقتدی خود قرآن نہ کرے تو اس کی نماز
 باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔

درماندگی:

مصنف خیر الکلام نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی اس واضح اور صریح عبارت کا جو جو
 دیا ہے اس کو پڑھ کر ان کی علمی حالت پر بے ساختہ ترس آتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ
 (۱) اس کا مطلب بھی یہی لینا چاہیے کہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنا کسی کے نزدیک ضروری نہیں
 بلکہ قرآن کا فرض ہے (جن کے ہاں قرآن فرض ہے) سکتا ہے میں ادا ہو سکتا ہے۔ (الخ) (خیر الکلام ص ۳۲)
 (۲) یا امام احمد بن حنبلؒ کی عبارت کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس لیے کسی کی تحقیق
 میں فاتحہ فرض نہ ہو تو وہ جہری نمازوں میں نہ پڑھے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ امام
 صاحب نے جہر کی قید کیوں لگائی ہے اس اختلافی مسئلہ میں تو جہر اور ستر برابر ہے اس کی وجہ یہ ہے
 کہ ستری نمازوں میں منع کی چونکہ کوئی دلیل نہیں اس واسطے بعض علماء نے اس کو اختلافی مسئلہ
 قرار نہیں دیا بلکہ اتفاقی سمجھ کر یہ فتویٰ لگا یا کہ ستری نمازوں میں جو شخص نہ پڑھے اس کی نماز باطل
 ہے۔ الخ (ص ۳۲ خیر الکلام)

(۳) بعض حنفیہ (احسن الکلام ص ۲۴) نے علامہ کی عبارت سے قرآن امامہ امام پڑھ رہا ہو گا
 جملہ حذف کر دیا ہے پھر امام احمد بن حنبلؒ سے یہاں اوزاعی اور لیث کا نام بھی نقل کر دیا ہے حالانکہ
 امام ابن عبدالبر نے ان دونوں سے فاتحہ کی فرضیت نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ
 کو ان کے اس قول کا علم نہیں۔ الخ (ص ۳۳ و ۳۴)

الجواب: یہ ہے فریق ثانی کے رئیس الحدیث قدوة السالکین اور استاذ الاساتذہ کا

جواب جس میں ایک رتی جان بھی نہیں ہے۔ ترتیب وار سنیں:

۱۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سکتا کا مسئلہ نہیں بیان فرما رہے بلکہ تصریح کرتے ہیں جہری

نمازوں میں امام کے پیچھے مطلق قرآۃ نہ کرنے والے کی نماز تمام اہل اسلام کے نزدیک جائز ہے اور اس کا ایک شخص بھی منکر اور مخالف نہیں ہے۔ اگر امام احمد بن حنبل کے علم میں یہ ہوتا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (یا کوئی اور) اس کا مخالف ہے تو باوجود قرب زمانے کے بلکہ امام شافعی کا شاگرد ہونے کے (دیکھیے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۷۷) کبھی یہ دعویٰ نہ کرتے کہ اہل اسلام میں اس کا کوئی قائل نہیں ہے چودھویں صدی کے مجتہدین کا تو انہیں کوئی علم نہ تھا تا کہ ان کے لیے کوئی گنجائش چھوڑ دیتے حضرت امام احمد بن حنبل کا یہ ارشاد امام شافعی کے مسلک کی وضاحت کے لیے ایک مستقل دلیل ہے اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے قرأت ترک کر نیوالے کی نماز بالکل صحیح ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبلؒ تو جہری نمازوں میں تمام اہل اسلام کا اتفاق نقل فرماتے ہیں۔ پھر ان کی عبارت کا مطلب چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے انہی کس طرح صحیح ہوا۔ رہا سہری نمازوں کے بارے میں مصنف خیر الکلام کا یہ فرمانا کہ چونکہ دلیل نہیں... انہی (محصلاً) ممکن ہے اس چونکہ سے ان کے حواری تو شاید مطمئن ہو جائیں مگر علیٰ دنیا کبھی اس چونکہ سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سہری نمازوں میں بھی عدم قرأت کی دلیل ایک نہیں کئی ٹھوس دلائل ہیں اور صرف ایک برہان نہیں بلکہ متعدد براہین موجود ہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی خاصا اختلافی ہے اور جو حضرات پڑھنے کے قائل ہیں۔ مثلاً: امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ تو وہ بھی سہری نمازوں میں وجوب کے قائل نہیں ہیں سوا محض گئے چنے چند حضرات کے کوئی امام سہری نمازوں میں قرآۃ نہ کرنے والے کی نماز کے بطلان کا ہرگز قائل نہیں اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔

۳۔ قدوة السالکین کا تعصب ملاحظہ ہو کہ یہ حسن ظنی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہی نہیں ہوتی کہ یہ لفظ چھوٹ گیا ہے بلکہ فرماتے ہیں حذف کر دیا ہے اور خیر الکلام ص ۵۵۹ مناقشہ ۹ میں لکھا ہے کہ اس عبارت میں سے جملہ وقتاً احاصہ اور اس کا امام پڑھتا ہو چھوڑ دیا ہے تاکہ جہری و سہری سب نمازوں کو یہ فتویٰ شامل ہو۔ انتہی بلفظہ۔ فریق ثانی کے رئیس المحدثین کو معلوم ہونا چاہیے کہ احسن الکلام جلد ۲ ص ۲۴ پر جہاں یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس کے ترجمہ میں یہ لفظ موجود ہے کہ جب امام جہر سے قرآۃ کرتا ہو انہی اس کی موجودگی میں یہ احتمال کہاں سے اور کیونکہ پیدا ہوا کہ سہری نمازیں بھی اس میں شامل ہوں جب کہ راقم کے نزدیک سہری کو یہ شامل ہی نہیں تو سب کو شامل

ہونے کا کیا معنی؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چار سو صفحات کی کتاب میں کسی ایک آدھ جملہ کا چھوٹ جانا یا کتابت میں غلطی کا واقع ہونا غیر اغلب نہیں ہوتا۔ آپ کے فرہین مبارک سے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِنَّہٗ کیوں نکل گیا؟ باقی امام عبدالبر سے بدرجہا زیادہ امام احمد بن حنبلہ امام اوزاعی اور امام لیث کے مسلک کو جانتے ہیں۔ مجتہد مطلق بھی ہیں اور قرب زمانہ بھی ہے اور یہ حوالہ علامہ ابن قدامہ کے علاوہ اور دیگر ثقہ اور شہت حضرات محدثین عظام نے بھی نقل فرمایا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبلہ کا علم بالکل صحیح ہے اور مؤلف خیر الکلام کی بات پر گاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

اقرار کے ساتھ انکار کی دم:

مصنف خیر الکلام نے جب نجفی یہ ٹھوس کر لیا کہ حضرت امام احمد بن حنبلہ کی اس ٹھوس اور واضح عبارت کے جواب میں میری کہی ہوئی سینہ زادیاتیں ناکام ہیں تو آخر میں اقرار بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ پس زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام احمد بن حنبلہ کے قول کا مطلب وہی ہے جو ناقل (سرفراز) نے سمجھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ امام احمد بن حنبلہ نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تاویل کی ہے اور صحابہ کرام کے اقوال ان کو بسند صحیح نہیں پہنچے۔ مگر امام بخاری اور دیگر محدثین کو وہ اقوال بسند صحیح پہنچ گئے اس لیے انہوں نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول لا صلوة لمن لم یقرأ بقاۃ الکتاب جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔ اس کی تاویل نہیں کی جیسا کہ امام احمد بن حنبلہ نے تاویل کی ہے۔ الی ان قال بہر صورت اس اختلافی مسئلہ میں ایک امام کی رائے ہے جو دوسرے ائمہ حدیث خصوصاً امام بخاری (جو بنقل حافظ ابن حجر امام احمد سے فقہ اور حدیث میں بیگن سے زیادہ ہیں۔ مقدمہ فتح الباری ص ۵۷۲) کی رائے کے خلاف ہے پس کسی صورت میں یہ قابل التفات نہیں۔ (خیر الکلام ص ۳۳۳ و ۳۵۳)

الجواب: حضرت امام احمد بن حنبلہ اس مقام پر اہل اسلام کا متفقہ فیصلہ اور ائمہ مذکورین کا اجماع نقل کر رہے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کی نماز فاسد اور باطل ہونے کا کوئی قائل نہیں۔ حدیث کی تاویل اور عدم تاویل کا ذکر وہ یہاں نہیں فرما رہے وہ تو اہل اسلام کا متفقہ فیصلہ نقل فرما رہے ہیں اور حضرات صحابہ کرام کے اقوال اگر امام احمد بن حنبلہ کو بسند صحیح نہیں پہنچے تو

اور کس کو پہنچے ہیں؟ اور جو اقوال حضرت امام بخاریؒ کو بقول مصنف خیر الکلام بسند صحیح پہنچے ہیں ان کا حال بھی اپنے مقام پر احسن الکلام جلد دوم میں واضح کر دیا گیا ہے جن کو مؤلف مذکور نے تشکوک کا سہارا دے کر تھامنے کی بے جا سعی کی ہے مگر سبٹھلے پھر بھی نہیں۔ رہا یہ کہ امام بخاریؒ امام احمد بن حنبلؒ سے بیس گنا فقہ و حدیث میں زیادہ ہیں۔ صرف عقیدت کی نقل سے کچھ نہیں بنتا۔ اس کا قائل اور اس کا درجہ معلوم ہونا چاہیے اور اس کی علمی شہرت اور اکثر امت کا اعتماد باحوالہ درکار ہے۔ محض نقل کی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر وہ کوئی معتبر امام ہے تو یہ صرف ان کی خلوفی العقیدت کا اظہار ہے۔ حضرت امام بخاریؒ کا جو مقام حدیث و فقہ میں ہے اس کا کون منکر ہے یا ہو سکتا ہے؟ لیکن حدیث و فقہ میں جو مقام حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا ہے وہ حضرت امام بخاریؒ کا نہیں ہے اس لیے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ بالاتفاق ائمہ مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں اور حضرت امام بخاریؒ کے متعلق مختلف آراء ہیں کوئی ان کو مجتہد مطلق کہتا ہے اور کوئی مجتہد فی المذہب کہتا ہے۔ اور امام نسبیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان کو شافعی بتاتے ہیں ہم نے بقدر ضرورت طائفہ منصورہ میں اس پر باحوالہ بحث کی ہے اور امام بخاریؒ بقول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فقہی مسائل میں امام شافعیؒ اور امام ابو عبیدہؒ کے خوشنشین اور ان کی کتب سے استمداد کرتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے لیے دونوں دل کا نور اور آنکھوں کا سرور ہیں مگر فرق مراتب ضرور ہے لہذا حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے اس واضح اور روشن حوالہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور نہ علمی دنیا میں اس کو باور کرنے کے لیے کوئی تیار ہے اور یہ صرف امام حضرت احمد بن حنبلؒ ہی کی رائے نہیں بلکہ جمہور حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؓ تابعینؓ اور ائمہ دینؓ کی رائے ہے اور اتنی بڑی ذہنی رائے ہے جس نے فریق ثانی کے اس غلو اور بے جا تعصب کا بھیجا نکال دیا ہے کہ قرآنہ خلف الامام نہ کرنے والوں کی ناز بے کار، باطل اور کالعدم ہے۔ اس لیے امام احمد بن حنبلؒ کی اس مسئلہ میں لاعلمی کا دعویٰ (جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے) بالکل بے بنیاد اور سراسر مردود ہے۔ عجب نہیں کہ مؤلف مذکور یہ کہہ دیں: مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ عظامؓ اور بعض دیگر ائمہ (جن سے آپ مابقی حواشی میں اچھی طرح روشناس ہو چکے ہیں) کا یہ فیصلہ دیکھ لیجئے۔

اور فریق ثانی کے مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہونے کے خالص متعصبانہ فتوے اور مباہلہ کے اعلان اور فراخ دلی سے انعامی چیلنج ملاحظہ کر لیجیے اور پھر فرمائیے کہ تکفیر کس کی ہوگی؟ اور بے نماز کون ہوگا؟ مفسد صلوٰۃ کون ہوگا؟ اور مباہلہ کس سے ہوگا؟ تارک سنت کون ہوگا اور انعامی شاہی چیلنج کا مستحق کون ہوگا؟ افسوس ہے کہ فریق ثانی نے تعصب اور کم فہمی کی وجہ سے ایسا ایٹیم بم ایجاد کر لیا کہ اس کی زد سے نہ بڑے بڑے ائمہ بچ سکتے ہیں اور نہ حضرات تابعینؓ بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حتیٰ کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی ان کے لایعنی فتووں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ) دیکھتے اس ناروا فتوے کی زد سے کون بچ سکتا ہے؟ ۵ متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی یہ کس کافر ادا کا غمزہ خوں ریز ہے ساقی!

باوجود اس کے کہ حق جمہور کے ساتھ ہے اور سو فیصدی ان کی رائے درست اور صحیح ہے۔ مگر وہ فریق ثانی کی طرح اس مسئلہ میں (بلکہ دیگر تمام اختلافی مسائل میں) نہ تو مخیرین قرآۃ خلف الامام کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ قسم اٹھا کر ان کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کہتے ہیں اور نہ ان کو مباہلہ کا چیلنج دیتے ہیں۔ بلکہ جن اکابر (مثلاً امام بخاریؒ و امام بیہقیؒ وغیرہ) نے اپنی انتہائی وسعت اور کوشش صرف کر کے جمہور کی رائے کے ساتھ اختلاف رائے کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کو معذور تصور کرتے ہیں بلکہ ماجور بھی سمجھتے ہیں اور ائمہ دین اور دیگر حضرات سلف صالحینؓ کی نسبت بدظنی اور سب اور اعتقاد کو کسی طرح بھی روا نہیں سمجھتے؛ ۵

وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحان تک

مگر وہ ہیں کہ اس سبھی میں ہم سے ہدگماں اب تک

اگر یہ نظر انصاف دیکھا جائے تو فریق ثانی کے بے بنیاد اور پادر ہوا دعویٰ اور فتووں کا جواب تو اس مقدمہ ہی سے پورا ہو جاتا ہے اور مزید کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر چونکہ ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ مسئلہ زیر بحث کو پوری طرح بے نقاب کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کے بعد اصل بحث اور اس کے دلائل عرض کرتے ہیں۔ لیکن باب اول شروع کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم امام ترمذیؒ (المتوفی ۲۷۹ھ اور علامہ بدر الدین عینیؒ

(المتوفی ۸۵۵) کی بعض عبارتوں کو یہیں حل کرتے جاتیں، جن سے بہت ممکن ہے کہ بعض اہل علم کو مغالطہ لگ جائے اور طالب علموں کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا تو بہت اغلب ہے، رہے وہ حضرات جو غلط فہمی اور مغالطہ کو متابع عزیز سمجھ کر سیلنہ سے لگائے پھرتے ہیں۔ ان کے لیے ہمارے پاس کوئی علاج اور دوا موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی صرف اسی کو ہدایت دیتا ہے جو دل میں اس کی تڑپ اور جذبہ پیدا کرے۔ اور عملاً اس کی طرف پیش قدمی کرے ورنہ اس دربار عالی سے بھی محرومی کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا:۔

یہ بزم ہے یاں کو تاہ دستی میں ہے محرومی

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کلبے

امام ترمذی تحریر فرماتے ہیں: اکثر اہل علم جن میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ شامل ہیں اور خاص طور پر امام مالکؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا یہ مسلک ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرآنہ کرنی چاہیے (ترمذی جلد ۱ ص ۱۲۱) ہم پہلے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام عبداللہ بن مبارکؒ امام اسحاقؒ (پچھلے صفحے کے حاشیے) نے امام ترمذیؒ، علامہ ذہبیؒ ان کو الام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں جو مشہور کتاب الجامع ہے۔ وہ انہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ کتاب العلل بھی انھوں نے لکھی ہے۔ حافظہ میں وہ ضرب المثل تھے۔ (تذکرہ ۲۵ ص ۱۲) مگر افسوس یہ امام عالی مقام بھی جرح سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ترمذی صاحب الجامع مجہول ہیں (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۱۱۶) اگر امام ترمذیؒ مجہول ہیں تو دنیا میں معروف کون ہوگا؟

۱۱ علامہ بدر الدین عینیؒ، مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ وہ امام، عالم، علامہ عالم بالعربیۃ والتصرف اور حافظ لغت تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اگر ان میں مذہبی تعصب نہ ہوتا تو کیا خوب ہوتا (فرآند البیت ص ۲) بعض غیر مقلد حضرات علامہ عینیؒ کے تعصب پر مولانا لکھنویؒ کی یہ عبارت لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ تو فراموش کہ ذہبی تعصب کون امام پچ سکتے۔ علامہ ذہبیؒ جن کے بعد آج تک کوئی ناقد رجال پیدا نہیں ہوا۔ اور حافظ الدین ابن حجرؒ بھی ان کے ناقد روایات ہونے پر نہ صرف اعتقاد کرتے ہیں بلکہ ان کے خوشہ چین بھی ہیں۔ (شرح نختہ الفکر ص ۱۱) معہذا شیخ الاسلام تاج الدین سبکیؒ لکھتے ہیں کہ ذہبیؒ بڑے متعصب ہیں وہ ہمارے استاد ہیں اور ہم پر ان کا حق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا حق ان پر مقدم ہے ہم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی حنفی یا شافعی کے حق میں ذہبی

بن راہبویہ کا مسلک پوری وضاحت سے نقل کرتے ہیں کہ جہری نمازوں میں ان میں کوئی بھی قرآنہ خلف
الامام کا قائل نہ تھا اور سترے نمازوں میں امام مالکؒ، امام احمدؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ وغیرہ وجوب
قرآنہ کے قائل نہ تھے۔ اور خود امام ترمذیؒ نے امام عبداللہ بن مبارکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے
ہیں: بعض لوگوں نے تشدد سے کام لیا ہے لیکن میرے نزدیک جس شخص نے امام کے پیچھے قرآنہ نہ
کی اس کی نماز صحیح ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۲)

اندریں حالات اگر کسی کو امام ترمذیؒ کی اس عبارت سے کوئی شک اور شبہ پیدا ہو تو ہرگز
صحیح نہیں۔ المعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔ لیجیے ہم آپ کو ترمذیؒ کی اسی عبارت کی شرح مولانا
مبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے سناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

فیہ اجمال ومقصودہ ان ہوا لواء
الائمة کلہم یرون القرآۃ خلف الامام
اما فی جمیع الصلوٰت و فی الصلوٰۃ السنیۃ
فقط و اما علی سبیل الوجوب او علی سبیل
الاستحباب والاستحسان۔
کہ امام ترمذیؒ کا یہ قول مجمل ہے۔ ان کی مراد
یہ ہے کہ یہ ائمہ مذکورین امام کے پیچھے قرآنہ کے قائل تھے۔
بعض سب نمازوں میں اور بعض صرف سترے نمازوں
میں۔ بعض وجوب کے قائل تھے اور بعض صرف
استحباب اور استحسان کے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۳)

اور تصریح کرتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآنہ کے وجوب کے قائل نہ
تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۷) اور لکھتے ہیں کہ امام عبداللہ بن مبارکؒ بھی امام کے پیچھے وجوب قرآنہ کے قائل نہ
تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۷)

ربا یہ کہ تمام نمازوں میں قرآنہ خلف الامام کا قائل کون تھا؟ اور پھر خاص طور پر وجوب کا جان تک
راقم الحروف کے حدود مطالعہ کا تعلق ہے۔ ان ائمہ میں سے جن کا تذکرہ امام ترمذیؒ نے کیا ہے۔
ایک بھی ایسا نہیں جو تمام نمازوں میں قرآنہ خلف الامام کا قائل ہو اور خاص طور پر وجوب۔ اگر
مولانا مبارک پوری صاحبؒ کو امام شافعیؒ کے مسلک میں غلط فہمی ہوتی ہو۔ تو ہم پوری وضاحت اور
(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کا قول سموح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ شافعیوں اور حنفیوں کے حق میں اکثر تعصب
سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۹۱) والحصۃ ببید اللہ تعالیٰ وحدہ۔

اور صراحت کے ساتھ امام شافعیؒ کا مسلک عرض کر چکے ہیں۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں کہ

واستدل بهذا الحديث، عبد الله
یعنی حضرت عبادۃؒ کی (لا صلوة لمن لم يقرأ
بما القرآن) کی روایت سے امام ابن مبارکؒ، امام
اوزاعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ، امام ابو ثورؒ
و احمد و اسحق و ابو ثور و داؤد علی و جوی
قرآۃ الفاتحہ خلف الامام فی جمیع الصلوات
انتہی بلفظہ۔ (عمدة القاری ج ۳ ص ۶۳)

اس عبارت سے غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیے:

اولاً اس لیے کہ ہم ان حضرات ائمہ کرامؒ کی عبارتیں پوری تشریح کے ساتھ اور خود فریق
ثانی کے محدث جلیل اور وکیل اعظم مولانا مبارک پوری صاحبؒ کے اقرار کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ یہ ائمہ
تمام نمازوں میں وجوب قرآۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ امام ابو ثورؒ کے علاوہ باقی ائمہ کرامؒ
کی عبارتیں پہلے نقل کی جا چکی ہیں اور ان کا مسئلہ زیر بحث کے متعلق محقق مسلک بھی عرض کیا جا
چکا ہے۔ امام ابو ثورؒ کا صحیح مسلک علی التعمین معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی
پیش کردہ سیاق عبارتوں سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ بھری نمازوں میں وہ بھی امام کے پیچھے قرآۃ
کو شاذ اور خلاف اجماع ہی سمجھتے ہو گے اور اسی صفحہ کے حاشیہ سے انکا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے
کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے اور تحقیق وہی تھی جو حضرت امام شافعیؒ کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔
وثانیاً علامہ عینیؒ کی اسی عبارت پر گرفت کرتے ہوئے مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

لہ امام ابو ثورؒ (المتوفی ۲۴۰ھ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: کہ وہ الامام، المجتہد اور المحافظ تھے۔ امام نسائی ان کو ثقہ
اور مامون اور احد الفقہاء کہتے ہیں۔ امام ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ فقہ، علم، ورع، فضیلت، تصنیف کتب
اور تشریح سنت میں دنیا کے اماموں میں ایک تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۸۶) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد
الثقاف، المؤمنین ومن الائمة الاعلام فی الدین تھے۔ (بغدادی جلد ۴ ص ۶۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ پہلے
اپنی رائے اور فقہ پر کار بند تھے۔ جب حضرت امام شافعیؒ رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لے گئے تو امام
موصوف نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا اور امام شافعیؒ کے پاس آتے جاتے رہے۔ (تہذیب جلد ۱ ص ۱۱۱)
اس سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کا مسلک اختیار کیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

میں کتنا ہوں کہ یہ امام بدرالدین عینی کا وہم ہے کیونکہ
عبد اللہ بن مبارک امام کے پیچھے وجوب قرآن کے قائلین میں
نہ تھے جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے اور اسی طرح حضرت
امام مالکؒ اور امام احمد بھی تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ
کے امام کے پیچھے پڑھنے کے وجوب کے قائل نہ
تھے۔

قلت هذا وهم من العيني فان
عبد الله بن المبارك لم يكن من القائلين
بوجوب القراءة خلف الامام كما عرفت
وكذلك الامام مالك والامام احمد
لم يكونوا قائلين بوجوب قراءة الفاتحة
خلف الامام في جميع الصلوات۔ انتهى
(تحفة الاحوذ ص ۲۵)

مولانا مبارکپوری صاحب کا یہ ارشاد فرمانا بالکل صحیح ہے۔ یہ یقیناً علامہ عینی کا وہم اور ان کے سر
قلم کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دلائل اور براہین کے رو سے ان آئمہ کا جن کا ذکر علامہ موصوف نے کیا ہے۔ مسلک
با دلائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہو گا اور اجالی طور پر بقدر کفایت مقدمہ
میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہمیں اچھی طرح اس امر کا احساس ہے کہ سلسلہ کلام دراز سے دراز تہہ ہوتا جا رہا ہے اور شاید کہہ سکتے ہیں
کی طوالت سے ہی گھبرا جائیں۔ حالانکہ ہم نے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کو انہی اقتباسات
پر ختم کرتے ہیں اور فریق ثانی کی خدمت میں نہایت اخلاص سے عرض کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا غیر مختلط لفظ
زبان سے نہ نکالے۔ جس کی زد میں اکثر امت اور جمہور سلف صالحین آجائیں کیونکہ ہم لوگوں تک حدیث
کے پہنچانے کا واحد ذریعہ ہی یہی لوگ ہیں اور ان پر برسنے والا گویا بالواسطہ حدیث پر برس رہا ہے۔
اور ان کی گتائی کرنے والا کبھی حدیث رسول کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا:۔
تا دامن آ کے چاک گریباں نے دم لیا
ہے دامن اور جیب میں رشتہ قریب کا

نوٹ: قرآن کریم کی ضروری تشریح حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کے فوائد سے ماخوذ
ہے اور طبقات ابن سعد، شذرات الذہب، تہذیب اللسان اور ابن خلکان وغیرہ میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ ان
کتابوں کے حوالے تابعین اور غلامان اسلام سے ماخوذ ہیں۔ باقی جملہ کتابوں سے میں نے براہ راست استفادہ کیا ہے۔
اللہ ماشاء اللہ تعالیٰ اور حوالہ جات میں صحت کی ہر ممکن کوشش مد نظر رکھی گئی ہے۔
ابوالزاہد

باب اول

اصل دین آمد کلام اللہ معظم و اشتمن
پس حدیث مصطفیٰ بر جاں سلم داشتن

اہل اسلام سے یہ بات ہرگز مخفی نہیں کہ جو مرتبہ، درجہ اور قطعیت اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی کتاب کو حاصل ہے۔ وہ یقیناً دنیا میں کسی اور کلام اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل اور براہین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاں سب سے پہلا نمبر صرف قرآن کریم کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس میں کسی انسان کی وماغی محنت اور کاوش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بخلاف احادیث کے کیونکہ پہلے ہر حدیث کو نقل بالتواتر کا درجہ حاصل نہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم کو حاصل ہے اور پھر احادیث میں نقل بالمعنی کا بھی کافی دخل ہے جیسا کہ فن حدیث سے تعلق رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ لہذا یہ امر یقینی ہے کہ جس گروہ کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ثبوت ہوگا۔ اس کا مسلک حق اور صحیح ہوگا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ امام کے چھپے قرآن لے بلکہ امام سیوطی وغیرہ نے تو یہاں تک دعوائے کیا ہے فان اکثر الاحادیث مروی بالمعنی۔ (الاتقارح)

یعنی اکثر احادیث جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بقید الفاظ مروی نہیں ہیں۔ بلکہ راویوں نے احادیث کے معانی کو اپنے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

ترک کرنے پر مجبور کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب سے قطعی اور محکم دلیل موجود ہے۔

قرآن کریم کے آداب :

اس سے قبل کہ ہم قرآن کریم کی وہ آیت اور اس کی تفسیر اور تشریح نقل کریں جس سے ہم استدلال کرتے ہیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر غور اور فکر کر لیں کہ جس وقت اور جس مقام پر قرآن کریم کی قرأت اور تعلیم و تدریس اور تلاوت ہوتی ہو وہاں سامعین کو کیا کرنا چاہیے؟ اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا ادب سکھایا ہے؟ اگر اسی ایک پہلو پر مہم سہری غور کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ کافی حد تک بحث اسی سے حل اور طے ہو جائے۔ ہم قرآن کریم کی چند آیات اور احادیث اور علماء کرام کی بعض عبارتیں اور نقول عرض کرتے ہیں جن سے سامعین کے آداب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اور قرآن کریم کے آداب کا قابلِ تعظیم پہلو بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

(۱) شروع شروع میں جس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم لاتے۔ ان کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلد اسے یاد کر لیں اور سیکھ لیں۔ مبادا حضرت جبرائیل چلے جائیں اور وحی پوری طرح محفوظ نہ ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں پوری طرح سنے اور سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آپ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنیں۔ جس وقت حضرت جبرائیل پڑھیں۔ آپ اس وقت خاموش ہو کر توجہ کریں اور سنیں اور زبان مبارک کو حرکت نہ دیں۔ قرآن کریم کا حرف بحرف جمع کرنا اور آپ کی ذات سے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ آیات ملاحظہ کریں :

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَتَّعَلَ بِهِ ۝
 إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأَهُ
 فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝

نہ حرکت دیجیے قرآن کے پڑھنے میں اپنی زبان کو تاکہ
 آپ جلدی اس کو سیکھ لیں۔ اس کا جمع کرنا اور اس کا
 (اچک زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے اور جب ہم (زبان
 فرشتہ) پڑھیں تو آپ ان کے پڑھنے کی اتباع کریں۔ پھر

(پ ۲۹) - (قیمت ۱۰)

ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتلانا

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور تلاوت کے وقت سامعین کو خاموش رہ کر پوری

دوبھی اور توجہ کے ساتھ قاری اور تالی کی قرآۃ سننی چاہیے۔ کیونکہ قرآن کریم کے آداب اور اتباع اور اس کی تعظیم و تکریم کا یہی واضح پہلو ہے۔

مصنف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق کہ چپ نہ رہ سکوں یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کا قرآن کریم کی تعظیم و احترام سے کوئی تعلق نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ آپ کو اس سے پہلے قرآنی آداب کا علم نہ تھا۔ اور یہ بات سراسر غلط ہے اور نیز لازم آئے گا کہ استاد جب تک سبق ختم نہ کرے شاگرد کا پڑھنا ہے ادبی ہو تو پھر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہی چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کا مطلب جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یہ ہے کہ قرآن کے اتانے سے آپ کو سخت تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔

(بخاری جلد ۱ ص ۳۶۳، ۳۶۴) (محصلہ خیر الکلام ص ۳۶۳، ۳۶۴)

الجواب:

یہ جو کچھ کہا ہے محض دفع الوقتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ

ہذا تعلیم من اللہ عز وجل لرسولہ
 صلی اللہ علیہ وسلم فی کیفیتہ تلقیہ الوحی
 من الملك فانہ کان یبادر الی اخذہ ویسأبن
 الملك فی قرآنہ فامرہ اللہ عز وجل اذا جاءہ
 الملك بالوحی ان یستمع لہ وتکفل اللہ ان
 یجمعہ فی صدرہ الخ

اس میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دی گئی ہے کہ فرشتہ سے وحی کس کیفیت سے حاصل کرنی ہے کیونکہ آپ وحی کے لینے میں جلدی کرتے اور فرشتہ سے اس کی قرآۃ میں مسابقت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ جب فرشتہ وحی لائے تو آپ توجہ فرمائیں اور قرآن پاک کو آپ کے سینہ میں محفوظ کر لینے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھا لیا ہے۔

(تفسیر جلد ۳ ص ۴۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ اس آیت کے نزول سے پہلے اس طرح پڑھنے کو خلاف ادب نہ سمجھتے تھے لیکن آپ پر واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ کا کام استماع ہے ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں ہے باقی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہمارے مطلب کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آپ اس خیال سے پڑھتے تھے کہ مبادا بھول نہ جاؤں سو آپ پر منکشف کر دیا گیا کہ آپ بھولیں گے بھی نہیں اور اس طرح قرآن کریم کا ادب بھی ملحوظ رہے گا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف خیر الکلام

الف باتا پڑھنے والے ابجد خوانوں کو ذہن مبارک میں جگہ دیے ہوتے ہیں جہی تو فرماتے ہیں کہ پڑھنا پڑھنا ختم ہو جائے گا۔ بات اُن کی ہو رہی ہے جو سن کر تدبر اور قرآن کریم کے مضمون پر غور و خوض کر سکیں اور ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ پہلے سن لیں پھر لب کشائی کریں۔ بچوں کی بات نہیں ہو رہی۔

(۲) ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ سے خطاب

فرمایا ہے :

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ
يُفْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا
اور آپ جلدی نہ کریں قرآن کے لینے میں جب تک
پورا نہ ہو جایا کرے اس کا اتنا۔ اور کہیے اسے میرے رب
زیادہ کر علم مسید اور سمجھ۔ (پ ۱۶ طہ رکوع ۷)

یہ آیت بھی اس امر کو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ تلاوت اور قرأت قرآن کریم کے وقت سامعین کو پورے تدبر اور انہماک کے ساتھ قرآن سننا چاہیے اور خود ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرنی چاہیے۔

(۳) بعثت محمدی سے پہلے جنوں کو کچھ آسمانی خبریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ جب اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوئی تو وہ سلسلہ بند ہو گیا اور بہت کثرت سے شہب کی مار پڑنے لگی۔ جنوں کو خیال ہوا کہ ضرور کوئی نیا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبروں پر بہت زیادہ سخت پھرے بٹھلائے گئے ہیں۔ اسی کی تلاش و جستجو کے لیے جنوں کے مختلف گروہ مشرق و مغرب میں پھیل پڑے۔ ان میں سے ایک جماعت بطنِ نخلہ (مکہ مکرمہ کے پاس ایک مقام کا نام ہے) کی طرف سے گذری۔ وہاں اتفاق سے اس وقت اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی اس ٹکڑی کا رخ قرآن کریم سننے کے لیے ادھر پھیر دیا۔ قرآن کریم کی آوازان کو بہت عجیب اور موثر و دلکش معلوم ہوئی اور اس کی عظمت اور عظمت دلوں پر چھا گئی۔ آپس میں کہنے لگے کہ چپ رہو اور خاموشی کے ساتھ یہ کلام پاک سنو۔ آخر قرآن کریم نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہی نئی چیز ہے جس نے جنوں کو آسمانی خبروں سے روکا ہے۔ بہر حال جب اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرآن کریم پڑھ کر فارغ ہوئے تو یہ لوگ

اپنے دلوں میں ایمان و ایقان کا موجزن سمندر لے کر واپس ہوتے اور اپنی قوم کو نصیحت کی جس کی پوری تفصیل سورہ جن میں کی گئی ہے اور آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی اسی سورت کے ذریعہ سے ان کا پورا قصہ اور واقعہ بتلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ
يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ أَنْ طَلَائِمًا حَضَرُوهُ
قَالُوا أَلْصِقْتُمُ آبَاجَ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَى
قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ -

اور جب متوجہ کر دیا۔ ہم نے جنوں کا ایک گروہ آپ
کی طرف وہ سننے لگے قرآن، پھر جب وہ وہاں پہنچے،
تو لے چُپ اور خاموش رہو۔ پھر جب قرآن ختم ہوا
تو اپنی قوم کی طرف چلے گئے تاکہ ان کو خدا تعالیٰ کی مخالفت

(پارہ ۲۶، احقاف ۴) اور عذاب سے ڈرائیں

اللہ تعالیٰ نے اس مضمون میں جنوں کے اس گروہ کی تعریف بیان کی ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ

کہ پوری توجہ کے ساتھ خاموش رہ کر قرآن کریم کی قرآءت سنی بلکہ اس کا خیر پر دوسروں کو بھی
آمادہ کیا اور مرد مومن کی بھی یہی عادت اور خصلت ہونی چاہیے کہ قرآءت قرآن کے وقت خود چپ
رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ خاموشی ادب و
احترام کے لیے نہ تھی، تحقیق حال کے لیے تھی کیونکہ دوسری جگہ ثابت ہے کہ جب آپ نے سورہ
رحمن پڑھی تو جنات جواب دیتے تھے۔ (محصلہ ص ۳۶۴)

الجواب:

جنوں کا خاموش رہنا خالص ادب اور احترام کے لیے تھا اگرچہ وہ اس وقت تک مسلمان
نہ تھے مگر بات سمجھنے کی اور خدائی کلام کی تعظیم کی اہلیت ان میں تھی۔ علاوہ ان میں قرآن کریم کے
مضامین پر مطلع ہونا اور اس سے آگاہی حاصل کرنا آپ کو کیوں ناگوار ہے! آپ بھی استماع
وانصات سے کام لیں۔ رہا سورہ رحمن میں جنوں کا جواب تو یقین رکھیے کہ وہ ساتھ ساتھ
سورہ رحمن ہرگز نہ پڑھتے تھے۔ جب آپ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا الْآيَةِ کی قرآءت مکمل کر چکے تو اس
کے بعد جنات تائید میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ مقتدی جہری نمازوں میں آمین کہہ کر
تائید کرتے ہیں کیونکہ ساتھ ساتھ پڑھنا تو خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ حکامت اور سکنت
کا صحیح احادیث میں کہیں وجود نہیں ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کافروں اور مشرکوں کے ایک بُرے منصوبے کا تذکرہ یوں کرتا ہے اور اس کے

بعد ان کو سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا

الْقُرْآنِ وَالْغَوَافِرِ لَعَلَّكُمْ تَتَلَبَّسُونَ۔

(پارہ ۲۴، ج ۱، حصہ ۵، ص ۴۵)

غل مچا دو تا کہ تم غالب ہو جاؤ۔

اگرچہ مشرکین کا قرآن کریم کو نہ سننا اور قرأت کے وقت شور و غل مچانا، معاندانہ اور مخالفانہ طور

پر تھا اور حضرات مجازین قرآۃ خلف الامام کو قرآن کریم سے یقیناً عداوت اور عناد نہیں ہوتا اور نہ

ان کا پڑھنا من کل الوجوه ان کافروں کے شور و غل کے برابر ہے۔ اور گو وہ اندر روتے دیانت پڑھتے

ہیں لیکن دیکھنا صرف یہ پہلو ہے کہ قرآن کریم کی قرآۃ اور تلاوت کے وقت خود پڑھنا کیا باعثِ مخالفت و

منازعت اور تشویش و ہاتھ پائی کا سبب ہے یا نہیں؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ہے تو ایسے موقع پر

خود قرآن کریم کا پڑھنا آداب قرآن کریم کے خلاف اور موجب تشویش و عداوت ہے، لہذا حق اور صواب

یہی ہے کہ تلاوت قرآن کریم کے وقت خاموش رہ کر اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مؤلف

خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جن باتوں کی شریعت نے اجازت دی ہے وہ کیونکر بے ادبی ہیں۔ (محصلاً ص ۳۶۳)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بھری نمازوں میں امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرنے کا کسی شرعی دلیل سے ثبوت

نہیں ہے اور یہ خلاف اجماع ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

هَذَا حَالُ هَوَاهُ الْعَجْمَةِ مِنَ الْكُفَّارِ

ان جاہل کافروں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں

وَمِنْ سَلَكِ مَسْلَكِهِمْ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ وَقَدْ

کا یہ حال ہے کہ وہ قرآن کی قرآۃ کے وقت خاموشی اور

امر الله عباده المؤمنين بخلوات ذلك فقاً

سکوت اختیار نہیں کرتے اور شور و غل مچاتے ہیں اور مؤمنوں

واذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا

کو اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآن

لعلکم ترحمون۔

مجید پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۸۹ مع المعالم)

تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے۔

حافظ صاحب کی عبارت سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآۃ قرآن کے وقت مومنوں کا کام

دہلی کے ساتھ اس کو سننا ہے اور جاہل کافر اور ان کے پیروکار اس ضابطہ کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”اے ابن مسعود! مجھے قرآن کریم پڑھ کر سناؤ۔ ابن مسعود فرماتے ہیں: میں نے کہا حضرت! کیا میں آپ کو قرآن پڑھ کر سناؤں؟ حالانکہ آپ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ انی اشتہی ان اسمعه من غیرى — میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں۔“ (مسلم جلد ۱ ص ۲۷۰)

یہ روایت بخاری جلد ۲ ص ۶۵۹ اور ترمذی جلد ۲ ص ۱۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود نے سورۃ نساء کا کافی حصہ پڑھ کر سنایا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پورے ذوق و شوق سے سنا۔ امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں اس سے جو احکام اور فوائد اخذ ہو سکتے ہیں۔ ان کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

منها استجاب استماع القراءة و
الاصغاء لها والبكاء عندها وتدبرها و
استجاب طلب القراءة من غیره لیستمع
لدهو وبلغ في الفهم والتدبر من قرأته
بنفسه۔ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۷۰) ہے۔

ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کا بغور سننا اور توجہ کرنا اور رونانا اور تدبر کرنا پسندیدہ بات ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ دوسرے سے قرآن کریم سننے اور دوسرے سے سننا خود پڑھنے سے فہم و تدبر میں زیادہ مدد و معاون ہے۔

یعنی اگرچہ قرآن کریم کا پڑھنا کارِ ثواب ہے لیکن جس طرح دوسرے سے سننے میں فہم و تدبر اور غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ وہ یقیناً خود پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خود پڑھنے کے بجائے بعض اوقات دوسرے سے سننا افضل اور اعلیٰ ہے۔

مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ نماز میں نہ تھا اور آپ نے کمال توجہ سے سنا آخر میں آپ نے رونانا شروع کیا اور فرمایا بس اتنا ہی کافی ہے معلوم ہوا کہ مناسب کلمہ کہنا بے ادبی نہیں ورنہ بحجیر تحریر کا پڑھنا خلاف ادب ہوگا۔ (محصلاً ص ۳۶۵)

الجواب:

ہم نے کب کہا ہے کہ وہ نماز میں تھے۔ بتلانا تو صرف قرآن کریم کی تعظیم کا پہلو ہے۔ دیکھیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باقرار شہادہ کس غور سے آخر تک سنا اور رونا شروع کر دیا۔ یہی اس کے تدبیر اور استماع کا لازمی نتیجہ تھا اور آپ نے حَسْبُكَ کہ بس اتنا ہی کافی ہے آخر میں فرمایا ہے۔ درمیان میں اور ساتھ ساتھ نہیں فرمایا۔ باقی تکبیر تحریر یہ فرض ہے۔ اس کو واجب لغیرہ کے لیے (یعنی خاموشی جو قرآن کے استماع کے لیے ہے) نہیں چھوڑا جاسکتا اور ساتھ ساتھ پڑھنا تو منکر اور شاذ ہے۔ حکما۔

قرآن کریم کے مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرًا مَثَلًا — کہ جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا ثواب ملے گا۔ قاعدہ سے عموماً اور اس صحیح حدیث سے خصوصاً کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے گا۔ اس کو دس نیکیاں عطا ہوں گی (ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۵) یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ خود پڑھنے والا دس نیکیوں کا مستحق ہے لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے سے قرآن سننے والے کو بیس نیکیاں ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

من استمع الى آية من كتاب الله
 كتب له حسنة مضاعفة (المحدث) کے لیے دہرا اجر لکھا جاتا ہے۔
 جو آدمی قرآن کی کبیر کی ایک آیت سنتا ہے اس

(رواہ احمد فی مسندہ - ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۱)

چونکہ مقتدی پر انصاف واجب ہے اس لیے اس حدیث کے رُو سے اس کو دہرا اجر ملیگا اور غیر حافظ جب حافظ کی قرآن سننے کے لیے توجہ کرے تو اس حدیث کے رُو سے وہ بھی دہرے اجر کا مستحق ہے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے؟

مؤلف خیر الکلام کا طنزاً یہ کہنا کہ غیر حافظوں کے لیے یہ نسخہ اکسیر ہے..... الخ (ص ۳۸۰) محض تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔ ملاحظہ کیجیے کس طرح صرف اپنی فاسد رائے سے حدیث کو رو کیا جا رہا ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) صرف بطور تائید ایک روایت اور ملاحظہ کریں: آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان الله يحب الصمت عند تلاوة القرآن وعند الزحف وعند الجنازة۔
 تین مقامات پر اللہ تعالیٰ خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ ان میں سے ایک قرآن کریم کی قرآءۃ کا، دوسرا لڑائی کا اور تیسرا جنازہ کا وقت ہے۔
 (اخرجہ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

احسن الکلام طبع اول میں وعنده تلاوة القرآن (الحديث) کر دیا گیا تھا جس پر مؤلف نیز الکلام نے اعتراض کیا کہ مؤلف احسن الکلام نے چالاکی کر کے وعنده الزحف... الخ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ لڑائی کے وقت ذکر اللہ قرآن سے ثابت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصاف اور ذکر جمع ہو سکتے ہیں چونکہ یہ ہماری تائید میں ہے۔ لہذا احسن الکلام والا اس کو کھا گیا ہے۔ (محصلاً ص ۵۹)

الجواب:

وعنده الزحف کا جملہ ہمارے ہرگز خلاف نہیں ہے کیونکہ لڑائی کے موقع پر مختلف اوقات ہوتے ہیں کبھی ذکر کا حکم ہے اور کبھی انصاف کا اور کبھی ذکر قلبی اور استعانت وغیرہ کا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر حضرت عبداللہ بن عمر سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ پس جب تم کافروں سے ملو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو اور جب وہ شور و غل کریں تو تم خاموش رہو۔

(تفسیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

اور ایک دوسری حدیث میں یٰٰذا کفنی کا معنی یوں کرتے ہیں: اٰی لا یشغلہ ذلک الحال عن ذکرہ ودعائہ واستعانتہ (ایضاً) یعنی لڑائی میں وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس سے مانگنے اور استعانت سے بے پروا نہ ہو تو اس میں ذکر اور انصاف دونوں جمع نہیں ہوتے بلکہ دونوں اپنے اپنے موقع پر ہیں اور حیرت ہے کہ ان کو الحدیث کی اصطلاح بھی معلوم نہیں جیسی تو کہتے ہیں کہ حذف کر دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ آخر تک حدیث پڑھو اور اس کو ملحوظ رکھو۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

دل الكتاب والسنة والجماع
 علی ان الاستماع افضل من القراءة۔
 کتاب و سنت اور اجماع امت سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی قرأت کو سننا فوہم پڑھنے سے

(مقارنہ جلد ۲ ص ۱۳۳) زیادہ اعلیٰ اور افضل ہے۔

الحاصل قرآن کریم و حدیث اور اقوال ائمہ سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ قرآن کریم کی

تلاوت اور قرأت کے وقت سامعین کو ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف توجہ اور تکرار کرنا چاہیے۔ اور صرف یہی پہلو قرآن کریم کی توقیر و تعظیم پر علی وجہ الائمہ دلالت کرتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر مشتمل ہے۔ اور اس سے عام قاعدہ اور ضابطہ بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اب ہم تخصیص کے ساتھ امام کے پیچھے قرأت کی مانعت پر قرآن کریم کی آیت پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کی تفسیر و تشریح اور شانِ نزول حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور معتبر مفسرینؒ سے نقل کریں گے۔ اور فریقِ ثانی کی طرف اس پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کی حقیقت کو بقدر وسعت الم نشرح کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

قرآۃ خلف الامام اور قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔

اور جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو۔ تاکہ تم پر رحم ہو۔

(پارہ ۹، اعراف ۴)

جہو راہل اسلام کا بیان ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسند خلف الامام پر روشنی ڈالی ہے کہ جب امام قرآن کریم کی قرآۃ کر رہا ہو تو اس وقت مقتدیوں کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ نہایت توجہ کے ساتھ اس کی طرف کان لگائے رہیں اور خود خاموش رہیں۔ امام کا وظیفہ قرأت کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموشی کے ساتھ توجہ کرنا ہے اور ان کو استماع اور انصات کے علاوہ قرأت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الحمد سے لے کر والناس تک سب قرآن ہے۔ لیکن قرآن کریم صحیح احادیث، حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کے اقوال کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کا خاص اطلاق کس سورت پر ہوا ہے؟ اور قرآن کا اولین اور بالذات مصداق کونسا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِ

اور البتہ دی ہیں ہم نے آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور دیا قرآن بڑے درجہ کا۔

(پہلا، الحجرات ۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ام القرآن ہی السبع المثانی والقرآن العظیم۔
 کہ ان سات آیتوں اور قرآن عظیم کا مصداق
 سورۃ فاتحہ ہے۔

(بخاری جلد ۲ ص ۶۸۳ اور اسی کے قریب الفاظ دارمی ص ۳۳۶ طبع دمشق میں ہیں)

اس کے علاوہ حضرت ابوسعید بن المعلی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بخاری و موطا،
 امام مالک وغیرہ میں مرفوعاً صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قرآن عظیم کا پہلے نمبر یہ مصداق ام الكتاب
 ام القرآن اور سورۃ فاتحہ ہے۔ اور یہی حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابن عباس، ابراہیم نخعی، عبد اللہ
 بن عبید بن عمیر ابن ابی ملیکہ شہر بن حوشب، حسن بصری، مجاہد اور قتادہ وغیرہ اکابر سے مروی
 ہے اور اسی کو امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر ترجیح دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

فہذا نص فی ان الفاتحة ہی السبع
 المثانی والقرآن العظیم۔
 کہ یہ روایات اور اقوال مفسرین اس بات پر
 نص ہیں کہ سبع مثانی اور قرآن عظیم کا اولین مصداق
 سورۃ فاتحہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲ ص ۵۵۵)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کی سبب سورتوں سے افضل ہے
 اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پڑھنا ہر نماز میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے (جو احادیث
 سے ثابت ہے) کہ تورات انجیل اور زبور بلکہ قرآن کریم میں اس جیسی مزیت اور فضیلت والی اور
 کوئی سورت نازل نہیں کی گئی اور یہ بالکل متنع ہے کہ استماع اور انصات کا حکم سورۃ فاتحہ
 کو شامل نہ ہو۔ حالانکہ استماع اور انصات کی آیت اس کو کئی طور سے شامل ہے کہ یہ آیت مطلق
 ہے اور سورۃ فاتحہ اس کا ایک حصہ ہے اور یہ کہ آیت عام ہے اور یہ اس کا فرد ہے (اور یہ
 کہ آیت مجمل ہے اور حدیث اس کی تفسیر ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ (صفدر)

علاوہ بریں اس کی قرآۃ اکثر اور مشہور ہے اور یہ تمام سورتوں سے افضل ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں:
 فان قوله واذ قرئ القرآن یتناولها
 ولا یتناول غیرها اظہر لفظاً ومعناً۔
 یعنی واذ قرئ القرآن کی آیت جس طرح اپنی لفظی
 اور معنوی حیثیت سے سورۃ فاتحہ کو شامل ہے اس

(فتاویٰ جلد ۱ ص ۱۴۳) طرح وہ قرآن کی کسی دوسری سورت کو شامل نہیں ہے۔
 اس تحقیق سے یہ امر بالکل واضح اور ہموں ہوا ہو جاتا ہے کہ واذ قرئ القرآن

کا صحیح، اصلی اور بالذات مصلق صرف سورۃ فاتحہ ہے۔ لہذا یہ حکم سورۃ فاتحہ پر مخصوصاً اور دیگر سورۃ پر عموماً حاوی ہے۔ اور اس لحاظ سے مقتدیوں کو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا ترک کرنا اصل ہوگا۔ اور باقی سورتوں کو ترک کر اس کی فروع، امام نسائی نے (جلد ۱ ص ۱۶۷ میں) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث (جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) انشاء اللہ العزیم اذا قرأ فانصتوا کو (کہ جب امام قرآن کرے تو تم مقتدی خاموش رہو) قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر اور تاویل میں نقل کر کے یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچا دی ہے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی قرآن کی اس آیت کو نماز اور نمازیوں کے حق میں ہی سمجھتے تھے۔ اب آپ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور معتد مفسرین کرام سے اس آیت کی تفسیر سن لیجیے کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم اس آیت کی تفسیر حضرات صحابہ کرام سے نقل کریں۔ یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کی تفسیر کا رتبہ، درجہ اور حیثیت کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کہ امام بخاری اور امام مسلم کے نزدیک صحابی کی تفسیر مسند اور مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتی ہے۔ (مشترک ج ۱ ص ۱۳۳) اور یہی امام حاکم رحمہ اللہ کی اپنی تحقیق ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۶ ص ۲۳۳) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وتفسیر الصحابی حجة۔ (زاد المعاد جلد ۵ ص ۵۲) علامہ سیوطی لکھتے ہیں وتفسیر الصحابی مرفوع۔ (تدریب الراوی ص ۶۵) علامہ جزائری لکھتے ہیں جس صحابی نے نزول وحی کا زمانہ پایا ہو۔ اس کا کسی آیت سے متعلق یہ کہنا کہ یہ فلاں اور فلاں حکم میں نازل ہوئی۔ یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (توجیہ النظر ص ۱۶۵)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

وكذا احكم اقوالهم في التفسير فانها
اصوب من اقوال من بعدهم وقد ذهب
بعض اهل العلو الى ان تفسيرهم في حكم
المرفوع۔
یعنی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر بعد کے آلہ والے
مفسرین سے بہت زیادہ صحیح اور صواب ہے حتیٰ کہ بعض
(بلکہ اکثر) علماء کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات صحابہ کی تفسیر
مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

(الجنة في الاسوة الحسنة بالسنة ص ۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۳۲ھ)

سے قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیریں منقول ہیں:

لے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آفتاب نبوت سے اکتساب نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نجوم ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے جزوی فضائل حاصل تھے کہ دوسرے کوئی ان میں ان کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہے۔ ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مطہین قرآن میں سب سے پہلے ان کا بیان کیا ہے (بخاری جلد ۱ ص ۵۳۱ و مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا ہے جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ پسند کرتے ہیں میں اس پر راضی ہوں۔ (مسند رک جلد ۳ ص ۱۹۱ صحیح) نیز فرمایا اگر بغیر مشورہ کے تمہارے لیے میں خلیفہ کا انتخاب کروں تو وہ صرف ابن مسعود ہی ہوں گے اور جس چیز کو ابن مسعود تمہارے لیے پسند نہ کرے میں بھی اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کروں گا۔ (الاستیعاب جلد ۱ ص ۳۵۹) اور فرمایا ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو۔ (ایضاً) حضرت عقبہ بن عمرو فرماتے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد میں نے ما انزل اللہ ریحی جو کچھ خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے، کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیوں نہ ہو۔ وہ ہر وقت حضور کے پاس رہتے تھے اور حضورؐ ان سے کسی وقت حجاب نہیں کرتے تھے۔ (مسلم ۲ ص ۲۹۳) مشہور تابعی شفیق رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں ابن مسعود پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتا۔ (مسند رک جلد ۳ ص ۳۱۹) یہی وجہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ علی رؤس الاشہاد فرمایا کرتے تھے۔ اس خدا کی قسم جس کے بغیر کوئی دوسرا انہیں۔ قرآن کریم کی کوئی سورت اور کوئی آیت ایسی نہیں جس کا شان نزول مجھے معلوم نہ ہو کہ کس موقع اور کس حالت میں نازل ہوئی ہے اور میں کتاب اللہ کا اپنے سے بڑا عالم کسی کو نہیں پاتا۔ (بخاری جلد ۲ ص ۴۲۸ و مسلم ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا تمام صحابہؓ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ان سب سے کتاب اللہ کا بڑا عالم ہوں۔ (ایضاً) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ خلیفہ راشدین رضی اللہ عنہما سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور اہل علم میں ان پر وہ حضرات کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے۔ (مفتاح السعادة جلد ۱ ص ۳۵۳) حضرت عمرؓ نے ان کو علم کا امتیاز کیا۔ اور اہل کوفہ کی طرف تعلیم قرآن کے لیے ارسال کیا۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۲۴) بعض حضرات نے مسکد رفع یدین کے پیش نظر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر متعدد مسائل میں نسیان کا الزام ٹانگ دیا ہے۔ لیکن نسیان تو انسان کی فطرت اور خمیر میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو اولاد آدم کو باپ سے بطور ورثہ ملا ہے۔ اگر نسیان (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

سے محض نسیان ہی مراد ہے تو دوسروں کا ذکر بعد میں ہوگا۔ کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: انما انا بشر افسی کما تنسون اور اگر نسیان سے مراد بعض مسائل اور احادیث سے لاعلمی ہے تو یہ قصور صرف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کا نہیں بلکہ دوسرے بھی اس بات میں ان کے شریک ہیں۔ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو وراثت جہہ کی بابت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم طاعون سے متعلق بلکہ رفع یدین کے مرکزی راوی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کو مسح علی الخفین کے مسئلہ سے ناواقف اور لاعلمی نہ تھی؟ اور کیا یہ اکابر عموماً اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم اس لیے قابل اعتماد نہ رہے۔ کہ انھوں نے مسح علی الخفین (دیکھیے موطا ص ۱۷) جیسے مسئلہ سے جس کا ثبوت متواتر احادیث اور تعامل امت سے ثابت ہے۔ لاعلمی ظاہر کی بلکہ انکار کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر اشکر المسح علی الخفین مع قدیم صحبتہ و کثرة روايته اھ (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۳۹ طبع مصر) کہ بے بیشک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے مسح علی الخفین کا انکار کیا حالانکہ وہ پرانے صحابی اور کثیر الراوی تھے۔ باقی باتوں کا ذکر تو روایات اور احادیث سے متعلق ہے اور یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کی سورتیں نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خالص افتراء اور بہتان ہے۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ

کل ما روی عن ابن مسعود من ان المعوذتین وام القرآن لم یكونا فی مصحفہ
 جنتی روایتیں بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس مضمون کی نقل کی گئی ہیں کہ معوذتین اور ام القرآن ان کے مصحف میں نہ تھیں تو وہ خالص جھوٹی اور جعلی
 (محلّی ابن حزم جلد ۱ ص ۱۳) ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہیں۔

امام نووی رحمہ اور علامہ سیوطی رحمہ لکھتے ہیں:

وما نقل عن ابن مسعود باطل لیس بصحیح۔
 معوذتین کے قرآن میں نہ ہونے کی جنتی روایتیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں وہ سب باطل اور غیبر۔
 (شرح المہذب جلد ۱ ص ۱۹۱) صحیح ہیں۔

امام سبکی فرماتے ہیں کہ دلیل قاطع اس پر قائم ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جھوٹ باندھا گیا ہے اور وہ اس سے بالکل بری ہیں۔ (طبقات جلد ۲ ص ۲۰۶)

پہلی روایت: امام ابن جریر فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو کریم نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے محاربی نے بیان کیا۔ وہ داؤد بن ابی ہند سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ یسیر بن جابر سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

لے ان کا ترجمہ عنقریب آ رہا ہے۔

۱۰ ابو کریم کا نام محمد بن العلاء ہے۔ علامہ ذہبی ان کو الحافظ، النقیہ اور محدث کو فہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۷۲) امام نسائی رح ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الخفاف کا بیان ہے کہ میں نے اسحاق رح بن ابراہیم رح کے بعد ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ محدث مسلمہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۳۸۶)

۱۱ محاربی کا نام یحییٰ بن یعلیٰ ہے۔ امام ابو حاتم رح ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۱ ص ۳۰۳) اور کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے اس روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محاربی دو ہیں۔ ایک یعلیٰ بن یعلیٰ جن کی توثیق مولانا سرفراز صاحب نے فرمائی ہے اور دوسرے عبد الرحمن بن محمد بن زیاد جو انتہا درجہ کے ضعیف ہیں اور قوی احتمال ہے کہ مولانا نے ضعیف محاربی کی توثیق کر کے اپنا مطلب نکال لیا ہو۔ (محصلاً الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۷۱ کالم ۳) الجواب: راقم نے یعلیٰ بن یعلیٰ رح کی توثیق نہیں نقل کی بلکہ یحییٰ بن یعلیٰ المحاربی رح کی توثیق نقل کی ہے اور اس سند میں یہی محاربی ہیں۔ ہم محض قاضی صاحب کی تسلی کے لیے عبد الرحمن بن محمد بن زیاد المحاربی کے متعلق بھی یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ وہ انتہائی درجہ کے ضعیف نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔

۱۲- اس لیے کہ یہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے مرکزی راوی ہیں کیا فریق ثانی کے نزدیک صحاح ستہ کے مرکزی راوی بھی انتہا درجہ کے ضعیف ہوتے ہیں؟ یہ ہے غیر مقلدین حضرات کا علم و دیانت۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ اگرچہ ان کے بارے میں بعض نے مضطرب کثیر الغلط اور سہم وغیرہ کے الفاظ کہے ہیں لیکن امام ابن معین، نسائی اور ابو حاتم ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام وکیع فرماتے ہیں کہ طویل احادیث کے وہ بڑے حافظ تھے۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعد ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاپر ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث بزار اور دارقطنی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ عجل ان کو لا بائس بہ کہتے ہیں اور ساجی ان کو صدوق کہتے ہیں۔ (ملتقطاً تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۶۶)۔ (باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

صلیٰ ابن مسعود فسمع انا سابقاً و
مع الامام فلما انصرف قال اما ان لکم
ان تفهموا اما ان لکم ان تعقلوا و اذا
قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کما
امرکم اللہ تعالیٰ۔
(تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص ۱۳۱)

کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود نے نماز پڑھی اور چند
آدمیوں کو امام کے ساتھ قرآن کریم پڑھنا سنا۔ جب آپ نماز
سے فارغ ہوئے تو فرمایا کیا وہ وقت ابھی نہیں
آیا کہ تم سجدہ اور عقل سے کام لو اور جب قرآن کریم کی قرآن
ہوتی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو جیسا
کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

یہ روایت وضاحت سے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ پڑھنے والے امام کے پیچھے قرآن کریم پڑھے اور حضرت
ابن مسعود نے ان کو فہم و عقل سے کام نہ لینے پر تنبیہ کرتے ہوئے قرآن سے منع کیا اور یہ بات بھی عیاں گئی
کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو استماع اور انصات کا حکم دیا ہے۔ جو امام کے ساتھ اس کی
اقتداء میں نماز ادا کر رہے ہوں اور یہ وہی ابن مسعود ہیں جو کتاب اللہ کے عالم ہونے میں تمام حضرات صحابہ
(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) قاضی صاحب مولف احسن الکلام سے بے شک اختلاف رکھیے، مگر صحاح ستہ کے ثقہ راوی کو تو
انتہا درجہ کا ضعیف نہ قرار دیکھیے۔

تھ داؤد بن ابی ہند، کو امام احمد، سفیان ثوری، ابن معین، ابوصالح اور نسائی ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن ابی شیبہ ان کو
ثقل اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن جبان ان کو متقین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن خراش ان کو ثقہ اور ابن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث
کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۳ ص ۲۰۷) فہمی ان کو امام اور الثبت کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۷)۔
یہ یسیر بن جابر، ابن جبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعد ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام عینی ان کو من ثقات اصحاب
عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں۔ بخاری بن حوشب ان کو صحابی بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سلسلہ میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔
(تمذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۶۹) حافظ ابو عمر بن عبدالبر بھی ان کو صحابی بتلاتے ہیں۔

(الاستیعاب جلد ۲ ص ۶۱۷)

نوٹ: تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر کے بعض نسخوں میں کاتب کی غلطی سے بشیر بن جابر لکھا گیا ہے
جو قطعاً غلط ہے مسند احمد جلد ۱ ص ۳۸۴ اور مسند طبری ص ۱۵ اور صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۹ میں ایک
دوسری حدیث کی سند میں یسیر بن جابر ہی آیا ہے جو صحیح ہے مزید تشریح کے لیے نووی جلد ۱ ص ۳۹۔
اور تجربہ اصوار الصحابۃ للذہبی جلد ۲ ص ۱۵ وغیرہ کی طرف مراجعت کیجیے۔

کرام حتی کہ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور جن کو ہر سورت اور ہر آیت کا شان نزول بخوبی معلوم تھا۔ مولف خیر الکلام نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ شان نزول میں بیان کر رہے بلکہ استدلال کر رہے ہیں اور استدلال بھی ان کی بے جا حرکت پر تھا کیونکہ وہ امام کے ساتھ ساتھ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے جیسا کہ لفظ استماع سے معلوم ہوتا ہے..... الخ (محصلاً ص ۳۵)۔

الجواب:

حضرت ابن مسعودؓ تو کہا امر کہ اللہ سے اس کا شان نزول بیان فرما رہے اور اگر استدلال بھی مان لیا جائے تو ماوشما کا استدلال تو نہیں بلکہ حضرت ابن مسعودؓ صحابی کا استدلال ہے جو پہلے درجہ کے مفسر ہیں۔ اور مقتدیوں کی بیجا حرکت امام کے ساتھ قرآہ تھی نہ کہ جہر۔ جیسا کہ یقرؤن کے الفاظ اس پر دال ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد میں لفظ انصات اس کی واضح دلیل ہے اور حضرت ابن مسعودؓ نے قرآہ کی اس بیجا حرکت سے انہیں منع فرمایا ہے اور مطلق قرآہ پر جہر کا اطلاق محض مجازی طور پر ہوتا ہے جس کے لیے قرینہ صارفہ درکار ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

دوسری روایت۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو الحسنؒ، محمد بن حسینؒ بن داؤد علویؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے ابو الحسنؒ علی بن محمد بن حماد بن محمد بن حشاذ العدل نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں۔ مجھ سے محمد بن حسینؒ انماطی بغدادی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے یحییٰ بن ایوب نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عبد الوہاب ثقفی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

۳۹
۱ امام ابو بکر احمد بن حسین البیہقی علامہ ذہبیؒ ان کو امام، الحافظ، العلامة اور شیخ خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ ص ۳۹)۔
۲ جلیل القدر عالم اور بڑے پایہ کے صوفی تھے۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۲۲۸) علامہ ذہبیؒ ان کو امام بیہقی کے مشائخ اور زمرہ محدثین میں بیان کرتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۲۹)۔

۳ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۶۹)۔
۴ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۲۲۸)۔

۵ علی بن مدینیؒ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور حسین بن فہمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۸۸)۔

۶ الحافظ الامام اور ثقہ تھے۔ (تذکرہ ص ۲۹۵) آخر عمر میں ان کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ (تقریباً ص ۲۳۹)۔
(باقی اگلے صفحہ پر)

ابو بکرؓ نے بیان کیا۔ وہ منصوصاً سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو وائلؓ سے روایت کرتے ہیں:
 قال عبد الله في القراءة خلف الامام
 انصت للقرآن كما امرت فان في القراءة
 لشغلا وسيكفيك ذلك الامام۔
 کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ امام کے
 پیچھے خاموشی اختیار کرو۔ جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔
 کیونکہ خود پڑھنے کی وجہ سے امام کی قرآن سننے سے آدمی
 رہ جاتا ہے اور امام کا پڑھنا ہی تمہیں کافی ہے۔ (الکتاب
 (كتاب القراءة ص ۷۳)

قرآن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔)

حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت صحیح ہے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور خطاب ان لوگوں کو
 تھا جو امام کے پیچھے اس کی اقتدا کر رہے تھے۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور یہ سبھی وہی تمام
 نمازوں کو شامل اور فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو حاوی ہے اس میں قرأت کو مانا زاد علی الفاہمہ پر
 پر حمل کرنا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحبؒ نے کیا ہے سراسر باطل ہے اور اس روایت میں گو
 اہر ت ہے لیکن پہلی روایت میں تصریح ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور امر بھی واذا قرئ القرآن۔
 الآیة سے واضح ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اسی مضمون کی روایتیں مختلف اسانید سے اور بھی مروی
 ہیں مگر ہمارا مقصد استیعاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۳۷ھ) سے اس آیت کی تفسیر
 میں متعدد روایات مروی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو روایتیں نقل کرتے ہیں۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) لیکن اس فتور کے زمانہ میں انھوں نے کوئی روایت بیان نہیں کی۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۹۱)
 لہ ثقہ، ثبت اور حجت تھے۔ (تقریب ص ۳۶)

۱۱ الامام الحافظ اور الحجۃ تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۳) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ بڑے متقن تھے تدلیس
 نہیں کرتے تھے۔ عجلؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حجت کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱۰ ص ۳۱۵)

۱۲ ابو وائلؓ ان کا نام شقیق بن سلمہؒ ہے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں وہ ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے متعلق
 سوال نہیں ہو سکتا۔ امام وکیعؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن

حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۳۶)

۱۳ تمام حضرات صحابہ کرامؓ میں ابن مسعودؓ کے بعد نبی حضرت عباسؓ کا آتا ہے۔ اور کیوں نہ
 (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پہلی روایت: امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے ابو زکریا بن ابی اسحاق مزکی نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے ابو اسحاق محمد بن محمد بن عبدوس نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عثمان بن سعید نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عبد اللہ بن صالح بن عبد اللہ بن سعید نے بیان کیا۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا فرماتی تھی کہ اے اللہ! اس کو دین کی سچھ اور قرآن کریم کی تفسیر اور تاویل کی مہارت عطا فرما۔ (مسند احمد جلد ۳ ص ۳۲۵) قال الہدیشی رحمہ اللہ بحالہ رجال الصحیح جمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۷۷ و صحیح ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۹۷ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ اعلیٰ الناس بہما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ایضاً البدایہ جلد ۸ ص ۳۰۳)۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ دین کے امام علم کا سمندر اور بہت بڑے عالم تھے۔ (تذکرہ ص ۳۱) یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر ایسے محقق اور صاحب بصیرت بھی قرآن کریم کی تفسیر میں ان کی طرف مراجعت کرتے تھے۔ (بخاری ۲ ص ۴۳۷)۔

۱۰ علامہ ذہبی انکو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۳۵) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ ادیب مورخ کثیر العلوم تھے اور علاقہ نیشاپور میں علم حدیث کا درس دیتے تھے (بغدادی جلد ۴ ص ۲۳۹) علامہ سبکی نے طبقات جلد ۲ ص ۹۰ میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبی ان کو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۳۷) علامہ ذہبی ان کو الامام اور الحجۃ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۰۱)۔

۱۱ امام ابن معین انکو ثقہ اور ابوحاتم صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو مستقیم الحدیث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۳۵۷) عبد الملک بن شعیب ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابو زرعہ انکو حسن الحدیث اور ابن عدی مستقیم الحدیث کہتے ہیں۔ مسلم بن قاسم ان کو ثقہ کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۵۹) امام ابن معین نے ان کو ثبت فی کتاب کہا ہے (تہذیب ص ۲۶۰) یعقوب بن سفیان انکو الرجل الصالح لکھتے ہیں (تہذیب ص ۲۵۹) ابو ہارون الخریزی فرماتے ہیں کہ میں ابوصالح سے ائبت اور کوئی نہیں دیکھا اور ابن القطان فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہیں۔

ان پر ایسا کوئی الزام ثابت نہیں سکا جسکی وجہ سے انکی حدیث ساقط الاعتبار ہو۔ ہاں وہ مختلف فیہ ہیں (فحدیث حسن) انکی حدیث حسن (ایضاً ص ۲۷۰) حافظ ابن حجر نے اس کی نشان دہی کی ہے کہ یہ صحیح بخاری کے راوی ہیں (ایضاً) اور صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۳ میں انکی روایت موجود ہے اور بن خضرات محدثین کرام نے ان میں کلام کیا ہے تو اسکی اصل وجہ ان کا ایک شعر یہ شہرہ رسوی تھا جس کا نام خالد بن نبیح تھا، ابوصالح عبد اللہ بن صالح کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تہذیب التہذیب (جلد ۵ ص ۲۵۹) وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور امام بخاری نے ابوب النضر اور ابن القزاع وغیرہ میں ان سے باقائدہ احتجاج کیا ہے فرق ثانی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ محض تعصب کی وجہ سے ایسے مسلم راویوں کو بھی مجروح اور ضعیف گردانتے کے درپے ہے۔ امام حاکم انکی سند سے ایک حدیث کو صحیح الاسناد اور فضیلت صحیح کہتے ہیں (مستدرک ص ۱۹۹) اور انکی سند سے ایک روایت کو علامہ ذہبی سند قوی کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۳۵۷) اور حافظ ابن کثیر انکی سند ایک حدیث کو اسناد جدید سے تعبیر کرتے ہیں۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۵ و تفسیر جلد ۳ ص ۲۲۸) قاضی مقبول احمد صاحب لکھتے ہیں کہ ابن عدی نے ان کو مستقیم الحدیث کہا

وہ کہتے ہیں مجھ سے معاویہ بن صالح نے بیان کیا۔ وہ علی بن ابی طلحہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

عن ابن عباسؓ فی قوله تعالیٰ واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحموا
حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اذ قرئ القرآن آتتہ
فرضی نماز کے بارے میں نازل ہوتی ہے۔

(کتاب القراءۃ ص ۳۳)

یعنی فی المصلوۃ المفروضۃ

حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس آیت میں اجتماع اور انصات کا جو حکم آیا ہے وہ شان نزول کے لحاظ سے صرف فرضی نماز کو شامل ہے اور یہی اس کا شان نزول ہے۔ گو غیر فرضی نمازوں (مثلاً نماز عید و تراویح وغیرہ) اور خطبہ کو بھی عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے۔
تنبیہ: علی بن ابی طلحہ ہاشمیؓ کی براہ راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سماعت نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ حضرت مجاہد بن جبرؓ اور سعید بن جبیرؓ کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں ثقہ ہیں (جیسا کہ اپنے موقع پر ذکر ہوگا) اس لیے یہ روایت بلا شک و شبہ

(پچھلے صفحہ کا باقی) ہے مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ سند اور متن میں غلطی کر جاتا ہے۔ عمدًا جھوٹ نہیں کہتا۔
(تہذیب جلد ۵ ص ۲۵۶) اس لیے عبداللہ بن صالحؓ پر شدید جرح موجود ہے۔ ۱۔ محصلہ الاعتصام ۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۱ کالم ۲) مگر جہور محدثین کی تعدیل کے مقابلہ میں صرف ابن عدیؒ کا یہ بیان ادنیٰ جرح بھی نہیں چر جائیکہ شدید جرح ہو۔

لہ علامہ خطیبؒ ان کو ثقات میں بیان کرتے ہیں (بغدادی جلدی ۱۱ ص ۳۲۵) امام احمدان کو ثقہ اور ابن عدیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابو زرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۰۹) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الفقیہ اور قاضی اندلس لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۶) حاکمؒ ان کی سند سے ایک روایت کو صحیح سے (مستدرک ص ۱۰۹) اور ذہبیؒ حسن الاسناد، اور صالح الاسناد سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۲، ۳۵۳) بلکہ ذہبیؒ بھی ان کی ایک سند کو صحیح کہتے ہیں (تخصیص المستدرک جلد ۲ ص ۵۱) اور سیوطیؒ ان کی سند سے ایک روایت کو اسناد صحیح سے تعبیر کرتے ہیں (تاریخ الخلفاء ص ۱) اور مستدرک جلد ۳ ص ۱۲) میں ایک روایت کی سندیوں سے۔ عبد اللہ بن صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ..... الخ امام حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں فرماتے ہیں صحیح۔

۱۵ امام نسائیؒ ان کی لیس بہ بائس سے توثیق کرتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۲۲۵) ابو داؤدؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح اور معتبر ہے۔ (دیکھیے مزید تحقیق کے لیے میزان الاعتدال ص ۲۲۸ فتح الباری ۸ ص ۳۳۲) ،
 تہذیب التہذیب ۷ ص ۳۳۹، اور تفسیر اتقان ج ۱ ص ۱۸۸
 علی بن ابی طلحہ کے اس تفسیری صحیفہ کو صحیح اور معتبر سمجھتے ہوئے امام ابو جعفر نخاس نے اپنی کتاب
 النسخ والمنسوخ میں استفادہ کیا ہے (اتقان جلد ۱ ص ۱۸۸) اور اسی صحیفہ سے امام بخاری نے
 صحیح میں اور امام ابن جریر و ابن ابی حاتم اور امام ابن المنذر وغیرہ نے تفاسیر میں خوشہ چینی کی
 ہے۔ (فتح الباری جلد ۸ ص ۳۳۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں: اماروایت از ابن عباس بطریق مختلفہ آمدہ اچود
 آہنا طریق معاویہ بن صالح از علی بن ابی طلحہ از ابن عباس است، بخاری در صحیح خود اعتماد بر ہمیں
 طریق کردہ پس بس۔ (اکسیر فی اصول التفسیر ص ۱۱)

مصنف خیر الکلام نے اس سے جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی ابن عباس
 سے باقر مصنف احسن الکلام سماعت نہیں۔ لہذا یہ منقطع ہے اور مجاہد اور سعید بن جبیر
 کا واسطہ تفسیری صحیفہ میں ہے جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ یہ اسی صحیفہ کی روایت ہے۔
 تو اتصال ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ لہ اشياء منکرات۔

(میزان جلد ۲ ص ۲۲۸) اس کے لیے کچھ منکر چیزیں بھی ہیں اور متن کے لحاظ سے اس میں کوئی ذکر
 نہیں کہ مقتدی کو آیا جہر سے روکا گیا ہے یا کلام کرنے یا شور ڈالنے سے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آیت
 فرضی نماز جمعہ اور عید سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں نماز کو دوسرے مقامات پر ترجیح نہ ہوگی۔

(محصلاً خیر الکلام ص ۳۲۴ و ۳۲۸)

الجواب:

ہم نے باحوالہ ثابت کیا ہے کہ علی بن ابی طلحہ صحیح مسلم کا روای و ثقہ ہے اور اس نے مجاہد اور
 سعید بن جبیر کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے تفسیر حاصل کی ہے اور اسی کو امام حاکم اور
 ناقدین رجال علامہ ذہبی وغیرہ صحیح کہتے ہیں جیسا کہ باحوالہ گذر چکا ہے اور ہم نے باحوالہ نواب
 (بقیہ پچھلا صفحہ) ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث علی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۳۹)
 اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۲۶۵ میں ان کی روایت موجود ہے۔

صاحب سے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عباس کی روایت کے طرق تو متعدد ہیں مگر اجمود ترین طریقہ معاویہ بن صالح از علی بن ابی طلحہ از ابن عباس ہے اور اسی طریق پر امام بخاری نے اعتماد کیا ہے۔ صحیفہ کی قید مؤلف خیر الکلام کی محض سینہ زاد ہے۔ جس کی پرکاشہ بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روایت اصول حدیث کے رُو سے بالکل صحیح اور متصل ہے۔ رہا امام احمد کا یہ فرمانا کہ لہ اشیاء منکرات تو بجا ہے لیکن اس کی وجہ ان کا روایت میں ضعف نہیں بلکہ اس لیے کہ

ولکن له رأی سوء کان یرمی السیف

ان کی رائے اچھی نہ تھی کیونکہ وہ خلیفہ کے مقابلہ

(تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۳۲۴) خروج کو جائز سمجھتے تھے۔

اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ

ونقل البخاری من تفسیرہ روایت

امام بخاری نے اپنی تفسیر میں معاویہ بن صالح عن

معاویة بن صالح عن ابن عباس شکیاً

علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کے طریق سے اپنے ابواب کے

کثیر فی التراجع وغیرہا ولکنہ لا یمسہ

ترجمہ وغیرہ میں بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن وہ

یقول قال ابن عباس او یدکر عن ابن عباس

ان کا نام نہیں لینے بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ ابن عباس نے فرمایا

وقد وقفت علی السبب الذی قال فیہ

یا ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے اور میں اس کی وجہ پر مطلع

ابوداؤد یرمی السیف اھ

ہرچکا ہوں وہ یہ ہے کہ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ وہ بادشاہ

(تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۳۲۴)

کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دیتے تھے۔

ان کے ایسے خیالاتی اشارے منکرات کی مد میں ہیں اور ایسے راوی جو شیعہ، مرجی اور قدری وغیرہ ہیں

صحیحین میں ان کی بے شمار روایتیں موجود ہیں۔ یہ ان کی ضعف کی وجہ نہیں ہے اہل علم سے یہ امر

مخفی نہیں ہے اگر ضرورت پڑی تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل عرض کریں گے اور اس ارشاد

سے مقتدی کو قرآۃ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ وَاذْ قُرْمٰی... الایتہ اس کا واضح قرینہ ہے۔ باقی جہر

اور شور و غل وغیرہ حضرات صحابہ کرام سے جماعتی رنگ میں حضور کے پیچھے نہ ہوتا تھا۔ افراد کا

معاملہ الگ ہے اور نماز میں قرآت سے منع کرنا اس آیت کا اولین مصداق ہے کیونکہ جمعہ اور

غید وغیرہ کا حکم ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور آیت مکی ہے۔ ہاں ضمنی طور پر وہ بھی اس میں

داخل ہیں کیونکہ بقول مؤلف خیر الکلام شان نزول کے حکم میں اس قسم کی وسعت ہوتی ہے۔

دوسری روایت ہ امام بیہقی فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو الحسن علی بن محمد بن عبد اللہ بن بشران نے بغداد میں بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ابو جعفر محمد بن عمرو الرزاز نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے سعدان بن نصر نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے مسکین بن بکیر الحرفی نے بیان کیا۔ وہ ثابت بن عجلان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ سعید بن جبیر سے اور وہ عبد اللہ بن عباس سے انھوں نے فرمایا :

المؤمن في سعة من الاستماع اليه
 الا في صلوة مفروضة او المكتوبة او يوم
 جمعة او يوم فطر او يوم اضحى يعنى واذا
 قرئ القرآن الاذية
 کہ آیت واذا قرئ القرآن کے پیش نظر مؤمن
 پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کو گنجائش ہے کہ سنے
 یا نہ سنے مگر مفروضہ نماز جمعہ، عید الفطر، عید الاضحیٰ
 کے موقع پر اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔
 (کتاب القراءة ص ۷۷)

(ان حالات میں اس کو بہر حال خاموش رہنا اور استماع و انصات کرنا ضروری ہے)

۱۔ امام خطیب ان کو ثقہ، صدوق، ثبت، حسن الاخلاق اور تام المرؤہ لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۹۹)

۲۔ علامہ بغدادی ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۱۳۲)

۳۔ امام ابو حاتم ان کو صدوق اور دارقطنی ان کو ثقہ اور مأمون لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۲۰۵)

۴۔ امام احمد اور ابن معین ان کی لا بائس کہتے ہوئے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبان اور ابن شاپرین ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن عمار ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو صالح الحدیث اور لا بائس بہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ حدیث کے حافظ تھے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ تقریب میں اس کو خطا کار کہا ہے اور امام احمد اور ابو احمد نے اس کو بہت وہمی اور کثیر الخطا کہا ہے۔ (محصلاً الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۵۰ کالم ۱) لہذا اس حدیث پر کسی طرح اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ (ایضاً)

الجواب۔ ان کا وہم اور خطا وغیرہ جو کچھ ہے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف سعید بن عبد العزیز کی روایت میں ہے۔

چنانچہ خود ابو احمد نے تصریح کی ہے ومن ابن کان مسکین يضبط عن سعید ۸۱۔ (تہذیب جلد ۱ ص ۱۲۱) کہ مسکین کو سعید کی روایت میں ضبط کیوں سے تصیب ہوا؟ اور اس سند میں روایت ثابت بن عجلان سے ہے نہ کہ سعید سے۔ امام احمد اور ابن معین ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ رقم اور نسائی لیس بد بائس سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۳ ص ۱۲۱) لہذا ان کا ذکر عقربہ سے لگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباسؓ کی سابق روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول فرضی ہے۔ اور اس روایت میں وہ عموم الفاظ کے پیش نظر جمعہ اور عیدین کی نماز اور خطبہ وغیرہ کا حکم بھی استماع و انصات بیان کرتے ہیں اور اس کی پوری تحقیق اپنے مقام پر آئے گی کہ نصوص میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ نہ کہ خصوص اسباب کا۔ اور یہ کہ کوئی آیت شان نزول پر مقید نہیں ہوتی۔ اسی طرح کے مضمون کی روایت حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن مغفل وغیرہ سے بھی مروی ہے کہ اس آیت کا حکم امام کے پیچھے اقتداء کرنے والا کو ہے۔ مگر حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے بعد کچھ کہنے کی مطلقاً حاجت باقی نہیں رہتی، کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر کے متعلق ان کا مقام تمام حضرات صحابہ کرامؓ سے علی الاطلاق بہت اونچا اور بلند ہے اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایتیں سونی صدی صحیح ہیں جیسا کہ آپ پوری تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ مصنف خیر الکلام سے نہ تو جواب بن سکا ہے اور نہ خاموشی گوارا فرما سکے ہیں کیونکہ ملا آں باشد کہ چپ نشود۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض حنفیہ نے آیت کے شان نزول میں صحابہ کرامؓ سے صرف دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک عبداللہ بن مسعود کا قول ہے۔ دوسرا عبداللہ بن عباسؓ کا ہے حالانکہ ابن عباسؓ سے بسند صحیح اور ابن مسعودؓ سے پانچ اسانید کے ساتھ اگرچہ بعض اسانید میں انفرادی طور پر کچھ کلام ہے مگر مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت خلف الامام کے قائل تھے پس ان دو صحابہ سے صرف اس قدر مروی ہونے سے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت نمازی کو قرأت سے روکنے کے لیے ہے۔ (محصل خیر الکلام ص ۳۳۳، ص ۳۳۴)

الجواب:

روایت تو صرف ایک صحابی کی بھی کافی ہوتی ہے جب کہ سند صحیح ہو آپ کو دو صحابہ کی روایت سے کیوں تسلی نہیں ہوتی؟ اور یہ روایتیں صحیح اسانید کے ساتھ ہیں اور ہیں حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے جو فن تفسیر میں پہلا درجہ رکھتے ہیں اگر ان کی روایتیں معتبر نہیں تو نہ معلوم آپ کے نزدیک کس کی مروی روایتیں معتبر ہوں گی؟ یقین رکھیے کہ یہ کوئی جواب نہیں ہے ممکن ہے کہ آپ کے حواری اس قدر مطمئن ہو جائیں مگر ایک رتی جان بھی اس میں نہیں ہے باقی حضرت ابن مسعودؓ سے ایک روایت بھی قرأت خلف الامام کے جواز کی ثابت نہیں تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے اور

حضرت ابن عباس کی روایتیں متعارض ہیں۔ صحیح روایت ترک قرأت کی ہے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اور اپنے مقام پر آگے بھی آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد ہم بعض تابعین کی چند روایات اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر میں قرآن، حدیث اور صحابہ کے بعد تابعین کی تفسیر قابلِ حجت ہے اور یہی اکثر ائمہ سے منقول ہے۔ خصوصاً مجاہد بن جبر کی تفسیر کیونکہ وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے۔ جب مجاہد کی تفسیر تھامے پاس پہنچ جائے تو پھر کسی کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اور ان کے بعد سعید بن جبیر، عکرمہ، عطارد بن ابی رباح، حسن بصری، مسروق، سعید بن المسیب، ابوالعلاء ربیع بن انس، قتادہ اور ضحاک بن مزاحم وغیرہ کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۵۱۴)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں: وھکذا تفسیر التابعی حجة (الجنمہ ۹۶) صحابی کی طرح تابعی کی تفسیر بھی حجت ہے۔

حضرت مجاہد بن جبر: (المتوفی ۱۲۰ھ) سے

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ

لے علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ، عالم، ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ (طبقات ابن سعد ۵ ص ۲۴۴) امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا طرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۵) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلال پر سب کا اتفاق ہے۔ خصیفاً کا بیان ہے کہ مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۵) جبرالامت حفرة ابن عمرؓ ان کے حفظ کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے کہ کاش نافع کا حفظ تمہاری ہی طرح ہوتا (شذرات لکذ جلد ۱ ص ۱۲۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمة التابعین والمفسرین تھے اور حضرت ابن عباس کے ارشد تلامذہ میں تھے اور اپنے زمانہ میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے (البدایة والنہایة جلد ۹ ص ۲۲۴) اور ان کے فقہی کمال کے لیے یہ سند کافی ہے۔ کہ مخزن علوم مکہ کی جماعت افتار کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۳۳) نواب صاحب لکھتے ہیں: ابن تیمیہؒ گفتہ اعلم الناس بالتفسیر اہل مکہ لانہم اصحاب عبد اللہ بن عباس کما جہد۔ آگے لکھتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ اور دیگر اہل علم نے ان کی تفسیر پر کئی احتیاج کیا ہے (اکسیر ص ۱۱)

لے یہ وہی امام ہیں جن کو الحاکم کہتے ہیں اور جن کی کتاب مستدرک شائع ہو چکی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہم سے حافظ ابو علی حسینؑ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو علی امویؑ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن ابوبکر مقدمیؑ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یحییٰ بن سعیدؑ نے بیان کیا۔ وہ سفیانؑ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوشامہ اسماعیل بن کثیرؑ نے بیان کیا۔ وہ مجاہد بن جبرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ اذا قرئ القرآن فاستمعوا له قال في الصلوة۔ (کتاب القراءة ص ۷۳) و اذا قرئ القرآن..... الآية

دوسری روایت:

امام بیہقیؒ سے لے کر محمد بن ابوبکر مقدمیؑ تک وہی سند ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے اشعث بن عبد اللہؑ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے (بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ اکبیر اور امام الحدیث تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۶) لہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اتقان، ورع، مذاکرہ ائمہ اور کثرت تصنیف میں گورے سبقت لے گئے تھے (بعدادی جلد ۸ ص ۷۷) ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور محدث اسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۱)۔ لہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقا اور محدث جزیرہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۳۶)

لہ امام یحییٰ بن سعید بن القطانؑ اور ابو زرؑ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؑ ان کو صالح الحدیث اور ابن قانعؑ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷۹)

لہ امام الجرح والتعلیل ذہبیؒ ان کو الامام العلم اور تید الحفاظ لکھتے ہیں۔ نسائیؑ فرماتے ہیں کہ مالکؑ و شعبہؑ اور یحییٰ بن سعید حدیث رسول کے امین تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۷) علامہ ابن سعدؑ رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، مثبت، حجت، بلند مرتبہ اور مامون تھے۔ خلیلؑ لکھتے ہیں وہ بلا کسی اختلاف کے مسلم امام تھے (تہذیب ۱۱ ص ۲۱۹)

لہ امام سفیان ثوریؑ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

لہ امام احمدؑ، نسائیؑ، یعقوب بن شیبہؑ، یعقوب بن سفیانؑ اور علیؑ سب ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابن سعدؑ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؑ ان کو صاحب الحدیث لکھتے ہیں اور ابن جبانؑ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۷)

لہ امام ابن معینؑ اور ابو داؤدؑ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ امام نسائیؑ لا باس یہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن جبانؑ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۶)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرآن کرنا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں معمول نہ تھا۔ ورنہ صرف ایک ہی انصاری کے پڑھنے کا کیا مطلب ہے اور جب حکم نازل ہوا تو نہ پڑھنے والوں کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ منع کیا تو پڑھنے والے ہی کو منع کیا اور آیت کا شان نزول بھی حضرت مجاہد نے وضاحت سے بیان فرما دیا ہے اور اسی مضمون کی ایک روایت امام زہری سے بھی منقول ہے۔ (کتاب القراءات ص ۷۵)

حضرت امام بیہقی اور مبارک پوری صاحب نے وغیرہ نے اس اثر کو منقطع کہہ کر گلو خلاصی کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جو بے سود ہے۔ اولاً اس لیے امام ابن مہنی فرماتے ہیں: کہ مجاہد کا مرسل عطار کے مرسل سے مجھے کہیں زیادہ پسند ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۰۲) امام سبئی بن سعید القفطان کہتے ہیں: مجاہد کا مرسل مجھے طاؤس کے مرسل سے زیادہ پسند ہے۔ (تدریب الراوی ص ۷۰ و کتاب العلل ترمذی ص ۳۲۹) جب ائمہ جرح و تعدیل ان کے مرسل پر کامل اعتماد کرتے ہیں۔ تو نفاذ خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

وثانیاً علماء اخاف کے نزدیک اور جہور اہل اسلام اور دوسری صدی سے قبل تمام محدثین کرام کے نزدیک تنہا مرسل قابل حجت ہوتا ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ اور جب دوسری روایات سے (گو مرسل ہی کیوں نہ ہوں) وہ معتضد اور قوی ہو جاتے تو فریق ثانی کے نزدیک بھی وہ حجت ہے۔ اور مبارک پوری صاحب کو اس کا اقرار ہے (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۹) اور اگر حضرت ابن مسعود و ابن عباس وغیرہ کی صحیح روایات سے مجھے انقطاع کا یہ بہانہ رفع

(مجھے صفحہ کا حاشیہ ۵) ابن ابی نجیح، امام احمد، ابو زرعہ، ابن معین اور نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن جبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام سفیان اور ابو حاتم ان کی تفسیر کی بڑی قدر کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۵۳)

لے جو پہلے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں جن کا استدلالی رنگ نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۵ میں) ناکام بہانہ کیا ہے حضرت مجاہد اور ان دونوں حضرات صحابہ کے اثر میں شان نزول ہونے کے بارے میں کوئی فرق نہیں ہے اور جہور حضرات صحابہ ان کے ساتھ ہیں جیسا کہ ان کا مرسل تحت ہے اس طرح ان کی تفسیر بھی حجت ہے اور کسی صحیح روایت ان کا قرآن خلف الامام کرنا ثابت نہیں ہے۔ جزیرہ القراءۃ ص ۱۰۰ کا حوالہ بالکل بے سند ہے۔ اس لیے اس کو اس صحیح اور مستند روایات کا جواب تصور کرنا بے سود ہے۔

نہ ہو۔ تو کسی دوسرے جہان اور دوسری جون کی انتظار کیجیے۔

وَالشَّامُ امام شافعیؒ، بخاریؒ، ابن تیمیہؒ وغیرہ کلی طور پر مجاہد کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں اور نواب صاحب کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ لہذا ان کا یہ عذر بار بار اور رکیک تاویل قابل سماعت نہیں ہے حضرت مجاہد کی اور بھی متعدد روایات باسانید صحیحہ مروی ہیں مگر ہم صرف ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں: وفيها كفاية لمن له هداية۔

حضرت سعید بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ موصیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمد بن ابوبکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبدالرحمن بن محمدؒ

لے امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن حبانؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ

میں اہل مدینہ کے سردار تھے۔ (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۲۲)۔ حافظ ذہبیؒ ان کو امام شیخ الاسلام اور اجلہ

تابعین میں لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۸) ابن حنبلؒ لکھتے ہیں کہ ان کی ذات میں حدیث، فقہ، زہد و ورع اور عبادت

اور جملہ علمی و عملی کمالات جمع تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۳) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ علی الاطلاق وہ

سید التابعین تھے اور حضرت ابن عمرؓ ان کو احد المتفقین کہتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۹۹)

امام یحییٰ بن سعیدؒ فرمایا کرتے تھے۔ ہم قرآن کی تفسیر میں رائے کو دخل نہیں دیتے صرف وہی کہہ سکتے ہیں۔

جس کا ہمیں علم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۸) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کے تمام مراسیل صحیح ہیں۔ (تذکرہ

جلد ۱ ص ۵) امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ تمام مراسیل میں صحیح تر مراسیل ان کے ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲۵)

امام بیہقیؒ ان کے مراسیل کو اصح المراسیل کہتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۲۱) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مراسیل

میں سے صحیح ترین مرسل سعید بن المسیبؒ کا ہے (توجیہ النظر ص ۱۶) امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مراسیل

صحیح ترین ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۳) امام شافعیؒ باوجودیکہ وہ دیگر تابعین کے مراسیل میں کلام کرتے ہیں مگر

حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح وہ سعید بن المسیبؒ کے مرسل کو حجت اور صحیح مانتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۳۵)

لے ذہبیؒ ان کو حافظ الکبیر الامام العلم اور الشہیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۸) علی بن المدینیؒ کا بیان ہے کہ ان سے

بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ اگر میں رکن حطیم اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہوں تو قسم کھاؤں تب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے

ان جلیلان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات ص ۳۵) تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۲۵) علامہ سمعانیؒ لکھتے ہیں کہ

پختہ کار حافظ صاحب تقویٰ اور جامع حدیث تھے۔ (کتاب الانساب ص ۲۶)

نے بیان کیا۔ وہ حماد بن سلمہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ قتادہ سے اور وہ سعید بن المسیب سے وہ فرماتے ہیں واذ قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب الفکرۃ ص ۵۷) کہ آیت واذ قرئ القرآن الآیۃ کا شان نزول نماز ہے۔

حضرت حسن بصریؒ (المتوفی ۱۱۰ھ)

امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علی نے بیان کیا وہ بیان کرتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ الموصلی نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمد بن ابوبکر مقدمی نے بیان

لہ علامہ ذہبی ان کو امام، الحافظ، الحدیث اور شیخ الاسلام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۹) آخر میں ان کے حافظہ میں معمولی فتور آ گیا تھا۔ (تقریب ص ۱۸) لیکن اس سے ان کی حدیث اور روایت پر مطلقاً اثر نہیں پڑتا۔ اس کی مزید تحقیق اپنے مقام پر آئے گی، امام احمد فرماتے ہیں جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ حماد بن سلمہ کے حق میں کچھ کہتا ہے تو اس کو منافق سمجھنا (فاتحہ علی الاسلام) تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹) یہی الفاظ امام ابن معین سے بھی منقول ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۷) نواب صاحب لکھتے ہیں: گریم حماد بن سلمہ امام است تفروش مادام کہ در مردیش مانع از اصول نبوی و مفسر نیست۔ (بدور الابلہ ص ۳۳)

۲۷ حضرت قتادہ کا ترجمہ جلد ۱ ص ۲۲۵ میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

۲۸ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ جامع کمالات عالم بلند مرتبہ رفیع المنزلت، فقیہ مامون عابد زاهد وسیع العلم فصیح و بلیغ، حسین اور جلیل تھے۔ (طبقات جلد ۱ ص ۱۱۵) علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ علم کا سمندر فقیہ النفس کبیر الشان عدیم النظر اور بلیغ التذکیر تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۲) امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب السائر جلد ۱ ص ۱۶۱) ابوبکر الہندی کا بیان ہے کہ جب تک وہ ایک سُورۃ کی تفسیر اور شان نزول وغیرہ سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کر لیتے تھے۔ اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے۔ (شذرات جلد ۱ ص ۱۳۷) فقہ کے بہت بڑے امام تھے اور بصرہ کے مفتی اعظم تھے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ حسن بصری حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۱۸) قسم اول، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ امام الفقیہ المشہور احد الثبعین الکبار، الاجلار اور علم و عمل اور اخلاص میں یکتا تھے (البیہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۶۸) نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں۔ حسن بصری و محمد بن کعب القرظی و ابوالعالیہ الریاضی وغیرہ میں ہماقدار مفسرین اند و غالب اقول ایشان متعلق از صحابہ بودہ است۔ (اکسیر ص ۱۱)

کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یوسف بن یعقوب نے بیان کیا وہ شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ منصور سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت حسن بصری سے۔ انہوں نے فرمایا: واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا فی الصلوٰۃ۔ (کتاب القراءۃ ص ۵۸) کہ واذا قرئ القرآن کاشان نزول نما ہے۔

حضرت ابو العالیہ الریاحی (نام رفیع بن مهران تھا۔ المتوفی ۳۹ھ)

امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ (موصلی) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے محمد بن ابوبکر مقدسی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الوہاب نے بیان کیا۔ وہ حاجز سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو العالیہ الریاحی سے، انہوں نے فرمایا:

امام ابن معین، ابو داؤد، یعقوب بن شیبہ اور خلیفہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو شیخ کہتے ہیں اور ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳) باقی جملہ روایات کی توثیق چلے نقل کی جا چکی ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعین میں تھے۔ ابو القاسم طبری کا بیان ہے کہ ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۵۱) ابوبکر بن ابی داؤد کا بیان ہے کہ حضرات صحابہ کے بعد ابو العالیہ سے بڑھ کر عالم قرآن کوئی نہ تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۸) ابن حبان ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں (شذرات جلد ۱ ص ۱۰۲) علامہ ابن سعد ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۱ ص ۸۵) خود امام بیہقی ان کی تمقہ فی الصلوٰۃ کی حدیث کے علاوہ باقی تمام احادیث کو صحیح اور مستقیم تسلیم کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۲۴) امام علی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کبار تابعین میں تھے۔ امام ابن عدی فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف فی الصلوٰۃ کے علاوہ ابو العالیہ کی باقی تمام احادیث مستقیم اور صالح ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۸۵) مولیٰ طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعین میں تھے، ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے صرف دو سال بعد مسلمان ہوئے تھے اور حضرت ابوبکر کے پاس گئے تھے اور حضرت عمر کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور قرآن کریم حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عباس سے پڑھا تھا اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ تین مرتبہ انہوں نے قرآن کریم حضرت عمرؓ پر پیش کیا تھا۔ (مفتاح السعادة جلد ۱ ص ۳۶۲) اور اسی کے قریب تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۸۵ میں ہے۔ (نمبر ۳ اور نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا
صلى قرأ فقراً اصحابه فنزلت
فاستمعوا له الآية فسكت القوم و
قرأ النبي صلى الله عليه وسلم -
(كتاب القراءة ص ۷)

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے
تو ساتھ ساتھ آپ کے حضرات صحابہ بھی قرأت کرتے تھے۔
جب واذا قرئ القرآن (الآیۃ) نازل ہوئی تو حضرات
صحابہ کرام نے خاموشی اختیار کر لی اور جناب رسول خدا صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأت کیا کرتے تھے۔

امام بیہقی^{رحمۃ اللہ علیہ} علامہ حازمی (المتوفی ۷۵۰ھ) اور مبارک پوری صاحب^{رحمۃ اللہ علیہ} وغیرہ نے اس روایت کے
منقطع ہونے کا ناکام بہانہ کیا ہے اور یہی کچھ مولف خیر الکلام نے ص ۵۵ میں کہا ہے لیکن یہ
صحیح نہیں ہے۔ اولاً: اس لیے کہ مرسل حجت ہے اور مرسل معتضد بلا اختلاف حجت ہے جیسا
کہ بیان ہو چکا ہے۔

وثانیاً: اگر اس کو ابو العالیہ کی تفسیر بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں جس کی تائید
کئی محقق مفسرین کرام سے آگے آ رہی ہے۔ خود مولف خیر الکلام ص ۷۷ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ
مگر معترض کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی آیت کی تفسیر اگر کسی تابعی سے ثابت ہو اور ایک بڑے
مفسر نے بھی اس کی تصدیق کی ہو اور کسی صحابی اور تابعی سے اس کی تردید وارد نہ ہوتی ہو
تو اس کی صحت میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اور اسی صفحہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ایک تفسیر کے
مقابلہ میں محض شکل سچ بات بنانا درست نہیں۔ لہذا ان کو اپنے تجویز کردہ نسخہ پر عمل کرنا چاہیے
کہ بیہنگ لگے نہ پھٹک لے۔

حضرت امام زہری^{رحمۃ اللہ علیہ}:

امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

۱۴ ان کا ترجمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی ذیل میں نقل کر دیا گیا ہے۔

۱۴ ما جبر بن مخلد کو امام ابن معین صحیح لکھتے ہیں۔ محدث ساجی ان کو صدوق لکھتے ہیں۔ اور نیز لکھتے ہیں کہ وہ معروف
و مشہور تھے۔ ابن جبران ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۲۳) باقی روایات کا حال اور توشیح
آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

۱۴ امام زہری اور امام عبد اللہ بن مبارک کا ترجمہ مقدمہ میں عرض کیا جا چکا ہے اور بقیہ روایات کا عنقریب گزر چکا ہے۔
(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

حافظ ابوعلی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حسن بن سفیان نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حبان بن موسیٰ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبداللہ بن مبارک نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یونس نے بیان کیا وہ امام زہری سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ

قال لا یقرأ من وراء الامام فیما یجہر بہ الامام یکفیلہم قرأۃ الامام وان لم یسمعہم صوتہ ولکنہم یقرؤون فیما لا یجہر بہ سرّاً فی انفسہم ولا یصلح لاحد خلفہ ان یقرأ معہ فیما جہس بہ سرّاً ولا علانۃ قال اللہ واذ قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون

امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدیوں کو قرات کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ امام کا پڑھنا ہی مقتدیوں کو کافی ہے۔ چاہے وہ مقتدیوں کو کچھ بھی نہ سنا تاہو ان کو نہ تو جہر سے پڑھنا جائز ہے اور نہ آہستہ۔ ہاں ستری نمازوں میں وہ اپنے دل میں قرات کر سکتے ہیں اور جہری نمازوں میں اس لیے منع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہو تو تم خاموش رہو کہ اس کی طرف توجہ کرنا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

(کتاب القراءۃ ص ۵)

ستری اور جہری نمازوں کا بیان اپنی جگہ پر ہوگا۔ لیکن بہر حال امام زہری بھی آیت مذکورہ کا شان نزول مسئلہ قراءۃ خلف الامام بتاتے ہیں۔ سکناات میں پڑھنے کا کسی صحیح حدیث سے ثبوت نہیں اور یہ استدلالی رنگ نہیں بلکہ شان نزول ذکر ہو رہا ہے۔ مرسل زہری اگرچہ تنہا حجت نہیں ہوتا مگر اس سے دیگر مراسیل کی تائید مطلوب ہے اور دوسرے مراسیل کے ساتھ مل کر یہ مرسل مسئلہ زیر بحث پر صراحت سے روشنی ڈالتے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا باقی) صرف تین راوی باقی ہیں۔ ان کی تشریح سن لیجئے۔ حسن بن سفیان علامہ ذہبی ان کو حافظ الامام ابو شیخ خراسان کہتے ہیں۔ امام حاکم کا بیان ہے کہ وہ خراسان کے محدث اور اپنے تمام معاصرین پر ثبوت، کثرت روایت، فہم، فقہ، ادب اور دیگر علوم میں فائق تھے۔ (تذکرہ ص ۲۵۵)۔ حبان بن موسیٰ، ابراہیم بن الجعدی ان کی لا باس بہ سے تشریح کرتے ہیں۔ ابن حبان ثقافت میں کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۵۵) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۶) یونس بن یزید علامہ ذہبی ان کو حافظ اور الثبت کہتے ہیں۔ اور احمد بن صالح کا بیان ہے کہ ہم امام زہری کے تلامذہ میں یونس کو ترجیح نہیں دیتے۔ امام احمد فرماتے تھے کہ وہ ثقہ ہیں۔

(تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۳)

عبد بن عمیر (المتوفی ۳۷ھ) اور عطاء بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۷ھ)؛
 امام ابن جریر فرماتے ہیں ہم سے حمید بن مسعد نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے بشر بن الفضل
 نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے جریر بن عمیر نے بیان کیا۔ وہ طلحہ بن عبد بن کریم سے روایت کرتے ہیں۔
 وہ کہتے ہیں میں نے عبد بن عمیر اور عطاء بن ابی رباح کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ حالانکہ ایک
 واعظ وعظ کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ ذکر کیوں نہیں سنتے اور کیوں وعید کے مستوجب
 ہو رہے ہیں؟ لیکن ان دونوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ میں
 نے پھر کہا۔ انھوں نے پھر میری طرف دیکھا اور باتوں میں مشغول ہو گئے میں نے سہ بارہ ان سے
 کہا۔ مگر ان دونوں نے کہا:

انما ذلك في الصلوة يعني واذا
 قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا
 یعنی جو آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له
 وانصتوا تمہارے پیش نظر ہے۔ اس کا شان نزول
 (تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص ۶۲۳) نماز ہے نہ کہ وعظ وعام تلاوت۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے باتیں کرنا اور قرأت کرنا ممنوع ہے کیونکہ یہ استماع والنصا
 کے خلاف ہے اور اس آیت کریمہ کا شان نزول ہی نماز ہے۔ خارج از نماز باتوں کو یہ شامل نہیں ہے۔

۱۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ عالم، واعظ اور کبیر القدر تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۵) امام ابن معینؒ اور ابو زرؒ
 کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ عجمی ان کو ثقہ من کبار التابعینؒ کہتے ہیں۔ حضرت ابن
 عمرؓ کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۷۱)

۲۔ ذہبیؒ ان کو مفتی اہل مکہ اور محدث، القدرہ اور العلم لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۲) ابن حبانؒ ان کو
 علم فقر و رع اور فضیلت میں تابعین کے سردار لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو ثبت، مجتہد، امام اور کبیر الثقات
 لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۰۷) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار اور ثقات و بلند پایہ
 تابعین میں تھے۔ دو سو صحابہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ نیز ابن سعدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ثقہ،
 فقیہ عالم اور کبیر الحدیث تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۰۷)

۳۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائی ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۹)

۴۔ امام ذہبیؒ ان کو امام، الثقفہ، الحافظ اور العابد کہتے ہیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بصرہ میں ثبت ان پر ختم تھا۔
 (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۷) (باقی نمبر ۶۵ کے صفحہ پر دیکھئے)

حضرت محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۱۸۸ھ) :

امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے ابو نصر عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن قتادہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو منصور عباس بن فضل نصری نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے احمد بن محمد نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے سعید بن منصور نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو معشر نے بیان کیا۔ وہ محمد بن کعب (القرظی) سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرامؓ ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ جب آپ قرأت کرتے تھے تو وہ بھی ساتھ ساتھ قرأت

(نمبر ۵ و پچھلے صفحہ کے حاشیے) ۵ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۲۷)

۱ امام احمد اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن جبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۲)

۲ ابن جبانؒ کہتے ہیں کہ وہ علم و فقر میں مدینہ کے فاضل ترین علماء میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۴۲) امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ وہ بڑے اور ائمہ تابعین میں تھے (تہذیب الاسما جلد ۱ قسم اول ص ۹) حافظ عجمیؒ ان کو ثقہ، رجل صالح اور عالم قرآن کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ، عالم اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ عون بن عبد اللہؒ کا بیان ہے کہ میں نے تفسیر قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۲) تہذیب التہذیب، جلد ۹ ص ۴۲)۔ علامہ ذہبیؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں۔ (دول الاسلام جلد ۵ ص ۵۷) حافظ ابن کثیرؒ ان کو عالم تفسیر قرآن، صالح اور عابد لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۵) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی تھی کہ بنو قریظہ میں ایک شخص پیدا ہوگا جو فن تفسیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا ہوگا۔ ائمہ کا خیال ہے کہ یہ محمد بن کعب قرظیؒ کے حق میں تھی۔ (البدایہ جلد ۶ ص ۲۴)۔ مولانا مبارک پوریؒ حنا لکھتے ہیں: مدینہ طیبہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلمؒ جیسا مفسر قرآن کوئی اور نہ تھا۔ (تحفۃ الاحوذ جلد ۱ ص ۴۱)

۳ امام بیہقی کے شیخ ہیں۔ ان کی سند سے ایک حدیث کی امام بیہقی تصحیح کرتے ہیں (دیکھیے سنن الکبریٰ ج ۱ ص ۱۶۹)

۴ ثقہ اور مشہور تھے (تقریب ص ۱۹۱) امام دارقطنیؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان پر کسی کی جرح منقول نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۵۸) امام ابو حاتمؒ ان کو ثقہ من الثبتین الاثبات کہتے ہیں۔ ابن نمیرؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ خلیلیؒ کہتے ہیں ان کے ثقہ ہونے پر سبک اتفاق ہے (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۹۹-۱۰۰) ابو معشرؒ کو بعض محدثین روایت حدیث (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کرتے جاتے۔ اس پر سورۃ اعراف کی یہ آیت نازل ہوئی:

واذ قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الذیۃ) (کتاب القراءۃ ص ۱۷۷) کرو اور خاموش رہو۔

حدیث مرسل:

مرسل حدیث سے احتجاج اور عدم احتجاج کی بحث اسی کتاب میں آگے اپنے مقام پر آ رہی ہے (انشاء اللہ تعالیٰ) یہاں بقدر ضرورت تھوڑی سی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ بات ذرا واضح ہو جائے اور یہ حوالے آگے ذکر نہ کیے جائیں گے تاکہ ٹکرا کر لازم نہ آئے۔ امام سیوطیؒ علامہ قاسم بن قطلوبغا محدث جزائریؒ اور مولانا خٹمانیؒ نقل کرتے ہیں:

کمزور سمجھتے تھے۔ مگر امام احمد ان کو صالح محلہ الصدق کہتے تھے۔ ابن معین کہتے ہیں۔ ان سے حدیثیں لکھی جاسکتی ہیں۔ ابو زرؓ ان کو صدوق فی الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں ان سے بڑے بڑے ثقافت نے روایات کی ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۲۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۲۷) امام نعیمؒ ان کو کتیب اور حافظ کہتے ہیں (تہذیب ص ۲۲۷) علامہ ذہبیؒ ان کو علم کا ظرف کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے ان سے احتجاج کیا ہے (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۶) حافظ بن حجرؒ ان کو ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی بتاتے ہیں (تہذیب ص ۲۱۹) ان کے متعلق یہ اختلاف صرف روایت حدیث کے بارے میں ہے فن تفسیر میں وہ بلا اختلاف اور بلا ملاحظہ مسلم امام تھے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن عثمان بن ابی شیبہؒ، امام علی بن المدینیؒ اور عمرو بن علی انفساس وغیرہ کہتے ہیں کہ ابو معشرؒ کی وہ روایات جو تفسیر کے سلسلہ میں ہیں اور خاص طور پر وہ جو محمد بن قیسؒ اور محمد بن کعبؒ سے نقل کرتے ہیں۔ وہ بلا چون و چرا صحیح، معتبر اور قابل حجت ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۲۷ و ص ۲۲۱) محصلہ) مبارک پوری صاحب نے ان کی جو تضعیف نقل کی ہے وہ ان کے لیے چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ محدثین جب ان کو کمزور کہتے ہیں تو صرف روایت حدیث کے بارے میں اور ہم نے جو روایت نقل کی ہے وہ تفسیر کے بارے میں ہے اور خاص طور پر محمد بن کعب قرظیؒ سے ہے اور ان کی روایت کو اس میں میں بلا قبل و قال محدثین تسلیم کرتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق محدثین کی جرح تو نقل کر دی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۵۹) مگر تفسیر کے بارے میں ان کی روایت کے قابل اعتبار ہونے کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے اور لکھتے ہیں کہ جس حدیث کو محدثین کی شرائط کے مطابق محمد بن کعبؒ سے بیان کریں ان سے چند

وقال ابن جریر اجماع التابعون
 باسره علی قبول المرسل ولم یأت عنہ
 انکاره ولا عن احد من الائمة بعدہ الى
 رأس المائتین قال ابن عبد البر کانه یعنی
 الشافعی اول من ردہ اھ (تدریب اللوگ
 ص ۲۳۵ منیة الالمعی ص ۲۰۰ توجیہ النظر
 ومقدمہ فتح الملہم ص ۳۲)

امام ابن جریر نے فرمایا کہ تابعین سب کے سب اس
 امر پر متفق تھے کہ مرسل قابل احتجاج ہے تابعین سے
 لے کر دوسری صدی کے آخر تک ائمہ میں سے کسی نے
 مرسل کے قبول کرنے کا انکار نہیں کیا۔ امام ابن عبد البر
 فرماتے ہیں کہ گویا امام شافعی ہی پہلے وہ بزرگ ہیں جنہوں
 نے مرسل کے ساتھ احتجاج کا انکار کیا ہے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ دوسری صدی کے آخر تک تابعین اور ائمہ دین میں
 سے کوئی بھی مرسل حدیث سے احتجاج کا منکر نہ تھا۔ تعجب ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک یہ اجماع و حجت
 نہیں لیکن دوسری صدی کے بعد کا نظریہ قابل قبول ہے اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اور امت کی
 اکثریت کا لحاظ قرن اول میں لیا جائے گا..... الخ ص ۵۳)

المحدث تعالیٰ کہ قرن اول والے مرسل کو بلا قیل وقال تسلیم کرتے تھے۔ اور اس پر ان کا اجماع ہے۔
 نواب صدیق حسن خاں صاحب اور علامہ جزائری لکھتے ہیں:

حدیثیں صالح پائی گئی ہیں..... الخ مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محدثین کرام ہی ان کی محمد بن کوئی سے
 روایتوں کو صالح کہتے ہیں اور یہ بھی انہیں میں سے ہے اور بالکل صالح ہے اور امام کے پیچھے قرأت ترک
 کرنے کے سلسلے میں ہے قرأت ہو یا کلام ہو جو ہر ہو یا آہستہ اور اس کا شان نزول ہی یہ بتاتے ہیں۔ قاضی
 مقبول احمد صاحب کو بلا وجہ غصہ آ گیا ہے کہ اس کو امام بخاری منکر الحدیث کہتے ہیں اور مصنف احسن الکلام
 خود لکھتا ہے کہ جس کو امام بخاری منکر الحدیث کہیں اس سے روایت نہیں لی جاسکتی۔ (محصلہ الاعتصام ،
 ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء) لیکن محدثین نے ان کی تفسیر کی روایت کو اور اسی طرح تاریخی روایت کو حجت مانا ہے۔
 تفسیر کے بارے میں تو حوالہ گزر چکا ہے تاریخ کے متعلق سنیں۔ امام خلیل فرماتے ہیں:

وتاریخہ احتجاج بہ الائمة وضعفہ فی الحدیث اھ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۲۲)

اور ان سے تاریخ میں ائمہ نے احتجاج کیا ہے اور حدیث میں اس کو اس کو ضعیف سمجھا ہے جیسا کہ محمد بن اسماعیل
 کہ حدیث احکام میں ضعیف ہے مگر بخاری کا امام ہے۔ اس کے احادیث احکام میں ضعیف ہونے سے اس کے تاریخ
 میں معتبر ہونے پر کیا زور پڑتی ہے؟ فکذا ہذا۔

مراسیل کے ساتھ گذشتہ زمانہ میں علماء و اہل
کیا کرتے تھے۔ مثلاً امام سفیان ثوری، امام مالک
اور امام ابو داؤد جب امام شافعی آئے تو انہوں نے
مرسل کی حجیت میں کلام کیا۔

واما المراسیل فقد كان يحتج بها
العلماء فيما مضى مثل سفیان الثوری
ومالك والذہبی حتی جاء الشافعی فکلم
فیه اه

۲۳۹۵
المحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ من توجیہ النظر

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ

فاذا لم یکن مسند ضد المرسل
ولم یوجد مسند فالمرسل یحتج به
ولیس هو مثل المتصل فی القوة۔

(رسالہ ابو داؤد، ص ۵)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ مراسیل سے احتجاج اور عدم احتجاج کے بارے میں بحث کرتے
ہوئے لکھتے ہیں کہ

بہر حال مراسیل کے قبول اور رد کرنے میں لوگوں
نے اختلاف کیا ہے اور صحیح تر قول یہ ہے کہ مراسیل
میں مقبول و مردود اور موقوف سبھی اقسام ہیں سو
جس کے حال سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ثقہ ہی سے
ارسال کرتا ہے تو اس کا مرسل قبول کیا جائے گا اور
جو ثقہ اور غیر ثقہ سب سے ارسال کرتا ہے اور
جس سے اس نے حدیث مرسل روایت کی ہے۔
اس کا علم نہیں تو ایسی مرسل حدیث موقوف ہوگی
اور جو مراسیل ثقات کی روایت کے خلاف ہوں تو
وہ مردود ہوں گے اور جب مرسل دو طریقوں سے
مردی ہو ایک مرسل الگ شیوخ سے اور دوسرا الگ

واما المراسیل قد تنازع الناس
فی قبولها و ردّها و اصحّ الاقوال ان
منها المقبول والمردود ومنها الموقوف
فمن علم من حالہ انه لا یرسل الا
عن ثقہ قبل مرسلہ ومن عرف انه
یرسل عن الثقہ و غیر الثقہ کان رسالہ
روایۃ عن من لا یعرف حالہ فہذا موقوف
وما کان من المراسیل مخالفا لما رواہ
الثقات کان مردودا و اذا کان المرسل
من وجہین کل من الراویین اخذ العلم
عن شیوخ اخر فہذا یدل علی صدقہ

فان مثل ذلك لا يتصور في العادة تماثل الخطأ فيه وتعمد الكذب احد
 تو یہ اس کے صدق پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عادتاً اس
 میں خطا اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کا تصور نہیں کیا
 (منہاج السنہ جلد ۲ ص ۱۱۱) جاسکتا۔

امام نوویؒ پہلے ان حضرات کا ذکر کرتے ہیں جو مرسل کو قابل استلال نہیں گردانتے۔ آگے ارشاد
 فرماتے ہیں کہ

ومذهب مالك وابي حنيفة واحمد
 واكثر الفقهاء انه يمتنع به ومذهب الشافعي
 انه اذا انضم الى المرسل ما يعضده
 احتج به وذلك بان يروى مستدلاً
 او مرسلًا من جهة اخرى او يعمل
 به بعض الصحابة واكثر العلماء اه
 امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد اور اکثر
 فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ مرسل قابل احتجاج ہے اور
 امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر مرسل کے ساتھ
 کوئی تقویت کی چیز مل جاتے تو وہ حجت ہوگا مثلاً
 یہ کہ وہ مسنداً بھی مروی ہو یا دوسرے طریق سے
 وہ مرسل روایت کیا گیا ہو یا بعض حضرات صحابہ کرام رض
 (مقدمہ نووی بر شرح مسلم ص ۱۱۱) یا اکثر علماء نے اس پر عمل کیا ہو

حضرت امام شافعیؒ نے یہ بحث اپنی کتاب الرسائل فی اصول الفقہ ص ۱۱۱ طبع بولاق میں
 کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ مرسل معتقد کے حجت ہونے کے امام موصوفؒ بھی قائل ہیں
 اور اس کی ان کے نزدیک چند شرطیں ہیں جن کا اختصار کے ساتھ امام نوویؒ نے تذکرہ فرمایا ہے
 ایک شرط یہ ہے کہ

وزاد في الاعتضاد ان يوافق قول
 صحابي او يفتي اكثر العلماء به مقتضاه
 امام شافعیؒ نے اعتضاد کے لیے یہ شرط زائد کیا
 کی ہے کہ وہ کسی صحابی کے قول کے موافق ہو یا اکثر علماء
 نے اس کے مقتضی پر فتویٰ دیا ہو۔ (تدریب الراوی ص ۱۱۱)

امام ابن الجوزیؒ اپنی کتاب التحقیق میں اور محدث خطیب بغدادیؒ اپنی تالیف
 الجامع فی ادب الراوی والسامع میں امام احمد بن حنبلؒ سے نقل کرتے ہیں۔

ربما كان المرسل اقوى من
 المسند۔ (شرح نقایہ جلد ۱ ص ۱۱۱ طبع بہند)
 بسا اوقات حدیث مرسل مسند سے قوی تر
 ہوتی ہے۔

اور عمد حاضر کے محقق علامہ زہرا ہدالکو شرمی (المتوفی ۱۲۵۷ھ) لکھتے ہیں کہ

والا محتاج بالمرسل كان سنة
متوارثة جرت عليه الامة في القدين
الفاضلة حتى قال ابن جبير رد المرسل
مطلقاً بدعت حدث في رأس المائتين اه
كما ذكره الباجي في اصوله وابن عبد البر
في التمهيد وابن رجب في شرح علل التمهيد
مرسل کے ساتھ احتجاج کرنا ایک ایسا متوارث طریق
تھا جس پر قرون فاضلہ میں امت عمل پیرا رہی ہے امام ابن
جریر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مطلقاً مرسل کو رد کر دینا بدعت
ہے جو دوسری صدی کے آخر میں ایجاد ہوئی جیسا کہ علامہ
باجی نے اپنے اصول میں اور ابن عبد البر نے تمہید میں اور
ابن رجب نے شرح علل التمهید میں ذکر کیا ہے۔

(تانیب الخطیب ص ۱۵ طبع مصر)

تقلید شخصی تو بقول فریق ثانی چوتھی صدی کے بعد کی بدعت ہے مگر مطلقاً مرسل کو رد کرنا دوسری
صدی کے بعد کی بدعت نکلی ان تمام اقتباسات سے یہ بات بالکل مبہین ہو چکی ہے کہ مرسل حدیث
کے حجت ہونے نہ ہونے کا جھگڑا تو دوسری صدی کے بعد سے تاپنوز چلا آیا ہے مگر دوسری صدی
تک ساری امت مرسل کو حجت سمجھتی تھی۔ لہذا محض مرسل کہہ کر ہستی کو غلامی چاہنا جیسا کہ فریق ثانی
کر رہا ہے آسان نہیں ہے حق بات یہ ہے کہ مرسل جبکہ اس کی سند صحیح ہو اور کسی مرفوع متصل روایت
کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ بالکل حجت ہے۔

بعض حضرات تابعین اور تبع تابعین کے مراسیل:

علمی اور تحقیقی طور پر بعض حضرات تابعین اور اتباع تابعین ایسے بھی ہیں جن کے مراسیل کو امت
مسلمہ نے مجبوشی قبول کیا ہے حتیٰ کہ خود حضرت امام شافعی نے بھی ان کو تسلیم کیا ہے اور وہی اس
کے رد کرنے میں پیش پیش ہیں۔ چنانچہ امام شافعی کا مشہور قول یہ بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت
سعید بن المسیب کے مرسل کو حجت مانتے ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۱۲۰)

اور امام ابن معین فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیب کے مراسیل اصح ترین ہیں۔

(تدریب ص ۱۲۳)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیب کے مراسیل صحیح ترین اور ابراہیم نخعی کے

(ایضاً ص ۱۲۳ و ۱۲۴)

مراسیل لا بأس بہا ہیں۔

اور امام ابن معین نے فرمایا کہ مر اسیل ابراہیم نخعی مجھے شعبی کے مر اسیل سے زیادہ محبوب ہیں۔
 (ایضاً ص ۱۲۳) اور امام المحثین علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ حسن بصری کے مر اسیل جن کو ان سے ثقہ
 راوی نقل کریں بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ (ایضاً) اور علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ مجھے مجاہد کے مر اسیل،
 عطاء کے مر اسیل سے کئی درجہ زیادہ پسند ہیں (ایضاً ص ۱۲۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مر اسیل
 ایک دوسرے کی نسبت سے صحیح تر ہوتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو فی نفسہ صحیح بلکہ اصح ہیں۔
 لہذا مؤلف خیر الکلام کا یہ بہانہ کہ ترجیح سے اعتماد سمجھ لیا حالانکہ ضعیف پر ضعیف کو بھی ترجیح ہوتی
 ہے۔ الی ان قال یاد رکھنا چاہیے کہ مرسل کو مرسل سے اس وقت قوت ہوتی ہے جب دونوں کبار تابعین
 سے ہوں..... الخ (ص ۳۵۳) محض اپنے قلب کی تسکین کا سامان ہے اور ناخواندہ حواریوں کو طفل تسلی
 دینا ہے اور بس کیونکہ ان مر اسیل میں مطلقاً بعض مر اسیل فی نفسہا صحیح ہیں اور اغتضاؤ کے لیے
 کیا تابعین کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ محض مؤلف مذکور کی اختراع ہے کیونکہ حضرات ائمہ ثلاثہ اور
 دوسری صدی تک کی ساری امت تو ویسے ہی مرسل کو حجت مانتی ہے اور امام شافعی مرسل
 مقتضد کو (جو بعض حضرات صحابہ کرام یا اکثر علماء کے عمل کے موافق ہو) حجت سمجھتے ہیں اور امام کے
 پیچھے قرأت کا ترک کرنا خصوصاً جہری نمازوں میں نہ صرف یہ کہ بعض حضرات صحابہ کرام کے عمل سے
 مؤید ہے بلکہ جہور صحابہ کرام کا یہی معمول تھا اور بقول حافظ ابن تیمیہ جہری نمازوں میں ترک قرأت پر
 اجماع امت ہے لہذا ہر حیثیت سے یہ مر اسیل حجت ہیں لا شک فیہا۔

فائدہ۔ اگرچہ بعض محدثین نے مرسل اور منقطع میں اصطلاحی طور پر کچھ فرق کیا ہے لیکن علامہ
 جزائری لکھتے ہیں:

وقد اطلق المرسل علی المنقطع من
 ائمة الحدیث ابو ذر عتہ و ابو حاتم
 والدارقطنی۔ ۱ھ (توجیہ ص ۲۲۳)

حدیث منقطع پر مرسل کا اطلاق ان ائمہ حدیث
 نے کیا ہے امام ابو ذر عتہ، امام ابو حاتم اور امام دارقطنی

مؤلف خیر الکلام نے حضرت مجاہد کے اثر کے بارے میں امام بیہقی کی کتاب القراءۃ ص ۷۲ کے
 حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ یہ منقطع ہے اور منقطع ضعیف کی قسم ہوتی ہے (محصلاً ص ۳۵۳)
 محض طفل تسلی ہے کیونکہ مرسل فی نفسہ صحیح قول کی بنا پر حجت ہے اور حکم منقطع و مرسل ایک

وغیر الامام رکتاب القراءة ص ۶۸ جزأ المقناة مثلا) امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔

جواب :- اس کی سند میں زیاد بن ابی زیاد جصاص ہے امام ابن معین اور ابن مدینی اس کو لیس
 بشی کہتے ہیں نسائی اور دارقطنی اس کو مترک کہتے ہیں ابوزرعہ اس کو واہمی کہتے ہیں علامہ ذہبی
 فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے (میزان جلد ۱ ص ۲۵۶) و تہذیب
 جلد ۳ ص ۳۶۸) مؤلف غیر الکلام نے بھی علامہ ذہبی کا حوالہ نقل کیا ہے (ص ۲۱۲) یہ روایت بھی نہایت
 کمزور اور ضعیف ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے لا تجوز صلاة الا بفتح الكتاب وآیتین
 فصاعدا (کتاب القراءة ص ۶۸) کہ نماز سورۃ فاتحہ اور دو آیتوں اور اس سے کچھ زیادہ کے بغیر صحیح
 نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں ایک تو خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور دوسرا اس میں وآیتین
 فصاعدا کی زیادت موجود ہے۔

لطیفہ :- حضرت عمران بن حصینؓ سے مرفوعاً ایک روایت مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک
 شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد
 آپ نے فرمایا کس نے میرے ساتھ نماز سعت اور باقتی پائی کی ہے؟ غرضیکہ آپ نے امام کے پیچھے قرأت
 کرنے سے منع کر دیا (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲) اس روایت پر فریق ثانی کی طرف سے جن میں امام دارقطنی
 بھی ہیں یہ اعتراض ہوا ہے کہ سند میں حجاج بن ارطاة ہے اور وہ ضعیف ہے ہم نے حجاج بن
 ارطاة سے کوئی روایت نہیں لی۔ لیکن فریق ثانی کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ حجاج بن ارطاة، ابوداؤد،
 ترمذی، نسائی اور مسلم وغیرہ کے روایات میں ہیں (ازالہ ستر ص ۱۱۱) علامہ ذہبی ان کا احد الاعلام اور علم کا
 ظرف لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۴۵) ابوزرعہ اور ترمذی ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص ۱۹۶)۔
 امام نووی لکھتے ہیں کان بارعافی الحفظ والعلم کہ حفظ اور علم میں وہ بلند پایہ رکھتے تھے۔
 و تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۵۳) امام ترمذی ان کی ایک حدیث کو حسن کہتے ہوئے تحسین کرتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۱۱)
 بلکہ ایک حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۱۲) افسوس ہے کہ ان کی روایت تو فریق ثانی کے
 نزدیک حجت نہیں ہے لیکن زیادہ کی روایت حجت ہے جو لیس بشی ہے اور اس کی تضعیف
 پر اجماع ہے ان کی ایک روایت یوں ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے سبح اسمہ ربك الا
 کی سورت آپ کے پیچھے پڑھی تھی (مسلم جلد ۱ ص ۱۴۲) نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۴) چونکہ لغت

توفیقی ہے اس لیے قرآن کو جہر کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اور پڑھنے والا بھی صرف ایک شخص تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے قرآن کی تلاوت میں کی تھی جو سب سے پہلے حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں کیا اور پوری تحقیق گزری ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور منازعت و مخالفت میں قرأت سورۃ فاتحہ اور دوسری تمام سورتیں یکساں ہیں کیونکہ علت ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحہ کو منازعت کے لیے متعین کر دینا اور سورۃ فاتحہ کو اس سے خارج تصور کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے جو بہر حال مردود ہے۔

حضرت ہشام بن عامر کا اثر: حمید بن ہلال سے مروی ہے وہ کہتے ہیں۔
 ان ہشام بن عامر قرآن فقیل لہ التقرآن کہ ہشام بن عامر نے قرأت کی ان سے پوچھا گیا کہ
 خلف الامام قال انا لنتقل رکاب القراء آپ امم کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں ہم
 مکہ والسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۲۸۱ یوں ہی کرتے ہیں۔

جواب: یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں البحر بہاری ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کذاب تھا وثالثاً اس بات میں اختلاف ہے کہ حمید بن ہلال کی ہشام بن عامر سے ملاقات ثابت ہے یا نہیں؟ امام ابو حاتم کہتے ہیں ملاقات ثابت نہیں ہے اور ان کی روایت مرسل ہے (دیکھئے ترمذیہ التذیب جلد ۲ ص ۲۱۷ و جلد ۱ ص ۱۱۱) وثالثاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے فریق ثانی کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ہے نہ کہ مطلق قرأت کا۔

حضرت معاذ بن جبل کا اثر: ایک سائل نے حضرت معاذ سے قرآن خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔

قال اذا قرأ فاتحاً بفاتحة الكتاب وقل هو الله احد واذا لم تسمع قارئاً ف نفسك ولا تؤذ من عن يمينك ولا من عن شمالك والسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹
 انہوں نے فرمایا کہ جب امم قرأت کرے تو تم بھی سورۃ فاتحہ اور قل هو الله احد پڑھا کر و اور جب اس کی قرآن نہ سنا تو دل میں پڑھا کر و دائیں اور بائیں پہلو والوں کو ازیت نہ دیا کرو۔

جواب: یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہو سکتا اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں احمد بن محمد

واقعہ ہے حافظ ابن حجرؒ ایک سند کے متعلق جس میں احمد بن محمدؒ واقع ہے لکھتے ہیں کہ سند باطل ہے اور اس سند کے راوی ضعیف ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ مجہول ہیں (لسان المیزان جلد ۶ ص ۲۱۴) و ثانیاً اس کی سند میں ابو شیبہ مہریؒ ہے علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ بلخ مہریؒ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ابی ذری من ذاولا من شیخہ بلخ مہریؒ اور اس کا استاد ابو شیبہ مہریؒ پتہ نہیں یہ دونوں کون تھے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی سند مجہول ہے (میزان جلد ۶ ص ۲۱۴) و ثالثاً اس سند میں علی بن یونسؒ واقع ہے اگر یہ علی بن یونس بلخیؒ ہے تب بھی کمزور ہے (میزان جلد ۶ ص ۲۱۴) اور اگر علی بن یونس مدینیؒ ہے تب بھی ضعیف ہے (الایضاً والیضاً ص ۲۶۹) اگر کوئی اور ہے تو اس کی توثیق درکار ہے و رابعاً اس اثر سے نظر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے صرف سہری نمازوں میں اجازت دی ہے و خامساً اس میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قل هو اللہ احد کی قرأت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا اثر: حضرت سالم سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ان ابن عمرؓ کان ینصت للامام فیما جہر فیہ ولا یقلد معہ (کتاب القراءة ص ۱) و تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۱) کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے خاموش رہا کرتے تھے اور قرأت نہیں کرتے تھے، فریق ثانی کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سہری نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے۔

جواب: یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں، امام دارقطنیؒ علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ مدلس تھے (تہذیب جلد ۶ ص ۴۰۵، میزان جلد ۱۵، ابکار ص ۲۳۷) اور یہاں وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں و ثانیاً اس میں ذہبیؒ ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ان کی مدلس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں و ثالثاً یہ اثر عبارتہ النص کے طور پر ہماری دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے رہا سہری نمازوں میں اس سے قرأت کا اثبات کہنا تو مفہوم مخالف پر مبنی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالفت محبت نہیں ہے (تحقیق المجد ص ۹۳ و اعلاہ السنن جلد ۴ ص ۱) و رابعاً اگر مفہوم مخالف کو بعض فقہاء

کے قول کے مطابق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہو گا کہ حضرت ابن عمرؓ
 سب سے نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور فریق ثانی کا دعویٰ اس سے خاص ہے کیونکہ
 ان کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ پڑھنے کا ہے وغامضاً موطا امام مالکؒ وغیرہ کے حوالہ سے بسند صحیح ان
 کا یہ اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے اور ان کا یہ
 مسلک ایک مسلم حقیقت ہے اور ان سے ایک روایت یوں ہے انہ کان ینہی عن القراءۃ
 خلف الامام (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۳) کہ حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع
 کیا کرتے تھے۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) جو فریق ثانی کے مقتدر اور
 پیشوا ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی علماء احناف کے نزدیک اجازت نہیں ہے
 اور ان کا استدلال ان صحابہ کرامؓ کی روایات سے ہے اور یہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔
 حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت
 ابو سعید بن الحدادیؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت زید بن ثابتؓ،
 حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ وغیر ہم (منع قرائت خلف الامام۔ بحوالہ
 ایضاً الاذلة ص ۶) اور صحیح اسانید کے ساتھ جلد اول میں ان اکابر کے آثار نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ
 جملہ حضرات امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی بات مولانا نذیر حسین صاحب فرماتے ہیں
 حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ایک اثر کتاب القراءۃ ص ۱۲۹ و ۱۳۰ میں ہے لیکن اس میں محول مدرس ہیں
 اور محضہ سے روایت کرتے ہیں علاوہ انہیں امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبد اللہ بن عمرؓ نہیں بلکہ
 عبد اللہ بن عمرؓ بن العاص ہیں (ص ۱۲۹) اور مستزاد برآں اس میں خلف الامام کا جملہ بھی مذکور نہیں ہے
 لہذا یہ روایت منفرد کے حق میں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ابو العالیہؒ نے مکہ مکرمہ میں
 دریافت کیا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ فرمایا میں بیت اللہ کے رتبے جیسا کہ تم ہوں کہ نماز
 میں قرأت نہ کروں ولویام الکتاب اگرچہ ام القرآن ہی ہو (جزء القراءۃ ص ۱۲) لیکن اس میں
 بھی خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں کتاب القراءۃ ص ۶۵ میں اسی اثر کے آخر میں
 فاتحہ الکتاب کے بعد ہاتھ کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس بات کو متعین کر
 کر دیتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ اثر مقتدی کے حق میں نہیں ہے کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک

بھی اس کو ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اور کتاب القراءۃ ص ۶۴ میں ان کی اسی روایت میں بام الکتاب کے بعد فزائدًا بافصاعاً کی زیادت بھی مروی ہے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اثر ان الفاظ سے مروی ہے۔

مسئل ابن عمرؓ عن القراءۃ خلف الامام فقال ما کانوا یرون بأساً ان یقرأ بفتحة الكتاب فی نفسه (جزء القراءۃ ص ۱۲) ان سے سوال کیا گیا کہ کیا امام کے پیچھے قرآن کی جاسکتی ہے؟ فرمایا لوگ اس میں کوئی عرج نہیں سمجھتے تھے کہ اپنے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

لیکن اس کی سند میں ایک تو ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسیٰ بن ماہان ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی اس سند کا یحییٰ البکاء ہے امام احمد، ابو داؤد، ابوزر اور ابن عدیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، دارقطنیؒ اس کو ضعیف اور علی بن الجعدیؒ اس کو مختلط کہتے ہیں، ازہریؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے، ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۷۹) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاً صغیراً ص ۵۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (تقریب ص ۲۹۵) مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ عیسیٰ بن ماہان متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ صدوق ہے اس کا حافظ اچھا نہیں تقریباً ۳۲۴ اور یحییٰ البکاء کو ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ ہے انشاء اللہ جب راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے (محصلاً ص ۳۲۴) الجواب، ہاں ایسے ہی راویوں کی ایسی ہی قسم کی حدیثوں پر آپ کے مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی نمازوں کو باطل اور کالعدم ٹھہرانے والوں کی وکالت فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور آگے لکھتے ہیں کہ تطبیق کی یہی صورت ہے کہ نفی سے مراد جہری نماز میں فاتحہ سے ما زاد کی نفی مراد لی جائے اور فاتحہ کو اس نفی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے انتہا ص ۳۲۵ الجواب نہ معلوم یہ حضرت کس روایت کی کس تطبیق سے ہے؟ صحیح اور ضعیف کی تطبیق کا کیا معنی؟ الحاصل حضرت ابن عمرؓ ہوں یا کوئی اور صحابی ہو ان میں کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری اور واجب ہے۔

حضرت عبادة بن الصامت کا اثر۔

حضرت محمود بن ربیع فرماتے ہیں کہ۔

سمعت عبادۃ بن الصامت یقرأ خلف
 الامام فقلت له تقرأ خلف الامام فقال عبا
 لا صلوة الا بقراءة رسنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۶۸
 امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ ان کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس میں امام کے پیچھے آہستہ
 قرأت کرنے کی اجازت ہے اور پھر لکھا ہے۔

ومذهب عبادۃ فی ذلك مشہور (ص ۱۶۸)
 حضرت عبادۃ کا مذہب اس میں مشہور و معروف ہے۔

جواب :- سند کے لحاظ سے گو کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے مگر ہم سند کے لحاظ سے اس
 پر کوئی کلام نہیں کرتے حضرت عبادۃ بن الصامت نے صحیح سمجھایا غلط بہر حال یہ بالکل صحیح بات
 ہے کہ حضرت عبادۃ ام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک و
 مذہب تھا مگر فہم صحابی اور موقوف صحابی حجت نہیں ہے خصوصاً قرآن کریم، صحیح احادیث اور جمہور
 حضرات صحابہ کرام کے آثار کے مقابلہ میں لیکن یہ روایت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ حضرات
 صحابہ کرام اور تابعین میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ
 مسک ان میں رائج بھی نہ تھا ورنہ محمود بن زینح جو خود صحابہ میں تھے حضرت عبادۃ بن الصامت
 کی امام کے پیچھے قرأت سے کبھی تعجب نہ کرتے اور نہ یہ پوچھنے کی نوبت ہی آتی کہ حضرت آپ امام
 کے پیچھے کیوں قرأت کرتے ہیں؟ یقینی امر ہے کہ حضرت عبادۃ بن الصامت نے نماز میں تکبیر،
 قیام، رکوع، سجود، تشهد، اور سلام وغیرہ جملہ امور ادا کئے ہوں گے مگر ان میں سے کسی چیز کے بائے
 میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ حضرت آپ نے رکوع کیوں کیا ہے؟ سجدہ کیوں کیا ہے؟
 وغیرہ وغیرہ اگر سوال کیا ہے تو اس چیز کے بائے میں آپ کے امام کے پیچھے قرأت کیوں کرتے
 ہیں؟ یہ بھی مت بھولیں کہ حضرت عبادۃ بن الصامت نے محمود بن زینح کو یہ نہیں فرمایا کہ بزورِ
 تمہاری تمام سابق نمازیں بے کار کا لعدم اور باطل ہیں کیونکہ تم نے قرأت نہیں کی اور تمام نمازیں واجب
 الاعادہ ہیں اور نہ سہی تو یہی نماز جو تم نے ابھی ابھی میرے ساتھ بغیر قرأت کے ادا کی ہے وہی دوبارہ
 پڑھ لو اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمود بن زینح حضرت عبادۃ کے داماد تھے رہنمائی
 التذیب جلد ۱ ص ۶۳، انہوں نے ان کو یہ بھی نہ فرمایا کہ تم امام کے پیچھے ترک قرأت کے مرتکب

ہوتے ہو اور تارکِ قرأت کی نماز باطل اور کالعدم ہے اور من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر
لہذا میری محنت جگر کو میرے گھر پہنچا دو اور خود منزے اڑاتے پھرو۔ حضرت عبادۃ وہی جلیل القدر صحابی
ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس شرط سے
بیعت کی ہے کہ ان لا تخاف فی اللہ لومة لائمہ (مستدرک وقال صحیح جلد ۳ ص ۳۵۶) اللہ
تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہ گھبرائیں گے اور ایک معمولی قسم
کے مسئلہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے اُلجھ کر ملک شام ترک کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ ہمارا اجتماع ناممکن ہے
لیکن حضرت عمرؓ کی زبردست مداخلت سے اپنے ارادہ سے باز آئے (دیکھئے مستدرک جلد ۳ ص ۳۵۵)۔
مسند دارمی ص ۳ اور ابن ماجہ ص ۷ وغیرہ) مگر جب قرأت خلف الامام کے مسئلہ کی باری آتی ہے تو اپنے
پڑھنے کی وجہ تو بتلاتے ہیں لیکن اس اہم مسئلہ کے اظہار پر کما حقہ وہ جوش و خروش ظاہر نہیں کرتے جو
اس کے رکن اور ضروری ہونے پر کرنا چاہیے تھا۔ اگر حضرت عبادۃ کے نزدیک قرأت خلف الامام جب
فرض اور رکن ہوتی تو اس کے اظہار میں پوری قوت اور طاقت صرف کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی
کوٹاہی نہ کرتے۔ اس بحث کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آ سکتی ہے کہ حضرت محمود بن ربیع
مطلقاً امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کے قائل نہ تھے اور حضرت عبادۃ گو قائل تو تھے لیکن محض استجاباً
طور پر اور اگر کسی کو حکم بھی کیا ہے تو صرف استجابی امر سمجھ کر۔ اگر اس کو رکن اور فرض سمجھتے تو کہتان حق سے
بچتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی طرح (جنہوں نے قرآن کریم کی دو سورتوں کے تقدم و تاخر فی النزول
کے بارے میں اعلان کیا تھا) یہ اعلان فرماتے من شاء باہلتہ جس کا صحیح چاہے میں اس کے ساتھ
مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں جب حضرت عبادۃ نے ایسا نہیں کیا تو قطعی بات ہے کہ وہ امام کے پیچھے
بلاشک سورۃ فاتحہ پڑھتے تو تھے (اور جہری نمازوں میں پڑھتے بھی صرف تنہا اور اکیلے تھے دوسرے
حضرات صحابہؓ کا ان سے اتفاق نہ تھا) مگر صرف مستحب سمجھ کر ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دوسرے صحابہؓ حرام
حضرت عبادۃ بن الصامت سے جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں اتفاق رائے
نہیں رکھتے تھے، سینہ زوری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ۔

وانما تعجب من تعجب من قرأت عبادۃ بن الصامت
خلف الامام فيما يحرم فيه بالقرأه لذلک
جو لوگ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کے قائل
تھے انہوں نے حضرت عبادۃ کی جہری نمازوں میں قرأت

من ذهب الى ترك القراءة خلف الامام فيما يجهر الامام فيه بالقراءة حين قال النبي صلى الله عليه وسلم مالي انازع القرآن ولم يسمع استثناء النبي صلى الله عليه وسلم قراءة فاتحة الكتاب سراً وقوله صلى الله عليه وسلم فانه لا صلوة لمن لم يقرأ بها وسمعه عبادة بن الصامت والتقنه واداه واظهره فوجب الرجوع اليه في ذلك (انتقى بلفظ كتاب القراءة ص ۴۷)

پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ میرے ساتھ قرآن میں منازعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اور اس کے بعد آپ نے آہستہ سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور اسی طرح آپ نے یہ فرمایا کہ جس آدمی نے نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی تو یہ استثناء صرف حضرت عبادة بن الصامت نے سنی اور دیگر حضرات صحابہؓ نے سن سکے اور اس کو حضرت عبادةؓ نے خوب محفوظ رکھا اس کو ادا کیا اور ظاہر کیا سوانحی بات کی طرف رجوع کرنا ضروری تھا۔

صحابی اور تارک نماز؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں اور واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں سینکڑوں حضرات صحابہؓ شریک ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مالی انازع الخ سے تنبیہ فرما کر سب حضرات صحابہ کرامؓ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ اور فَاصْلَحْ بِمَا تَوَصَّىٰ یعنی اے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکموں کو کھول کر بیان کریں جن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے) مگر بایں ہمہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ حکم آہستہ (سراً) بیان کرتے ہیں اور حضرت عبادةؓ کے بغیر اس حکم کو کوئی دوسرا سنتا ہی نہیں؟ پھر حضرت عبادةؓ پر لوگ متعجب کیوں نہ ہوں کہ حضرات صحابہ کرامؓ جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم اور ارشاد کو عزیز از جان سمجھتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے کوئی بات نہیں سمجھ آتی تو پھر استدعا کرتے تھے اور کوئی ضروری امر ہوتا تو آپ تین تین مرتبہ ایک ایک جملہ کو دہراتے تھے لیکن جب امام کے پیچھے قرأت سورہ فاتحہ کے حکم کے بیان کرنے کا نمبر آتا ہے تو آپ آہستہ بیان کرتے ہیں؟ تین مرتبہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ اور یہ حکم صرف حضرت عبادةؓ سنتے ہیں کسی دوسرے کے پلے کچھ نہیں پڑتا؟ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ آپ سے دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ حضرت آپ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اگر امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کے پڑھنے کا مسئلہ ضروری فرض، واجب اور رکن ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

سلم ایک بار نہ فرماتے بلکہ کئی بار فرماتے ستر اند فرماتے بلکہ جہراً فرماتے صرف حضرت عبادہؓ کو نہ سنتے بلکہ تمام حضرات صحابہؓ کو سنتے اور اگر حضرت عبادہؓ بھی اس حکم کو ضروری سمجھتے تو یقیناً بغیر خوفِ لہذا کے اس کی خوب نشر و اشاعت کرتے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس بات کا قائل کر لیتے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے۔ یہ حکم تو ضروری نہ تھا اس لیے اس کی پُر زور اشاعت کی ضرورت ہی انہوں نے نہ سمجھی، بخلاف اس کے ترک قرأت کا حکم ضروری تھا اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے صرف ایک شخص نے قرأت کی تو اپنے فرمایا میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ کیوں میرے ساتھ نماز عت اور مخالفت ہوتی رہی ہے؟ حتیٰ کہ آپ نے بیاناگ دہل یہ ارشاد فرمایا مالی انا نزع القرآن نتیجہ ہوا کہ یہ ارشاد سب نے سنا اور یہ ارشاد سن کر تمام حضرات صحابہ کرام نے جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔ جیسا کہ مفصل پہلے گذر چکا ہے۔ باقی اگر حضرت عبادہؓ سے لبت صحیح یا کسی اور صحابی سے بلا قییل و قال خلت الایم کی قید سے کوئی روایت صحیح ہوتی تو یقیناً اس کی طرف رجوع کیا جاتا مگر روایات کا حال آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ حضرت عبادہؓ کے موقوف قول سے ہی غلطی در غلطی پیدا ہوئی ہے الغرض حضرت صحابہ کرامؓ کے یہ آثار پہلے تو سنڈا ہی صحیح نہیں ہیں اور اگر کچھ صحیح بھی ہیں تو ان میں صرف ستری نمازوں کا ذکر ہے کسی میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور اکثر میں ما زاد، ماتیسہ اور فضا عدا وغیرہ کی زیاد بھی موجود ہے لہذا یہ آثار فریق ثانی کو ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔

آثار حضرت تابعین وغیرہم

فریق ثانی نے اپنے اس دعویٰ پر کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ورنہ نماز ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہوگی، حضرات تابعین و اتباع تابعین وغیرہم کے آثار اور اقوال سے بھی استدلال کیا ہے حالانکہ ان کے نزدیک در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد چہر آثار حضرت تابعین وغیرہم سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ سنڈا اور روایت بھی صحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور درستی پہلو کے پیش نظر بھی وہ ان کو چنداں مفید نہیں ہو سکتے مگر مشہور ہے ڈوبتے کو تینکے کا سہارا، حضرات تابعین وغیرہم کے وہ آثار جو بحث سکتا

وغیرہ اور دیگر مواقع پر نقل کئے جا چکے ہیں اور جن پر کلام بھی کیا جا چکا ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے اس موقع پر صرف وہ آثار پیش ہوں گے جو پہلے نقل نہیں ہوئے۔

حضرت محول کا اثر :- ان سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مغرب عشاء اور صبح کی نمازیں ہر رکعت میں آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور جہری نمازوں میں جب اہم سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت اختیار کرے تو اس وقت آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور اگر نام خاموش نہ ہو تو اس کے ساتھ یا اس کے بعد یا اس سے پہلے ہر حالت میں سورۃ فاتحہ پڑھو اور کسی حالت میں نہ چھوڑو (ذبیحی جلد ۲ ص ۱۷۱)

جواب :- یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اگر بالفرض یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی نص قرآنی، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرام کے صحیح آثار کے مقابلہ میں اس کو سننا کون ہے؟ وثانیاً قرأت سورۃ فاتحہ کے لیے سکتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ بحث سکنت اہم میں اس کی سیر حاصل تحقیق پیش ہو چکی ہے اور جہاں کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا منازعت اور محبت کا موجب ہے جو کتاب و سنت اور اجماع امت سے مرود ہے۔

حضرت عمرو بن زبیر کا اثر :- ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ
لا تتم صلاة لأحد من الناس لا يقرأ فيها
بفاتحة الكتاب فصاعداً مكتوبة ولا سبحة
بمكمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سورۃ فاتحہ اور
اس سے کچھ زیادہ کی قرأت نہ کی جائے۔
(کتاب القراءة ص ۷)

جواب :- یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں محمد بن العباس ہے کتب اسماء الرجال سے اس کی تعیین نہیں ہو سکتی کہ یہ کون اور کیسا ہے؟ وثانیاً اس میں احمد بن حنبل ہے جس کا کتب رجال میں کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا، مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مگر عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجہول ہوا ۵ ص ۳۳۹ الجواب :- یہ ٹھیک ہے مگر مولف مذکور کا یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس راوی کی نشاندھی کرتے اور کتب رجال سے اس کی توثیق نقل کرتے وثالثاً اس کی سند میں حماد بن سلمہ ہے ان کے اس اثر کا مقابلہ اہل اثر سے نہیں ہو سکتا جو جلد اول میں بلند صحیح نقل کیا جا چکا ہے مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں۔ سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں

علی وجوب الاستماع والانصات لقراءة الامام۔۔۔ الخ (احکام القرآن ج ۳ ص ۲۹)

استماع وانصات کے وجوب پر واضح دلیل ہوتی۔

علامہ سید محمود آلوسی (مفتی بغداد المتوفی ۱۲۶۰ھ)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

لانہا تفتضی وجوب الاستماع آیت کا مقتضی یہ ہے کہ نماز میں یا خارج

عند قراءة القرآن في الصلاة وغيرها و

قد قام الدليل في غيرها على جواز

الاستماع وتركه فبقي فيها على حاله في

الانصات للجهل وكذا في الانحفاء لعلنا

بانہ يقرأ ويؤيد ذلك اخبار جمة

(روح المعاني جلد ۹ ص ۱۳۳)

امام قرأت کرتا ہے اور متعدد حدیثیں بھی اس کی

تائید کرتی ہیں۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے متعدد صحیح حدیثیں، عقلی و تزییحی دلائل پیش کر کے بڑے

ذہنی دلائل سے اپنا دعویٰ ثابت کیا ہے۔

قارئین کرام! آپ حقیقت کی تہ کو پہنچ چکے ہوں گے۔ ابھی بہت سے مفسرین کرام

مثلاً علامہ خازن (المتوفی ۷۴۱ھ) اور شیخ احمد جونپوری (المتوفی ۱۱۳۰ھ) وغیرہ وغیرہ

کی عبارتیں باقی ہیں، مگر ہمارا مقصد صرف منصف مزاج لوگوں کے لیے معتبر مفسرین کے

لے مولانا میر صاحب لکھتے ہیں کہ متاخرین حنفیہ میں بڑے پائے کے مفسرین (تفسیر واضح البیان ص ۴۴)

لے مشہور تفسیر ہے اور ۷۲۵ھ میں مصنف اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تھے۔ (اکسیر فل)

آیت مذکورہ کی تفسیر انھوں نے جلد ۲ ص ۲۷۲ میں کیا ہے۔

لے یہ اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱۱۸ھ کے استاد تھے۔

(اکسیر ص ۳۴)

اور تفسیر احمدی ص ۲۸۰ میں انھوں نے آیت مذکورہ کی سیر حاصل تفسیر کی ہے۔

چند اقوال بطور نمونہ عرض کرنے تھے اگر استقصا کیا جائے تو تقریباً محال ہے اور ہمارا موضوع بھی یہ نہیں۔ اس لیے اب ہم بعض ضروری عبارتیں نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امام بیہقی رحم جن کی کتاب القراءہ پر مسئلہ زیر بحث میں فریق ثانی کا مدار ہے۔ رقم طراز ہیں کہ
اننا لا ننکر نزول هذه الآية في

الصلوة او في الصلوة والخطبة كما
ذهب اليه من ذكرنا قوله من سلف

هذه الامة غير انهم اوبعض من
روى عنهم اختصر والحديث فقالوا

في الصلوة مطلقاً۔
(كتاب القراءۃ ص ۱۱)

امام بیہقیؒ کو اس کا اقرار ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوں ہیں اور جمہور امت کا بھی یہی قول ہے مگر ان کا اعتراض یہ ہے کہ آیت کو فقط نماز پر کیوں قصر کر دیا ہے؟ اس میں خطبہ وغیرہ کا ذکر بھی آنا چاہیے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے لیکن امام موصوفؒ کا یہ اعتراض محض دفع الوقتی اور تسکین قلب کا سامان ہے۔

اولاً: اس لیے کہ جمعہ اور عید کی فرضیت مدینہ طیبہ میں ہوتی ہے اور آیت مذکورہ مکی ہے جیسا کہ علامہ نقویؒ کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے۔ پھر اس کا شان نزول خطبہ کیسے ہوا؟

وثانیاً: جس حدیث (بلکہ احادیث) کے اختصار کا الزام امام موصوفؒ نے عائد کیا ہے۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ اپنے مقام پر عرض ہو گا۔ پھر ان سے استدلال و احتجاج کیسا؟

وثالثاً: آیت کا حکم خطبہ کو عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے نہ کہ شان نزول کے لحاظ سے۔ جیسا کہ آپ پوری وضاحت سے یہ پڑھ چکے ہیں۔ مگر یہ کس قدر حقیقت فراموشی ہے کہ جس نماز

کے بارے میں یہ آیت نازل ہوتی ہے۔ اس میں استماع و انصات تو ضروری نہ ہو اور خطبہ (وغیرہ بالتبع امور) کو اگر بنا کر اصل حقیقت سے گریزا اور پہلو تہی کی جائے؟

قاضی شوکانی (محمد بن علی المتوفی ۱۲۵۵ھ)

اس مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

لان عمومات القرآن والسنة قد دلت علی وجوب الانصات والاستماع والمنوجه حال قراءة الامام للقرآن غیر منصت ولا مستمع.... الخ
 (نبیل الہ وطاریح جلد ۲ ص ۲۲۶ ونقلہ النواب فی ہدایۃ السائل ص ۱۹۱)

(۱) امام جب قرأتِ قرآن کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت اِنی وَجَّهْتُ وَجْهَی لِلَّذِی... اذنیۃ کی دعاء استفتاح نہیں پڑھنی چاہئے، کیونکہ قرآن کریم اور سنت کے عمومات اور اکثر دلیلیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ امام جب قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر انصات اور استماع واجب ہے۔ حالانکہ اس حالت میں امام کے ساتھ پڑھنے والا استماع اور انصات پر حامل نہیں ہے۔

قاضی صاحب بھی جہر اور اہل اسلام کی طرح جہر امام کے وقت مقتدی کی قرأت کو قرآن کریم کی سیطرہ تو جہر ماننے کے قرائن سنت عمومی و دلائل کے خلاف سمجھتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ اس کے خلاف کرنے والا عمومات قرآن اور سنت کا مخالف ہے۔ قاضی صاحب نے سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کو احوط کہا ہے، لیکن قرأت مقتدی کے لیے سکتات کا شریعت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر عرض ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

مؤلف خیر الکلام کا مناقشہ نمبر ۳ میں یہ کہنا کہ اس میں فاتحہ کا ذکر نہیں اور قاضی شوکانی جہر حالت میں فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور استماع و انصات آہستہ پڑھنے کے منافی نہیں (محصلاً خیر الکلام ص ۵۳۷، ۵۳۸) تو یہ محض لفاظی ہے۔ ہم نے کب فاتحہ کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے تو یہ حوالہ صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ جہر امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا استماع و انصات کے بالکل منافی ہے اور یہی کچھ قاضی صاحب فرماتے ہیں حتیٰ کہ باقر مؤلف خیر الکلام قاضی صاحب مقتدی کے لیے فاتحہ کی قرأت کو سکتات میں احوط کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۵۳۸) کہ قاضی صاحب فرمایا کہ

لہ قاضی صاحب موصوف اپنے وقت کے متبحر اور وسیع المطالعہ محقق عالم تھے۔ نواب صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ وہ القاضی، العلامہ، الابرة، الانور، الزکی، المنور اور عرۃ الاسلام تھے اور لکھتے ہیں کہ وہ کمال عالم انسانی پر حاوی تھے۔ (اکسیر ص ۹)

اگر ممکن ہو تو فاتحہ کو امام کے سکنات میں پڑھنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ (نیل جلد ۲ صفحہ ۲۳۶) اور فرماتے ہیں کہ قرآن و سنت کے عمومی دلائل مقتدی پر استماع و انصات کو واجب قرار دیتے ہیں۔

حافظ ابو عمر بن عبد البر (یوسف بن عبد اللہ المتوفی ۳۶۳ھ) :

لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ (وغیرہ) جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قرأت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

ورجته قوله تعالى واذا قرع القرآن
فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون لا
خلوة انہ نزل فی هذا المعنی دون غیرہ
ومعلوم انہ فی صلاة الجہر لان السراہ
یسمع فدل علی انہ اراد الجہر خاصة۔
(بخاریۃ او جز المسالك جلد ۱ ص ۲۴۸)

اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جب
قرآن کریم کی قرأت ہو رہی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو
اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو اور اس میں کسی کا
اختلاف نہیں ہے کہ اس آیت کا شان نزول صرف یہی
ہے۔ نہ کہ کوئی اور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استماع تو صرف
جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔ لہذا اس آیت سے

فقط جہری نمازیں مراد ہوں گی نہ کہ ستری۔

انشاء اللہ العزیز یہ بات تو اپنے مقام پر آئے گی کہ آیت میں صرف استماع کا لفظ ہی نہیں جو بقول ان
کے محض جہری نمازوں کو شامل ہے (اور نیز استماع اور سماع میں بھی فرق ہے)۔ بلکہ اس میں انصات کا لفظ
بھی ہے جو ستری نمازوں کو بھی شامل ہے لیکن حافظ المغرب قرآن کریم کی مذکورہ آیت کا شان نزول نماز
اور خلف الامام کا مسئلہ بتلاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ پوری ذمہ داری اور وضاحت سے تحریر فرماتے
ہیں کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز اور خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف

نہ علامہ فہرستی ان کو الامام، شیخ الاسلام اور حافظ المغرب لکھتے ہیں۔ (مذکورہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۷) علامہ
ابوالولید باجی ان کو حافظ بل المغرب لکھتے ہیں (ایضاً ص ۳۰۷) امام حمیدی کہتے ہیں کہ وہ فقیہ، حافظ
کثیر التصنیف قرأت اور علم خلاف کے عالم اور علوم حدیث اور اسما الرجال کے مسلم امام تھے (ایضاً
ص ۳۰۷) غرضیکہ وہ حفظ اتقان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ علامہ ابن حزم کہتے تھے کہ میں نے فقہ احمد
پر ابن عبد البرؒ کی کتاب التہدید کی مانند کوئی کتاب نہیں دیکھی چہ جائیکہ اس سے بہتر اور اعلیٰ اور کتاب
الاستذکار اسی کا شخص ہے (مذکورہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۷) حافظ ابن القیم ان کو الامام الحافظ اور اپنے زمانہ میں امام اہل
السنت لکھتے ہیں۔ (اجتماع الیموش الاسلامیہ ص ۴۷)

نہیں ہے۔ انصاف شرط ہے کہ اس اجماع و اتفاق کے بعد اور کون سی تفسیر معتبر اور قابل اعتماد ہو سکتی ہے؟ جو حضرات صحابہ کرام سے لے کر قاضی شوکانی صاحب تک ہر دور، ہر طبقہ اور ہر مسلک کے فقہاء و محدثین، مؤرخین اور مفسرین کے ہاں طے شدہ حقیقت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ (جن کے نام اور محاسن سے مقدمہ میں آپ اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالنزاع من الطرفين لكن الذين ينهون
عن القراءة خلف الامام جمهور السلف
والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة
والذين اوجبوها على المأمور فعد بيشهم
ضعف الاثمة -

مسئلہ زیر بحث میں نزاع تو طرفین سے ہے لیکن جو لوگ امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے ہیں۔ وہ جمہور سلف و خلف ہیں اور ان کے ہاتھ میں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرآن کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کی حدیث کو ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

(تنوع العبادات ص ۸)

مطلب ظاہر ہے کہ منکرین قرأت خلف الامام صرف چند نفوس نہیں، بلکہ جمہور سلف و خلف ہیں اور یہ نظریہ جمہور نے اجتہاد اور قیاس ہی سے قائم نہیں کر لیا۔ بلکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے لیا ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے قرأت تجویز کرتے ہیں۔ ان کا ہاتھ کتاب اللہ سے یکسر خالی ہے اور محض حدیث پر ان کے استدلال کی بنیاد قائم ہے اور حدیث بھی وہ ہے جس کی تضعیف ائمہ حدیث سے منقول ہے۔ (پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

وقول الجمهور هو الصحيح فان الله

جمہور کا مسلک اور قول ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ سب لوگوں کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے۔

سبحانه وتعالى قال واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون قال احمد اجمع الناس على انها نزلت في الصلوة -

شیخ الاسلام کی اس عبارت نے اس امر کی مزید تشریح کر دی ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول ہی نماز ہے اور اس پر تمام اہل اسلام اور ائمہ دین کا یعنی حضرات صحابہ کرام و تابعین و اتباع تابعین اور جہور سلف و خلف کا اجماع و اتفاق ہے۔ یہی شیخ الاسلام ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ

وذكر احمد بن حنبل الاجماع على
انها نزلت في الصلوة وذكر الاجماع على
انها لا تجب القراءة على المأموم حال الجهر
امام احمد بن حنبل نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ
آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نیز اس پر
بھی اتفاق نقل کیا ہے کہ جب امام جہر سے قرآن کرنا ہو تو
(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۳)

مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے۔

اور نواب صاحب اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ
واین آیت دلالت نمی کند مگر بر منع قرأت در حال جہر امام بقرات لقولہ فاستمعوا
واستماع نمی باشد مگر از برائے قرأت مجبور بہمانہ برائے قرأت مخافتت ... ۱۱
(دلیل الطالب صفحہ ۲)

قارئین کرام! آپ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود سے لے کر قاضی شوکانیؒ اور نواب صاحب تک کی عبارات ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اس مذکورہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے۔ خطبہ (وغیرہ) عموم الفاظ کے لحاظ سے بالتبع اور ضمنی طور پر اس حکم میں شامل ہے۔ اور حافظ ابن عبدالبرؒ اور شیخ الاسلام سے یہ بھی سن چکے ہیں کہ اس بات پر تمام اہل اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اس کا شان نزول فقط نماز ہے۔ اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اجماع کے نقل کرنے والے بھی امام اہل سنت اور مقتدائے ملت حضرت امام احمد بن حنبلؒ ہیں اور آپ یہ بھی سن چکے ہیں کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرآن کرنا اجماع اور اتفاق کے سراسر خلاف ہے۔ اس تمام بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے فریق ثانی بے بنیاد دعاوی کو (جن کا ذکر سخن ہائے گفتنی میں ہو چکا ہے) دیکھیے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کس کے ہاتھ میں ہے اور جہور سلف و خلف کی معیت کس کو نصیب ہے؟

نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

کوئی دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بتینہ عادلہ سے اس پر ثبوت نہ پیش کیا جائے۔ دلیل الطالب^{۳۹} محمد اللہ تعالیٰ کہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جمہور سلف و خلفؓ کی معیت بھی ہمیں حاصل ہے جو بظوائے حدیث کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور نہ ہوگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس آیت کے سلسلہ میں فریق ثانی کی طرف سے قیداً و حدیثاً جو جو اعتراضات اور معارضات وارد کیے گئے ہیں ان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈال لیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے ان کو ایک خاص ترتیب سے ہم نقل کرتے ہیں اور ہر ایک کا جواب ساتھ ساتھ عرض کرتے جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

پہلا اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ علامہ زلیعیؒ نے "فصب الرأیہ ص ۱۲۲" میں امام بیہقیؒ کے حوالہ سے امام احمد بن حنبلؒ کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول جماع اور اتفاق سے نماز ہے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے امام بیہقیؒ کی معرفت السنن و الآثار اور کتاب القراءۃ کا مطالعہ کیا ہے لیکن ان میں مجھے یہ قول نہیں مل سکا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۶۵، تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹ و ابحار المنن ص)

جواب:

مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض چند وجوہ سے باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ علامہ جمال الدین زلیعیؒ (المتوفی ۸۶۷ھ) نقل میں بڑے محتاط اور ثقہ ہیں اور

پھر انھوں نے امام بیہقیؒ کی کسی خاص کتاب کا نام بھی نہیں لیا۔ اور امام بیہقیؒ کثیر التصانیف تھے۔ لہذا

مبارک پوری صاحبؒ کا ان کی صرف دو یا تین کتابیں دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

ثانیاً۔ علامہ امام، الحافظ اور المجتہد تھے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ من اعلام العلماء اور فقہ

حدیث اور اسماۃ الرجال کے مسلم امام تھے۔ قواعد البیہدہ ص ۲۲

وثانیاً۔ نواب صاحب نے تو جہوں کیساتھ اس امر پر اتفاق کیا ہی تھا کہ و عدم علمِ اُو علم بعدم نیست۔ (ردورالابلہ ص ۳۷۹) مگر مبارک پوری صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ عدم نقل عدم وقوع کو مستلزم نہیں (تحقیق الکلام ص ۱۳) اگر مبارک پوری صاحب کو اس کا علم نہیں ہو سکا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ یہ جملہ اور قول ہی کتابوں سے نکل کر بھاگ گیا ہے؟

وثالثاً۔ تنہا علامہ زبلیعی ہی اس قول کے ناقل نہیں بلکہ علامہ موفقی الدین ابن قدامہ (مغنی جلد ۷ ص ۶۰۵) اور علامہ شمس الدین بن قدامہ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۱۱۱) اور حافظ ابن ہمام (فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۲۱) اور ملا علی القاری (شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ (اپنے فتاویٰ میں جیسا کہ گزر چکا ہے) وغیرہ سب اس کو نقل کرتے ہیں۔ مبارک پوری صاحب کو ان کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیے تھی تاکہ علامہ زبلیعی کے قول کی صداقت معلوم ہو جاتی۔

ورابعاً۔ لیجیے ہم مبارک پوری صاحب کے ہم مسلک اور ہم مشرب عالم سے یہ منوا دیتے ہیں مولانا عبد الصمد صاحب پشاورؒ ہی غیر مقلد نقل کرتے ہیں کہ

والاصح كونها في الصلوة لما روى
 البيهقي عن الامام احمد قال اجمعوا
 على انها في الصلوة۔
 صحيح ترین بات یہ ہے کہ آیت واذا قرعتم القرآن
 کا شان نزول ہی نماز ہے جیسا کہ امام بیہقی نے امام احمد
 سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نماز کے بارے میں نازل
 (اعلام الاعلام في قراءة خلف الامام من) ہونے پر اجماع و اتفاق ہے۔

لہ بعض ائمہ نے حدیث قلیتین کی تصحیح کی نسبت امام طحاوی کی طرف کی تھی۔ مولانا شوق نیوی نے لکھا کہ مجھے شرح معانی الآثار میں تصحیح نہیں مل سکی۔ اس پر مبارک پوری صاحب یوں گرفت کرتے ہیں کہ تصحیح کی نسبت کرنے والوں نے امام طحاوی کی کسی خاص کتاب کا نام نہیں لیا۔ لہذا نیوی صاحب کو ان کی دوسری کتابیں دیکھنی چاہیے تھیں۔ (نہ معلوم یہ مفید مشورہ یہاں کیوں بھول گئے ہیں۔) مگر کیا کیا جائے: صحیح تمہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

۱۱۲ھ المتوفی ۶۸۲ھ جو الامام الفقیہ الزہد الخطیب اور قاضی القضاة تھے۔ (مقدمہ مغنی ص ۱۲)

۱۱۳ھ المتوفی ۸۹۱ھ اپنے وقت کے امام محدث اور فقیہ تھے اور ان کا شمار اہل ترجیح میں ہے۔ (فتاویٰ البیہقی ص ۱۸)

۱۱۴ھ المتوفی ۱۱۴ھ علم و تحقیق کے یگانہ اور محدث و فقیہ تھے۔ (تعلیقات ص ۸)

نوٹ: یہ کتاب نواب صاحب کی مشہور کتاب "لقطة العجلون" کے ساتھ منضم ہے۔
اور دونوں کچھ طبع ہوئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہم مبارک پوری صاحب کو اور کیا ثبوت دے سکتے

ہیں؟

دوسرا اعتراض

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت کا خطاب مومنوں کو نہیں بلکہ کافروں کو ہے۔ جو تبلیغ کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قرآن نہ سُنو جیسا کہ امام رازمی نے اپنی تفسیر (الکبیر جلد ۳ ص ۵۰۲) میں لکھا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی خطاب مومنوں کو ہوتا تو لَعَلَّكُمْ کے لفظ کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ یہ لفظ ترجمی کے لیے آتا ہے اور مومن بہر حال رحمت خداوندی کا مورد اور مستحق ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۷ و تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹) اور مولانا امیر صاحب لکھتے ہیں اور نہ اس کا خطاب مومنوں سے ہے جس نے اس کا خطاب مومنوں سے سمجھا اس نے سلسلہ عبارات اور سیاق مضمون پر غور نہیں کیا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۵۰۲) اور یہی مضمون کم و بیش مولانا عبد الصمد صاحب پشاور می لکھتے ہیں۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۰) اور یہی عذر رنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۲۳)

جواب

یہ اعتراض بھی بالکل بے جان اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ آپ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابن مسعودؓ نے لے کر قاضی شوکانیؒ تک اکثر حضرات مفسرین کا بلکہ تمام امت کا اجماع و اتفاق سن چکے ہیں کہ اس آیت کا خطاب نہ صرف مومنوں سے ہے بلکہ اس کا شان نزول ہی نماز ہے۔ اس اجماع کے مقابلہ میں ایسے لغو اور پادر ہوا نظریہ اور رائے کو کون سنتا ہے؟ ہم سہولت کے لیے اس اعتراض کا یوں تجزیہ کر سکتے ہیں یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے کہ بات سمجھ آ سکے، کہ ان حضرات کے اعتراض کے یا بزعم خود استدلال کے تین مرکزی نقطے ہیں۔ ہم ان کو الگ الگ بیان کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہ آیت کافروں کے حق میں نازل ہوتی ہے۔ مومن اس کے مخاطب

نہیں ہیں۔ دلائل یہ ہیں :

۱۔ امام رازیؒ نے یوں کہا ہے۔

۲۔ لَعَلَّكُمْ کا لفظ اس کی تائید کرتا ہے۔

۳۔ سیاق و سباق کا تقاضا یہی ہے۔

پہلی جزو کا جواب

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت امام رازیؒ (المتوفی ۴۱۰ھ) منطق و فلسفہ اور عقلیات وغیرہ کے مسلم امام تھے۔ لیکن قرآن و روایت اور نقلیات میں ان کا پایہ نہایت کمزور تھا۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں امام رازیؒ عقلیات کے مسلم امام ہیں، لیکن احادیث و سنن میں ان کا پایہ کمزور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر میں رطب و یابس سمجھی کچھ موجود ہے۔ (لسان المیزان جلد ۳ ص ۴۶۶) امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ تفسیر کبیر میں سمجھی کچھ ہے مگر اس میں تفسیر نہیں۔ (در منثور جلد ۳ ص ۱۵۵) اتقان جلد ۲ ص ۱۸۹۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ مولف سے از علم حدیث بے خبر است و در علوم کلام و فنون رسمیه امام اہل زمان بعضی از اہل معرفت بعلم کتاب و سنت گفتہ اند۔ فیہ کل شیء الا التفسیر۔ (اکسیر ص ۱۲۰)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ رازیؒ از علم حدیث خبر ندارد (اکسیر ص ۱۱۳) فریق ثانی ہی از راہ انصاف فرمائے کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیت کی تفسیر جو حضرات صحابہ کرام رض و تابعینؒ اور جمہور سلف و خلف سے صحیح اسانید سے نقل کی جا چکی ہے (بلکہ اسی پر امت کا اجماع ہے اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے) وہ قابلِ محبت ہے یا امام رازیؒ کی تفسیر :۔

من نہ گویم کہ ایس مکن آن کن !

مصلحت بہن و کار آساں کن !

دوسری جزو کا جواب

امام رازیؒ کا لفظ لَعَلَّ سے یہ استدلال کرنا کئی وجوہ سے غلط ہے :
اولاً، لفظ لَعَلَّ اگرچہ تہجی کے معنی میں ہے۔ لیکن حضرات مفسرین کرامؒ اور ائمہ شخاس

امر کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوب کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، علامہ حازن لکھتے ہیں: لَعَلَّ وَعَسَىٰ مِنْ اِلٰهٍ وَاٰجِب (جلد ۲ ص ۲۲۳) اور صاحب مدارک علامہ عبداللہ بن احمد النسفی (المتوفی ۳۸۷ھ) لکھتے ہیں کہ

وَلَعَلَّ لِلتَّجْرِ وَالِاطْمَاعِ وَلَكِنَّ مِنْ
كَرِيحٍ فِجْرِيٍّ مَجْرِيٍّ وَعَدَهُ الْمَحْتَمُ
وَفَاثَهُ وَبِهِ قَالَ سَيُؤَيِّه -
لَعَلَّ كَالْفِظِ تَرْجِيٍّ اَوْ رَطْعٍ دِلَانَةٍ كَالِیْهِ
آتا ہے۔ لیکن ذات باری سے یجتہی اور ضروری وعدہ
کے طور پر آتا ہے اور سیویہ اسی کا قائل ہے۔

(مدارک جلد ۱ ص ۹۲)

علامہ جبار اللہ لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کا وعدہ کرتے ہیں تو اپنی شان استغنا کو ملحوظ رکھ کر لَعَلَّ وَعَسَىٰ استعمال کرتے ہیں۔ (کشاف جلد ۱ ص ۹۲) اور مولانا تھانوی (المتوفی ۱۳۴۳ھ) لکھتے ہیں: شاہی محاورہ میں لَعَلَّ کے معنی عجب نہیں کے آتے ہیں۔ (بیان القرآن جلد ۱ ص ۱۸۱) لہذا اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی شان بے نیازی کے مطابق لَعَلَّ کے ساتھ مومنوں سے خطاب کیا ہے تو اس میں خرابی کیا ہے؟

ثانیاً۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مومنوں کے لیے لَعَلَّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ نہ معلوم وہاں یہ منطق کیسے چلے گی؟ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (پ۔ بقرہ) تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف اے مومنو سب کے سب لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ۔ (پ۔ فود ۴) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں خطاب بھی تمام مومنوں کو ہے جب مومن ہیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ۔ (پ۔ المؤمنون رکوع ۱) تحقیق مومن فلاح پا چکے ہیں۔ اگر لَعَلَّكُمْ کے خطاب سے مومن مراد نہیں ہو سکتے تو قرآن کریم کی ان آیات کا کیا مطلب ہوگا؟

اور ایک مقام پر یہ فرمایا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو تم جلدی پہنچو۔ آگے ارشاد ہوتا ہے لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ۔ (پ جمعہ) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

وقالٹاً۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو کیا قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ بعض مومن اپنی ناشائستہ حرکات کی بنا پر خدا تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں رہتے؟ کیا قاتل، چور، شرابی، زانی، راشی اور سود خور وغیرہ کے لیے لعنت اور غضب و عجزہ کے الفاظ قرآن کریم اور حدیث میں وارد نہیں ہوئے؟ اور کیا وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے حق دار اور محتاج نہیں؟ یا ان کے لیے یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی رحمت کے دروازے کھلے اور رحمت واجب ہے؟ اور کیا رحمت کا مستحق صرف کافر ہی ہو سکتا ہے؟

دو بجائے۔ تمام علمائے اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن کریم تمام اقوام عالم کے لیے ایک ستور العمل اور ضابطہ حیات ہے اور قرآن کے کسی حکم اور آیت کو اس کے شان نزول اور خاص سبب پر منحصر کر دینا بالکل بے کار اور بے حقیقت ہے۔ اگرچہ اکثر احکام کے نزول کا کوئی نہ کوئی سبب اپنی جگہ ضرور ہوگا۔ حضرت امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ آیات کے اسباب و شان نزول کچھ ہی ہوں۔ مگر احکام کی دار و مدار الفاظ پر ہے۔ (کتاب الامم جلد ۵ ص ۲۴۱)

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عمومی احکام کو اسباب نزول پر مقید کر دینا باطل ہے۔ (الصارم المسلول ص ۵۰) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ جمہور علماء اصول و فروع کے نزدیک اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۹) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جن اسباب کی وجہ سے عبادات کی مشروعیت ہوتی ہے۔ ان کا دوام شرط نہیں ہے، جیسا کہ طواف میں رمل اور صفا و مروہ پر سعی کا سبب مشرکین کا اعتراض تھا، لیکن باوجود ان مشرکوں کے ختم ہونے کے اس کا حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ (بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۱۹۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا (فتح الباری جلد ۸ ص ۱۲۱) امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار تعمیم الفاظ کا ہوگا نہ کہ خصوص سبب کا (التقان جلد ۱ ص ۷۴) قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ عام کو سبب پر بند کر دینا مرجوح اور کمزور مذہب ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۲۹)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوگا۔ (دلیل الطالب ص ۴۱۳) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: و عبرت

بعموم لفظ است نہ بخصوص سبب، چنانکہ در اصول متقرر است (بدور الابلہ ص ۲۰۹)
مولانا عبدالصمد پشاوری لکھتے ہیں کہ والحق ان المقدر اعتبار عموم المدنی و

لوخص سببہ (اعلام الاعلام: ۱۹۰) اور اس قاعدہ کو مبارک پوری صاحب بھی
صاف لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۳) مؤلف خیر الکلام
نے پہلے تو جواب ہو کر ادھر ادھر کی بے کار باتیں کی ہیں پھر اقرار پر بھی مجبور ہو گئے ہیں۔
چنانچہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت نماز کو بھی شامل ہے خواہ اس طرح شامل ہو کہ اس آیت میں
مقتدیوں کو خطاب ہو یا سب مسلمانوں کو جس میں مقتدی بھی داخل ہیں یا اس طرح شامل ہو کہ
خطاب تو کفار کو ہو مگر نمازی اور سب مسلمان عموم علت کی بنا پر داخل ہوں۔ (۱۷ ص ۳۲۸)
اگر بالفرض آیت مذکورہ کا شان نزول صحیح روایات اور آثار سے نماز نہ بھی ثابت ہوتا۔ بلکہ
یہ آیت کافروں کے حق میں ہی نازل ہوتی۔ تب بھی اس کو کافروں پر منحصر سمجھنا اور مسلمانوں
اور مومنوں کو اس سے خارج کر دینا باطل ہے۔ حالانکہ اس کا شان نزول ہی (مومن اور)
نماز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فریق ثانی یہ کہتا ہے کہ اس آیت کا جو اولین سبب اور
مصدق تھا۔ اس کو یہ آیت شامل نہیں ہے۔ یہ تو صرف کافروں کو شامل ہے۔ حیرت
اور تعجب ہے اس غلط نظریہ پر۔

وخاصاً۔ اگر فریق ثانی کی یہی منطق صحیح تسلیم کر لی جائے تو نہ معلوم ان کا قرآن کریم
کے ان عمومی احکام کے بارے میں کیا ارشاد ہو گا جو بظاہر ایک کافر اور مشرک قوم کے
بارے میں نازل ہوئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے نبی آپ
ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں، جو تمہارے رب نے تم
پر حرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ قتل اولاد کا ارتکاب نہ کرو۔
فواحشات کے قریب نہ جاؤ۔ خون ناحق نہ کرو۔ یتیم کا مال نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ (پارہ ۸،
سورۃ انعام) کیا یہ کہنا سجا اور صحیح ہو گا کہ یہ احکام تو کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل
ہوئے ہیں۔ لہذا مومن کے لیے شریک کرنا، قتل کرنا اور یتیم کا مال مہرپ کر لینا بالکل جائز
ہے؟ فریق ثانی نے یہ عجیب قاعدہ نکالا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ فرما دیں کہ ہم تو گروہ بندی کا

شکار ہو کر قاعدہ سے بے نیاز ہیں۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ

اے اسیرانِ قفص میں تو گرفتاروں میں جس

تیسری جزو کا جواب

ہو سکتا ہے کہ تیسرے صاحب کا سیاق و سباق کے بارے میں قاعدہ ہی کو قتی نرالا اور ماوراء
الادراک ہو اور ہم اس کو نہ سمجھ سکیں۔ لیکن بھلا اللہ تعالیٰ اس آیت کا سیاق اور سباق ہم بیان
کر سکتے ہیں اور تیسرے صاحب کو فکر و غور کی دعوت دیتے ہیں اور مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ
ارشاد فرمائیں کہ غور کس نے نہیں کیا؟

اہل ایمان کے تین درجے ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ جو لوگ توحید و معرفت
کے تمام زینوں کو طے کر کے اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں کہ کارخانہ زمین و آسمان کی علوی
اور سفلی چیزیں مشاہدہ کے طور پر ان کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ عین الیقین تک پہنچ
جاتے ہیں تو ایسے لوگ اصحاب بصیرت کہلاتے ہیں اور جو لوگ نظر و استدلال سے کسی
حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ علم الیقین کے درجہ تک پہنچ کر خود ان
کا قدم ہدایت سے ایک انچ نہیں ہٹتا اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں تو وہ ہادی
اور ہدی کہلاتے ہیں اور جن کو نہ پہلا درجہ حاصل ہوتا ہے اور نہ دوسرا، صرف یہی جانتے
ہیں کہ حق تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے وہ گروہ عامۃ المؤمنین کا ہے،
جن کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق رحمت
کے امیدوار ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

هَذَا ابْصَارٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ - وَلَا ذَا قُرْبَى الْقُرْآنِ
فَاسْمِعُو لَهُ وَانصتوا لعلکم ترحمون۔
یہ سمجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور
ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو مومن ہیں اور
جس وقت قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے

رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔ (پ ۹، اعراف ۲۳)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کو علی الترتیب هذا ابصار من ربکم و
هدی ورحمۃ کے ارشاد سے بیان فرما کر لقوم یؤمنون کہہ کر سب کو مومن کا خطاب

اور لقب عطا فرمایا ہے اور آگے قرآن کریم کی طرف توجہ کرنے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔
اس سے زیادہ صحیح اور مضبوط ربط اور کیا ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت لقوم یؤمنون۔

پر ختم ہوتی ہے اور دوسری واذا قرئ القرآن الایۃ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں
مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کا ذکر ہوتا ہے اور دوسری آیت میں بصیرت، ہدایت اور
رحمت کے سرچشمے قرآن کریم کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ کی رحمت کا ذکر ہے اور دوسری
میں لعنکم ترجموں سے مستحقین رحمت کا تذکرہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس مضمون کا اپنے سیاق
سباق سے اور کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور تمام اہل اسلام اور جملہ معتبر مفسرین کے اجماع اس کا یہی ربط
اور تعلق سمجھے ہیں۔ خوفِ طوالت سے صرف دو شہادتیں ہی نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

علامہ خازن لکھتے ہیں کہ

واذا قرئ علیکم ایہا المؤمنون القرآن
فاستمعوا لہ یعنی اصغوا لہ باسما عکم
لتفہموا معانیہ وتتدبروا مواظمہ وانصتوا
یعنی عند قراءتہ۔

(تفسیر خازن جلد ۲ ص ۲۸۷)

اور حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ کافر لوگ قرأتِ قرآن کے وقت شور و غل مچا کر تے تھے۔

وقد امر اللہ عبادہ المؤمنون
خلوف ذلك فقال واذا قرئ القرآن فاستمعوا
لہ وانصتوا لعلمکم ترجموں (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۸۹)

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کے سردار سید الانبیاء و امام المرسلین و خاتم
النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے کہ آپ اپنے رب کو دل میں عاجزی
اور زاری کرتے ہوئے صبح و شام یاد کرتے رہیں گو خطاب آپ کو ہے لیکن گفتہ آید در حدیث
دیگر کے قاعدہ کے مطابق حکم سب کو دیا گیا ہے۔

بہر حال اس آیت سے قبل بھی مومنوں کا ذکر ہے اور بعد بھی اہل ترین مومن سے خطاب

ہے۔ میرے صاحب کو اس سے بہتر سیاق و سباق کہاں سے ملیگا مگر ہاں یہ بات الگ ہے کہ
 لا نسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بفضلہ تعالیٰ ہم نے توحق و فاداکر دیا ہے شاید آپ
 فرماویں۔

پلک کر کہ رہا ہے جانے کیا کیا تیرے گوشے میں
 عجب انداز ہے اس کا یہ کوئی دل جلا ہوگا۔

تیسرا اعتراض؛

مبارک پوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول خطبہ ہے جیسا کہ امام
 بیہقی نے (کتاب القراءۃ ص ۷۵ میں) لکھا ہے۔ لہذا اس آیت سے قرأت خلف الامام کے
 عدم جواز پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۲۵)

جواب

یہ اعتراض بھی بے حقیقت اور بے کار ہے؛ اولاً: اس لیے کہ دلائل اور براہین سے
 یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شان نزول ہی نماز ہے خطبہ وغیرہ اس کے عمومی اور
 ضمنی حکم میں شامل ہے۔

وثانیاً۔ خطبہ سے اگر جمعہ کا خطبہ مراد ہو تو امام بغوی کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ
 جمعہ کی فرضیت مدینہ میں ہوتی ہے اور آیت مکی ہے۔ اور امام ابن جریر لکھتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت
 مدینہ میں ہوتی ہے حالانکہ آیت مذکورہ بالاتفاق مکی ہے اور مولانا عبدالصمد لکھتے ہیں کہ جو لوگ
 اس آیت کا شان نزول خطبہ بتلاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور خطبہ کا
 حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ (اعلام الاعلام) اور اگر خطبہ سے مراد عید کا خطبہ ہے تو وہ بھی صحیح
 نہیں کیونکہ عید کی نماز کا حکم بھی مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ (طبری ص ۱۲۸)

وثالثاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس آیت کا شان نزول جمعہ یا عید کا خطبہ ہے
 تو اس سے نماز کو بالیقین خارج کرنا کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے؛ جب کہ امت کا ایک معتد بہ طبقہ
 اس کا قائل ہے کہ اسباب نزول میں تعدد بھی جائز ہے جیسا کہ شیخ عبدالرحمن بن حسن نے اس
 کی تصریح کی ہے۔ (فتح المجید شرح کتاب التوحید ص ۱۵)

اور صحیح احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لہذا اگر اس کا شان نزول خطبہ بھی ہو اور نماز بھی ہو تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا۔ الحاصل یہ اعتراض نقلاً و عقلاً ہر لحاظ سے مردود ہے اور ایک بھی صحیح روایت اس کی تائید نہیں کرتی کہ آیت مذکورہ کا شان نزول خطبہ ہے۔ روایات پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ رہی یہ بات کہ یہ نظر یہ امام بیہقیؒ ایسے مشہور امام کا ہے تو یہ کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ مبارکپوری صاحب نے ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اگرچہ ایک مشہور محدث ہیں۔ مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲، ص ۳۲)

مثلاً بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ و ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ و نسائی جلد ۱ ص ۱۱۴ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں آیت لا تجهر بصلواتك ولا تخافت بها... الآية کا شان نزول نمازیان کیا گیا ہے۔ اور بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ اور ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ میں اسی آیت کا شان نزول دعا بتلائی گئی ہے اور محققین کی تصریح ہے کہ یہ تعدد اسباب نزول کا واضح ثبوت ہے۔

فائدہ: یہ تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ آیت مذکورہ کا صحیح اور حقیقی شان نزول نماز اور صرف نماز ہے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا شان نزول خطبہ ہے تو وہ صرف اس مفہوم کے اعتبار سے کہ اس آیت کا مضمون عموم الفاظ کے لحاظ سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ گویا یہ بھی اس کا شان نزول ہے۔ چنانچہ امام سیوطیؒ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۱) اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ (الفوز الکبیر ص ۲۲) اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "وقسمے آنت کہ معنی آیت خود نام است بغیر احتیاج دانستن حادثہ کہ سبب نزول شدہ است و حکم عموم لفظ راست نہ خصوص سبب را قدمائے مفسرین بقصد احاطہ نا مناسبہ آن آیت یا بقصد بیان ماصدق آن عموم آن قصہ را ذکر کردہ اند این قسم را ذکر کردن ضروریست۔ و صحابہ و تابعین بسیار بود کہ نزول فی کذا و کذا می گفتند و غرض ایشان تصویر ماصدق آن آیت بود و ذکر بعض حوادث کہ آیت آن را بعموم خود شامل شدہ است خواه این قصہ متقدم باشد یا متاخر و خواہ اسرا باشد..... یا جاہلی یا اسلامی تمام قیود آیت را در گرفتہ باشد یا بعض آن را و این جادانستہ شد کہ اجتهاد را درین قسم دخلی هست و قصص متعددہ را آن جا گنجایش پس ہر کہ این بحث مستحضر دار دخل مختلفات سبب نزول با دنی عنایت میتوان نمود۔ (اکسیر ص ۱۹) بہر حال شان نزول اس واقعہ میں گونا گونا گوں ہے لیکن خطبہ بھی ماصدق آن آیت کا مصداق ہے۔

چوتھا اعتراض

مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت واذقہم القرآن... الاذیة قرآن کریم کی دوسری آیت فاقروا ماتیسر من القرآن... الاذیة سے منسوخ ہے۔ لہذا اس سے مسئلہ خلف الامام کیسے ثابت ہوگا اور اس دعویٰ کے دلائل یہ ہیں:

- ۱۔ امام ابو نصر مزنی (المتوفی ۲۹۳ھ) لکھتے ہیں کہ آیت فاقروا... الاذیة مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں جہاد اور قتال کا حکم ہے اور جہاد کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔ (قیام السیل)
- ۲۔ امام سیوطی نقل کرتے ہیں کہ باقی تمام سورۃ منزل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر فاقروا اما تیسر... الاذیة (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۱۳)

۳۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ روزے بالاتفاق مدینہ فرض ہوئے ہیں اور حضرت قیس رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل ہمیں صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم تھا۔ جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو نہ ہمیں فطرانہ ادا کرنے کا تاکید ہی حکم دیا گیا اور نہ اس سے منع کیا گیا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۱۱) اور اس آیت فاقروا ماتیسر... الاذیة میں زکوٰۃ کا حکم بھی ہے۔ اور زکوٰۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی اور صدقہ فطر صوم رمضان کا تمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت فاقروا ماتیسر... الاذیة مدنی ہے۔ لہذا یہ ناسخ اور آیت واذقہم القرآن... الاذیة منسوخ ٹھہری اور منسوخ آیت سے استدلال اور احتجاج باطل ہے۔ (اوکما قال تحقیق الکلام ۲ ص ۳۶)

جواب: یہ دعویٰ بھی قطعاً باطل اور بے بنیاد ہے۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ

فرمائیں۔

پہلی شق کا جواب: حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام ابو نصر کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ اس لیے کہ تمام اہل اسلام اس پر متفق ہیں کہ سورۃ منزل کی آخری آیت بھی مکہ ہے۔ امام ابو نصر کو قتال اور جہاد کے حکم سے جو شبہ ہوا ہے۔ وہ مردود ہے۔ کیونکہ اس میں ارشاد لیل ہوتا ہے۔

۱۷ ان کی یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۶۹، ابن ماجہ ص ۱۳۲، طیالسی ص ۱۶۸ اور مستدرک جلد ۱ ص ۱۷۸ وغیرہ میں مروی ہے۔

عَلِمَ أَنَّ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرَضَىٰ وَآخَرُونَ
 يَصِيبُونَ فِي الْأَرْضِ... الآية
 اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ عنقریب تم میں بعض آدمی
 بیمار ہوں گے اور بعض دیگر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں
 نکلیں گے۔

اور بیماری و سفر میں پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز ادا نہیں ہو سکے گی۔ اس کی تاکید اللہ تعالیٰ
 نے ساقط کر دی ہے اور اس آیت میں سَيَكُونُ (حرف سین جو استقبال کے لیے آتا ہے) سے
 خوشخبری سنا کر وجود مشقت سے پہلے ہی تہجد کی نماز کی فرضیت ساقط کر دی گئی ہے۔ اس سے
 یہ کیونکر ثابت ہوا کہ جہاد اور قتال کا حکم اس وقت نازل ہو چکا تھا؟ بہر حال آیت مکہ مکرمہ میں
 نازل ہوتی ہے اور اس میں زمانہ مستقبل میں جہاد اور قتال کے حکم کی خوشخبری سنائی گئی ہے اگر
 امام ابو نصر سیکون میں حرف سین پر ہی نگاہ ڈال لیتے جو استقبال کے لیے آتا ہے تو ایسی فاش غلطی
 کا ارتکاب نہ کرتے اور نہ اس آیت کو مدنی کہنے پر مجبور ہوتے۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۳۹۳)

دوسری شق کا جواب: امام سیوطی نے یہ قول نقل کیا ہے لیکن پورے زور کے ساتھ اس کی تردید
 بھی کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورہ منزل کی آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی
 ہے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سورہ منزل
 کا آخری حصہ پہلے حصہ کے نزول کے پورے ایک سال بعد نازل ہوا ہے۔ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۸)
 اور سورہ منزل قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔ چنانچہ مبارک پوری صاحب لکھتے
 سب سے پہلے سورہ قلم نازل ہوئی اور اس کے بعد سورہ منزل۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

۱۷ اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وجود مشقت سے قبل تفسیح صحیح نہیں یا اس میں تردد ہو تو اس کو معراج کی وہ
 طویل حدیث پڑھنی چاہیے جس میں پچاس نمازوں کی فرضیت کے بعد وجود مشقت سے قبل ہی باقی سب
 نمازیں معاف کر کے صرف پانچ ہی باقی رکھی گئیں ہیں۔

۱۸ ان کی یہ روایت مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶، نسائی جلد ۱ ص ۱۸۲، ابوعوانہ جلد ۲ ص ۳۲۲ اور مستدرک
 جلد ۱ ص ۵۵ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے اور اسی مضمون کی روایت حضرت ابن عباس سے
 بھی مروی ہے۔ مستدرک جلد ۲ ص ۵۰۵ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۵۰۵۔ الغرض یہ صحیح روایتیں ابن عمر سے
 کی اس روایت سے جس میں یونس بن حبیب وغیرہ راوی موجود ہیں جن کا اتنا پتا کتبہ حال سے نہیں ملتا۔ بدرجہا
 زیادہ قابل اعتماد ہیں۔

جب صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا کہ سورۃ منزل من وعن سب ملکی ہے تو اس کو ملنی کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

تیسری شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکا تھا۔ کیونکہ سورۃ مومنوں، سورۃ حم سجدہ اور سورۃ لقمان وغیرہ تمام ملکی سورتوں میں زکوٰۃ کا حکم موجود ہے پھر یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں نہیں ہوئی تھی۔ باقی یقیناً الزکوٰۃ کو تزکیۃ نفس پر حمل کرنا تاویل بعید اور توجیہ رکبیک کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور حضرت جعفر طیارؓ نے دربارِ نجاشی میں جو تقریر کی تھی اس میں زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے حالانکہ مہاجرین حبشہ شدہ نبوت میں ہجرت کر گئے تھے۔ (طبری ص ۱۱۱۸، زاد المعاد جلد ۲ ص ۴۱)

امام الائمہ ابن خزیمہ المتوفی ۳۱۱ھ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (فتح الباری ۳/۲۱۱ ص ۲۱۱) امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۲۳۵) سید آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ اکثر علما کی تحقیق یہ ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (روح المعانی جلد ۱۹ ص ۱۲۱) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ سورۃ منزل کی آخری آیت ان لوگوں کی تائید کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نفس زکوٰۃ تو مکہ میں فرض ہو چکی تھی لیکن اس کے نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۲۳۹)

حضرت ابن عمرؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اور تعیین نصاب سے پہلے اپنی ضرورت سے زائد سب مال صرف کر دینے کا حکم تھا۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۱۴) اس تحقیق کو پیش نظر رکھنے کے بعد حضرت قیس بن سعد کی روایت کا مطلب یہ ہو گا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کی تعیین سے قبل صدقہ فطر کی اس لیے تاکید کی جاتی تھی تاکہ فقرا اور مساکین کی امداد اور اعانت لے یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ میں مختصراً اور مسند احمد جلد ۵ ص ۲۹۱ اور مستدرک جلد ۲ ص ۳۱۰ وغیرہ میں مفصلاً موجود ہے۔ قال الحاکم والذہبی علی شرطہما۔

لے یہ بات بھی نہ بھولیے کہ صحابہ کرامؓ کی ملکی زندگی اور مدینہ طیبہ کا ابتدائی دور غربت اور فلاس کا دور تھا اس میں زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا صدقہ فطر کے تاکید کا حکم سے اس کی تلافی کر دی گئی تھی۔

بخوبی ہو سکے اور جب شہ کے ننگ بھگ زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار مقرر ہوتی تو صدقہ فطر کا وہ تاکید اور فرضی حکم باقی نہ رہا۔ گو روزہ و صدقہ فطر کا حکم اور زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوتی اور صدقہ فطر بعض ائمہ کی تحقیق میں اب بھی واجب ہے مگر فرض نہیں۔ اس بحث کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مبارک پوری صاحب کی ستم نظریہ دیکھیے کہ وہ کس بے باکی سے یہ لکھتے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فاقرو امانیتس۔... الایۃ مدنی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶) فوا اسفا آپ دلائل واضحہ کے ساتھ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی عقلی اور نقلی شہادتوں سے فاقرو امانیتس۔... الایۃ کا مکمل ہونا ثابت ہو چکا۔

پانچواں اعتراض

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ فاقرو امانیتس۔... الایۃ سے واذا قرئ القرآن.. الایۃ منسوخ نہیں۔ لیکن اس میں نسخ کا احتمال تو موجود ہے۔ جب اس میں یہ احتمال موجود ہے تو اس سے استدلال کیسے؟ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ نسخ کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ وہ محض بے بنیاد احتمالات سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اثبات کے لیے قطعی، محکم اور اٹل دلائل کی ضرورت ہے اور صرف ظن اور تخمین سے قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔

وثانیاً۔ یہ احتمال صرف مبارک پوری صاحب کے خیال مبارک میں ہی آیا ہے یا امام احمد بن حنبلؒ، حافظ ابن عبدالبرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ بلکہ جہور سلف و خلف کو بھی یہ نکتہ ہاتھ آیا ہے؟

اگر یہ احتمال کسی دلیل و برہان پر مبنی ہوتا تو جہور اہل اسلام کا اس آیت سے استدلال کیسے صحیح ہوتا؟ اور باوجود ان حضرات کے علم کی گہرائی کے اس احتمال کی طرف ان کا ذہن کیوں نہ گیا؟

وثالثاً۔ خود مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت فاقرو امانیتس سے قرأت کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الاحادیث جلد ۱ ص ۲۰۴) تو اس آیت سے ہر ہر مقتدی کی قرأت کے

وجوب پر استدلال کیونکر درست ہوا؟ اور آیت واذا قرئ القرآن.. الایۃ اس سے منسوخ کیسے ٹھہری؟ کیونکہ اس میں استماع اور انصات کا حکم سب مقتدیوں پر بہر حال واجب اور

لازم ہے اور فاقرؤا سے فرضیت ہی ثابت نہیں ہے۔

ورابعا۔ مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ سورۃ منزل پہلے نازل ہوئی ہے۔ (جس میں فاقرؤا ماتیسر کی آیت ہے) اور سورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے (جس میں واذا قرئ القرآن... الایۃ ہے۔) (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۹) اور پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ منزل کا آخری حصہ بھی مکی ہے اور اول و آخر میں صرف ایک سال کا وقفہ ہے۔ پھر محض خیال سے متاخر سورۃ کو منقذ سے منسوخ کرنے کا کیا مطلب ہے؟

وخماسا۔ نواب صاحب سورہ اعراف کے متعلق لکھتے ہیں کہ دروے کے ایک آیت یادو آیت منسوخ است باقی ہمہ محکم۔ اول۔ نخذ العفو و امر بالعرف۔ دوم۔ و اعرض عن الجہلین (افادۃ الشیوخ ص ۶۵) تو محکم آیات کے منسوخ ہونے کا کیا معنی ہے؟

چھٹا اعتراض: مولانا تیسر صاحب سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں میں احناف کے نزدیک تعارض ہے۔ جیسا کہ ملا جیون اور صاحب تلویح نے لکھا ہے۔ لہذا اس تعارض کے ہوتے ہوئے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۴۳۸) مبارک پوری صاحب نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۸، ابحار المنن ص ۱۴۸ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۸)

جواب:

بلاشک ملا جیون حنفی تھے لیکن مدار صرف دلائل پر ہے۔ شخصیتوں پر نہیں ہے اور تلویح کے مصنف علامہ سعد الدین قسزانی (المتوفی ۴۹۱ھ) حسب تصریح علامہ حسن چلیپی (المتوفی ۴۸۸ھ) و علامہ سیوطی رح (المتوفی ۹۱۱ھ) و علامہ محمود الکفوی رح (المتوفی ۴۹۰ھ) و علامہ کاتب چلیپی رح (المتوفی ۱۰۶۷ھ صاحب کشف الظنون) شافعی المسک تھے۔ احناف میں ان کا شمار غلط ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تعارض کے لیے شرائط کیا ہیں؟ حافظ ابن حجر رح (شرح نجات الفکر ص ۴۷ میں) بیان کرتے ہیں کہ تعارض کی شرطیں یہ ہیں:

۱۔ دونوں حکموں کا محل ایک ہو۔

۲۔ تقدم اور تاخر معلوم نہ ہو سکے۔

۳- ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے۔

۴- دونوں میں تطبیق نہ ہو سکے۔ مگر ان دونوں آیتوں میں تعارض کی ایک شرط بھی موجود نہیں ہے۔

دونوں کا محل جِدًا جِدًا ہے؛ ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول فرضی نماز ہے اور آیت فاقرؤا ماتیسر کا محل نماز تہجد ہے جیسا کہ ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۹۲ اور عون المعبود جلد ۱ ص ۵۰۳ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وهذا معروف مشہور فیما بین اهل العلم۔ (کتاب القراءة ص ۱۵۳) اور یہ امر اہل علم میں مشہور و معروف ہے اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت صلاة تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۳۷۸) خطیب شربینی رحمہ اللہ جو بڑے پایہ کے مفسر تھے لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول تہجد کی نماز ہے۔ (السراج المنیر جلد ۴ ص ۲۳۸) علامہ نسفی لکھتے ہیں کہ یہ صلاة تہجد کے بارے میں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود بکبیر جلد ۸ ص ۳۸) مبارک پوری صاحب بھی صاحب روح المعانی سے یہ مضمون نقل کرتے ہیں (تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۷)۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ نزلت فی قیام اللیل فلیست مما نحن فیہ (نیل جلد ۲ ص ۲۱۸) یعنی یہ آیت نماز تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ہمارے اس مسئلہ سے (کہ سورۃ فاتحہ رکن ہے یا جہاں سے بھی پڑھ لیا جائے صحیح ہے) اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مولانا میر صاحب لکھتے ہیں کہ سورہ منزل کا یہ رکوع نماز تہجد میں تحفیف کے لیے اتر ہے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۴۲۳) جب ایک آیت کا محل فرضی نماز ہے اور دوسری کا تہجد کی نماز ہے تو پھر تعارض کیسے؟ کیونکہ تعارض کے لیے وحدت محل شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔

دونوں کا تقدم اور تاخر: پہلے پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ ان کے تقدم اور تاخر کا علم اور تو اور خود مبارک پوری صاحب کو بھی اقرار ہے کہ سورۃ منزل پہلے اور سورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے۔ سو تعارض کی یہ شرط بھی نہ پائی گئی۔

وجہ ترجیح :

اگر بالفرض دونوں کا محل بھی ایک ہوتا اور تقدم و تاخر بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی واذ قرئ القرآن... الآية کے حکم کو ترجیح ہوتی۔ کیونکہ صحیح روایات اور آثار اور جمہور سلف و خلف کی اکثریت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مقتدی کو قرأت خلف الامام سے منع کیا گیا ہے ترجیح کے لیے یہ دلیل کیا کم وزنی ہے؟

جمع و تطبیق: علاوہ بریں ان دونوں آیتوں میں جمع و تطبیق بھی چنداں دشوار اور مشکل نہیں ہے کیونکہ واذ قرئ... الآية مقتدی کے حق میں ہے جو باجماعت فرض نماز پڑھتا ہو اور فاقروا ماتیسر تہجد کی نماز کے بارے میں ہے جو انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی آیت صرف سورۃ فاتحہ کو شامل ہو کیونکہ قرآن العظیم کا اطلاق اسی پر ہوا ہے اور فاقروا ماتیسر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہو۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بلند صحیح یہ روایت مروی ہے کہ فاقروا ماتیسر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہے۔ (کتاب القراءة ص ۶، ص ۱۵۳، ۱۵۴) اور امام دارقطنیؒ حضرت ابن عباس سے باسناد حسن اسی مضمون کی روایت نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لیے حجت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فاقروا ماتیسر ما زاد علی الفاتحہ پر مجمول ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹) اور میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ الغرض آیت فاقروا ماتیسر میں اگر قرأت سے مراد قرأت القرآن فی الصلوٰۃ مراد لی جائے تو اس سے مراد فاتحہ کے بعد کی قرأت ہے۔ (واضح البیان ص ۴۴۵)

اور چونکہ فریق ثانی کے نزدیک بھی ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مقتدی کے لیے ممنوع ہے۔ لہذا اس سے مراد صرف منفرد ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاقروا ماتیسر کا حکم امام کے لیے ہو۔ اور واذ قرئ القرآن صرف مقتدی کے لیے۔ اندر میں حالات جب جمع و تطبیق کی صحیح صورتیں بھی سامنے موجود ہیں تو تعارض کا دعویٰ بالکل باطل ہو گیا۔

ساتواں اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت واذ قرئ القرآن... الآية پہلا

جواب خود حنفی دیوبندی کے قلم سے کہ جو شخص اس آیت سے خلف الامام کے منسوخ ہونے پر استدلال کرتا ہے اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ آیت افتراض صلواتِ خمسہ کے بعد نازل ہوتی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۵)

جواب

کیا قرأت خلف الامام کی ممانعت اور افتراض صلواتِ خمسہ میں کوئی علت اور معلول کا تلازم یا عرفی اور عادی تعلق ہے؟ کیا قرآن کریم کی تعظیم کے پیش نظر قرأت خلف الامام کی ممانعت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پانچ نمازیں ہی فرض ہوں۔ پانچ سے کم نمازوں میں یہ ممکن نہیں ہے؟ پہلے عرض ہو چکا ہے کہ دار و مدار دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ شخصیتوں پر۔ شخصیتیں قابلِ صدا احترام ہیں مگر صحت و سقم کا مبنی دلائل ہیں۔

آٹھواں اعتراض

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرأ القرآن کئی ہے اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ لہذا متقدم حکم سے متاخر حکم کے خلاف استدلال درست نہیں ہو سکتا۔ اور مدینہ میں قرأت خلف الامام کے جواز پر یہ دلیل موجود ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوتی (موطا امام مالک ص ۲۹)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ایک مرتباً حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھانی اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔ میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ اس حدیث کے آخر میں فرمایا: امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔ (کتاب القرات ص ۵۱)

اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس پر اتفاق جماع ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تلخیص الجبیر ص ۱۱۴)

لے یہ مضمون انہوں نے اپنی مشہور کتاب الفرقان ص ۸۹ میں لکھا ہے اور اس کے مولف مولانا ناظر حسن صاحب دیوبندی تلمیذ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہما ہیں۔

۳۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ مدنی ہیں اور انہوں نے قرأت خلف الامام کا ذکر کیا ہے۔
(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

میر صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ احادیث مثبتہ قرآنہ
خلف الامام آیت واذا قرئ القرآن کے بعد فرمائی گئی تھیں۔ کیونکہ عبادہ رضی اللہ عنہ مدنی ہیں اور
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۲۵)

جواب۔ یہ اعتراض بھی محض بے کار ہے: اولاً۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی کسی آیت اور
حکم منسوخ ٹھہرانے کے لیے کسی محکم قطعی اور اہل حکم کی ضرورت ہے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اور
لہ مبارک پوری صاحب نے بزعم خود بڑی دورانہدیشی کا ثبوت دیا ہے اور لکھتے ہیں: اولاً۔ کہ اگرچہ
حضرت عبادہ بن الصامت بیعت عقبہ اولی (جو ۱۲ ہجرت میں ہوئی تھی) اور بیعت عقبہ ثانیہ میں
(جو ۱۳ ہجرت میں ہوئی تھی) حاضر ہوئے تھے۔ لیکن ان کی حاضری سے (یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کی خدمت میں اسلام لانے کیلئے حاضری سورۃ اعراف پہلے نازل ہو چکی تھی کیونکہ مجمع البحار جلد ۲ ص ۵۳۰ میں لکھا ہے
کہ سلمہ نبوت میں پہلے سورۃ جن نازل ہوئی اور پھر سورۃ اعراف۔

وثانیاً۔ یہ کہ عقبہ اولیٰ سے قبل نماز باجماعت مشروع ہی نہ تھی۔ اس لیے بہر حال حضرت عبادہ کی
حدیث کا یہ حکم آیت کے بعد ہی ہوگا۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸ مصلحہ) مگر یہ تمام مقدمات مخدوش
ہیں۔ اولاً۔ اس لیے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی مرفوع روایت صحیح نہیں ہے۔
لہذا وہ مکی ہوں یا مدنی فرق کیا ہوگا؟

وثانیاً۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ رجب سلمہ نبوت میں اور بیعت عقبہ ثانیہ
سلمہ نبوت میں ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۳۵۹)

وثالثاً۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز ابتدائے نبوت سے مشروع تھی۔ (شرح مسلم
جلد ۱ ص ۱۸۲) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نماز باجماعت ابتدائے اسلام سے مشروع تھا۔ (فتح الباری
جلد ۳ ص ۴۰) مسلم جلد ۲ ص ۶۹۶ اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۹۲ میں روایت ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ
مسلمان ہو کر جب اپنی قوم کے پاس گئے تو حضرت ایما رضی اللہ عنہ بن رضہ ان کو جماعت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔
حالانکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے قبل مردوں میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اخبار احاد سے قرآن کریم کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے۔
 وثالثاً۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ
 اپنے مقام پر بیان ہو گا۔ پھر ایسی بے حقیقت، ضعیف کمزور اور معلول روایتوں نص قطعی
 کیونکر منسوخ ہو سکتی ہے؟ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے موطا امام مالک ص ۲۹ میں کوئی روایت
 ایسی نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ اگر مقتدی فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے یہی اُن کی مرفوع
 روایت خراج والی تو وہ موجود ہے اور ان کا قول اقراً بھا فی نفسک یا فارسی بھی موجود ہے
 مگر اس کا مطلب بطلان صلوٰۃ نہیں ہے جس کی بحث جلد ثانی میں آ رہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔
 وثالثاً۔ حافظ ابن حجر مکتبہ میں کہ کسی متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے متقدم الاسلام
 صحابی کی روایت کو بلا دلیل محض تقدم و تاخر کی وجہ سے منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (شرح
 بختہ الفکر ص ۴۷) نہ معلوم متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے نص قرآنی کیسے منسوخ ٹھہرائی
 جاسکتی ہے؟

وراباً۔ کیا صرف حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی مدنی تھے یا حضرت ابوہریرہ
 الاشعری رضی اللہ عنہ، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک، حضرت
 زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وغیرہ بلکہ خود حضرت ابوہریرہ رضی
 اللہ عنہ بھی جن سے قرأت خلف الامام کی ممانعت کی روایتیں مروی ہیں مدنی تھے؟

(بقیہ پچھلا صفحہ) اور بیسیوں میں صرف حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہوئی تھیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۱ و اکمال ۵۹۳)
 مگر اس ابتدائی دور میں بھی جماعت ہوتی تھی۔

لہٰذا صاحب لکھتے ہیں کہ ناسخ مثل منسوخ با شد در قوت بلکہ اقوی از ان چہ در صورت ضعف
 منزل قوی نہ تواند شد و این حکم عقل است و اجماع بر آن دلالت کردہ چہ صحابہ رضی اللہ عنہم نص قرآن را بدخیر
 واحد منسوخ نہ کردہ اند۔ (افادۃ الشیوخ بمقدار النسخ و المنسوخ ص ۵)

حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ علامہ حنفیہ کا ضابطہ یہ بیان کرتے
 ہیں۔ ان تخصیص العام القطعی بنخبہ الاحاد خیر جائز..... الخ (غیث الغمام ص ۲۵)
 کہ عام قطعی کی تخصیص خبر واحد سے جائز نہیں ہے۔

وخاصاً۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے موقوف اور غیر صریح قول سے نص قرآنی کس طرح منسوخ ہو سکتی ہے۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ مرفوع حدیث کے مقابلے میں امت میں سے کسی کا قول قابل قبول نہیں ہو سکتا چنانچہ امام شافعی رحمہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلے میں ماوشما کے قول کی کیا وقعت ہے؟ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۵۳)

امام ابن خزمیہ کا بیان ہے کہ حدیث کے مقابلے میں کسی کی بات حجت نہیں ہو سکتی۔ یحییٰ بن آدم فرماتے تھے کہ مرفوع حدیث صحیح کے مقابلے میں کسی کا قول معتبر نہیں ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۸۲)

امام بخاری رحمہ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب حدیث ثابت ہو جائے تو پھر کسی امتی کا قول قابل اعتما و نہیں ہے (جزء القراءة ص ۱۱) امام بیہقی رحمہ لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کی حدیث کے مقابلے میں کسی امتی کا قول قابل اعتبار نہیں ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۶۳)

محدث ابن حزم لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کی موجودگی میں کسی کی بات قابل قبول نہیں ہے (محل جلد ۱۰ ص ۱۷۰) شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو پھر کسی کی بات حجت نہیں ہے۔ (رفع الملام عن ائمة الاعلام ص ۶۴) نواب صاحب لکھتے ہیں: زیرا کہ حجت در روایت صحابی است نہ در رائے و فعل و سے (بدور الالہ ص ۵۵) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ علامہ شوکانی رحمہ در مؤلفات خود ہزار بار می نویسند کہ در موقوفات صحابہ حجت نیست (دلیل الطالب ص ۶۱)

عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو فریق ثانی کے نزدیک مع قوفات صحابہ حجت نہیں ہیں اور دوسری طرف ان سے واذا قرئ القرآن کی آیت قرآنی منسوخ قرار دی جاتی ہے۔ فاسفاح میں وہ جو ان میں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔

وَسَادَسًا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو روایت امام بیہقی رحمہ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ کمزور اور ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی داہر بن نوح ہے۔ امام دارقطنی لکھتے ہیں وہ قوی نہیں۔ ابن حبان رحمہ کہتے ہیں۔ اس کی روایتوں میں خطا ہوتی ہے۔ ابن قسطلان لکھتے ہیں کہ وہ مجہول ہے۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۳۱۳)

دوسرا راوی اس سند میں ربیع بن بدر ہے۔ امام بخاری لکھتے ہیں کہ امام ابن قتیبہ اسکو ضعیف

کہتے تھے (ضعفاء صغیر ص ۱۲) امام نسائی رحمہ اللہ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی ص ۲۲) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ وہ متروک تھا۔ (تقریب ص ۱۲۱) امام ابن معین رحمہ اللہ، ابو داؤد رحمہ اللہ اور ابن عدی وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳۳۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۳۸) یعقوب بن سفیانؒ اور ابن خراشؒ اسے متروک کہتے ہیں۔ جوزقانی رحمہ اللہ اس کو واہی الحدیث اور ابو حاتمؒ اس کو ذاہب الحدیث اور ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ عجلیؒ محمد بن عثمانؒ اور عثمان بن ابی شیبہ رحمہ اللہ سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگوں سے موضوع اور جعلی روایتیں بیان کرتا تھا۔ ابن جبانؒ، دارقطنی رحمہ اللہ اور ازدیؒ سب اسے متروک کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۳۹)

حضرات! آپ مبارک پوری صاحبؒ کی کرامت ملاحظہ کیجئے کہ اس روایت سے وہ واذا قرأ القرآن... الاٰیۃ کو منسوخ قرار دینے پر اُدھار کھاتے بیٹھے ہیں۔ تعجب اور حیرت ہے ایسے علم پر۔ وَسَابِعًا۔ کیا جہور کی طرف سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ کے موقع پر قرأت خلف الامام کا حکم سنا ہو اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح اور مرفوع حدیث واذا قرأ فانصتوا اور مالی اتانح القرآن الحدیث سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہو۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام ہیں اور سنیہ کو مسلمان ہوتے تھے۔ حدیث، حدیث کے مقابل میں آگئی اور نص قرآنی محفوظ رہ گئی۔

وَتَأْمَنًا۔ اگر محض احتمال کا نام ہی استدلال ہے تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ میں یہ حکم سنا ہو اور آیت واذا قرأ القرآن مدینہ میں نازل ہوئی ہو۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تفسیر جلد ۲ ص ۲۵۴ میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اپنی تفسیر فتح البیان جلد ۳ ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ سورہ اعراف مدنی ہے۔ کیونکہ اس سُورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی اُمت یہود کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ یہود کا مرکز مدینہ طیبہ تھا نہ کہ مکہ مکرمہ، لہذا ثابت ہوا کہ یہ ساری سُورۃ ہی مدنی ہے۔ ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

نواں اعتراض

امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذ قرئ القرآن کا شان نزول یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت میں بلند آواز سے نماز میں تکلم کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے:

۱۔ محمد بن دینار کہتے ہیں۔ ہم سے ابراہیم بھجری نے بیان کیا۔ وہ ابو عیاض سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں تکلم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ واذ قرئ القرآن الآية نازل ہوئی۔

۲۔ مولیٰ بن اسمعیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہی مضمون نقل کرتے ہیں۔

۳۔ عبد اللہ بن عامر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ صحابہ بلند آواز سے نماز میں گفتگو اور تکلم کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

۴۔ عاصم بن عمر، حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں تکلم کیا کرتے تھے جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ممانعت قرأت سے نہیں بلکہ تکلم اور رفع اصوات سے ہے اور تکلم فی الصلوٰۃ و رفع اصوات اور چیز ہے اور قرأت فی الصلوٰۃ الگ امر ہے۔ (کتاب القراءة ص ۷۷)

جواب امام موصوف کا یہ بیان باطل ہے۔

اڈو۔ اس لیے کہ صحیح اسانید سے پہلے یہ امر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شان نزول قرأت خلف الامام کا منفی پہلو ہے۔ عام تکلم اور رفع اصوات اس کا شان نزول نہیں ہے۔

وثانیاً۔ امام موصوف نے جنہی روایتوں سے احتجاج کیا ہے۔ وہ سب ضعیف کمزور اور معلول ہیں۔ پہلی روایت میں ایک راوی محمد بن دینار ہے۔ امام ابن معینؒ، دارقطنیؒ اور نسائیؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ عقیلیؒ کا بیان ہے کہ اس کی حدیث میں وہم ہوتا ہے۔ ابو داؤدؒ فرماتے ہیں کہ ان کا حافظہ آخر میں متغیر ہو چکا تھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۱۵۵)

دوسرا راوی اس کڑھی کا ابراہیم بھجری ہے۔ امام ابن معینؒ، نسائیؒ، ابو زرؒ، ترمذیؒ، احمدؒ، سعدیؒ، حربیؒ اور ابو حاتمؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور ابو حاتمؒ اس کو منکر

الحديث كتمتہ ہیں۔ ابن عدیٰ کا بیان ہے کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ علی بن الحسین بن ابیخدیجہ
 كتمتہ ہیں کہ وہ متروک ہے۔ (میزان جلد ۱ ص ۳۱، تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۵)
 دوسری روایت میں مولیٰ بن اسمعیل ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے۔
 ابو حاتم رحمہ اللہ اس کو کثیر الخطا کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان کی روایات میں کثرت سے خطا ہوتی
 ہے۔ یعقوب بن سفیانؒ فرماتے ہیں کہ اہل علم کو ان کی روایات سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ وہ
 منکر روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ساجیؒ اس کو کثیر الخطا کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ اور ابن سعدؒ اس کو کثیر الخطا
 اور کثیر الغلط کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ اس کو کھنٹی سے تعبیر کرتے ہیں۔ محمد بن نصرؒ مروزی اس کو سنی الخفظ
 اور کثیر الخطا کہتے ہیں۔ امام ابو زرہؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الخطا ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۲۱،
 تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۸۰)

تیسری سند میں عبداللہ بن عامر ہے۔ امام احمدؒ، ابو زرہؒ، ابو عاصمؒ، نسائیؒ، ابو داؤدؒ، دارقطنیؒ
 محدث سعدی سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ ان کو لیس بشیخ اور ابو احمد الحاکم رحمہ
 لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابن ماجہؒ اس کی ذیل ضعیف کرتے ہیں (ضعیف ضعیف) ابو حاتمؒ اس
 کو متروک کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ان کے حافظہ کی شکایت کرتے ہیں۔ (میزان
 جلد ۲ ص ۵۱ و لسان جلد ۳ ص ۳۰۳، تہذیب جلد ۵ ص ۲۶۵)

چوتھی روایت میں عاصم بن عمر ہے۔ امام احمدؒ، ابن معینؒ اور جوزقانیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔
 علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جس راوی سے متعلق امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہیں۔ اس
 حدیث روایت کرنا جائز نہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۵۱) اور اسی طرح طبقات سبکیؒ جلد ۲ ص ۹ اور
 تدریب الراوی ص ۲۳۵ میں ہے کہ امام بخاریؒ جس کو منکر الحدیث فرمائیں، لا تحل الروایۃ عنہ۔
 ایسے راوی سے روایت بیان کرنا جائز اور حلال نہیں ہے۔

لطیفہ: فریق ثانی صحیح ابن خزیمہ کے حوالہ سے فوق الصدق کی جو روایت پیش کیا کرتا ہے اس کی سند
 میں بھی یہی مولیٰ بن اسمعیل واقع ہے (دیکھئے اعلام الموقعین جلد ۳ ص ۹ اور بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۹) کیا
 بعید ہے کہ اصل روایت تحت السره ہو اور مولیٰ بن اسمعیل کی کثرت خطا کا نشانہ بن کر روایت فوق الصدق
 ہو گئی ہو۔
 نہ تم صدے ہمیں دیتے نہ ہم فریادیوں کرتے،
 نہ کھلتے راز سر بستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث اور ترمذیؒ متروک کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۴، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۵۱) یہ ہیں وہ روایات اور آثار جن پر امام بیہقیؒ نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔
 قال اللہ المشتکی۔

وَالثَّاءُ۔ امام بیہقیؒ کی یہ غلطی ہے کہ وہ تکلم فی الصلوٰۃ سے صرف عام انسانی تکلم اور گفتگو مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ تکلم کا مفہوم عام ہے جس میں قرأت قرآن، تسبیح، تہلیل، تہمید، تکبیر، نماز، خطبہ اور جملہ ادعیہ آجاتی ہیں۔ لہذا نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ میں سورہ فاتحہ کی نہی بھی آجائے گی۔ کیونکہ عام کی نفی سے خاص کی نفی عین عقلی اور منطقی قاعدہ ہے۔ تکلم کا مادہ کلام اور کلمہ ہے۔ اور قرآن کریم میں متعدد مقامات اور مختلف مواضع میں کلام اللہ، کلمات ربیٰ اور کلمات ربک وغیرہ کا قرآن کریم اور اس کی آیتوں پر اطلاق ہوا ہے۔ اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جمعہ کے وقت امام کے منبر پر تشریف لانے سے قبل جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھے۔ ثم ینصت اذا تکلم الامام (بخاری جلد ۱ ص ۱۷۱) پھر جب امام آجائے اور تکلم کرے تو اس وقت وہ نمازی خاموش ہو جائے۔ اس حدیث میں جمعہ کے خطبہ پر تکلم الامام کا اطلاق ہوا ہے خطبہ کیا ہے؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وانما الخطبة ہی قراءة القرآن (الحدیث مستطیسی ص ۶۵) خطبہ تو قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی قرأت ہے۔ حضرت ام ہشام رضی فرماتی ہیں کہ میں نے سورۃ ق والقرآن المجید جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُن کر یاد کی ہے۔ آپ اسے ہر جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۲۳ و مسلم جلد ۱ ص ۲۸) آخری تشہد میں درود شریف کے بعد کوئی متعین دعا شریعت نے نہیں بتائی۔ لیکن ادعیہ ماثورہ میں رَبَّنَا اِنَّا... الْاٰیۃ رَبِّ اجعلنی مقیم الصلوٰۃ... الْاٰیۃ۔ رَبَّنَا لَا تَزِغْ قُلُوْبَنَا... الْاٰیۃ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا... الْاٰیۃ وغیرہ وغیرہ بھی ادعیہ ثابت ہیں اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آخری تشہد سے فارغ ہونے کے بعد تحریر لیت خیر بعد من الکلام ما شاء (بخاری ۲ ص ۹۲) جو کلام بھی دل چاہے نمازی انتخاب کر لے۔ ایک شخص نے رکوع کی حالت میں الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ پڑھا تھا اور آپ نے فرمایا: من المتکلم (بخاری جلد ۱ ص ۱۰۳) و مسند احمد جلد ۳ ص ۱۰۳

مشکلم کون تھا؟ ایک شخص نے یہ دعا کی تھی: اَللّٰهُمَّ اَرْحَمْنِیْ وَ مُحَمَّدًا وَاَوْلَیَّہِمْ

مَعَنَا أَحَدًا - ۱۔ امام نسائیؒ اس پر ایک باب قائم کرتے ہیں۔ باب الکلام فی الصلوٰۃ (جلد ۱ ص ۱۱۰) امام بخاریؒ ایک باب میں عنوان قائم کرتے ہیں:

اذ اقال والله لا اتکلم الیوم فصلے اگر کسی شخص نے قسم اٹھائی کہ میں کلام نہیں
اوقرا اوسبج اوکبرا وحمد او کروں گا تو اگر اس نے نماز پڑھی یا قرآن کی تلاوت
ہئل فهو علی نیتہ۔ (بخاری ۲ ص ۹۸) کی یا سبحان اللہ یا اللہ اکبر یا الحمد لله الا
اللہ پڑھا تو یہ اس کی نیت پر موقوف ہے۔

یعنی اگر وہ تکلم سے قرأت قرآن وغیرہ مراد لے اور اس کی نیت کرے تو تکلم کا
اطلاق اس پر صحیح ہے اور وہ حائث ہو جائے گا۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:

فلا يجوز من الکلام الا ما خصه جب امام خطیب پڑھ رہا ہو تو اس وقت کلام
صحیح نہیں ہے۔ مگر جس کو شرعی دلیل نے خاص کر دیا
دلیل کصلوٰۃ التھیة۔
نبیل الاطار جلد ۳ ص ۱۵۲
ہو جیسے صلوٰۃ تھیہ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب موصوف صلوٰۃ تھیہ پر کلام کا اطلاق صحیح
تسلیم کرتے ہیں۔ جب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نہی عن التکلم قرأت قرآن وغیرہ پر
مشمول ہے تو امام بیہقیؒ کا یہ استدلال کہ نہی تو تکلم سے ہے۔ تلاوت اور قرأت
قرآن سے نہیں بالکل بے بنیاد ہے اور جیسے جہر کے ساتھ پڑھنے سے منازعت
اور مخالفت ہوتی ہے۔ اسی طرح آہستہ پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ جس کی تحقیق
آگے آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ورابعا۔ امام بیہقیؒ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ ان ضعیف اور کمزور روایتوں سے
ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ کی نعت
لہ محدثین و متروخین کا اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ مکہ مکرمہ میں
نازل ہوئی یا مدینہ طیبہ میں؟ حافظ ابن قیمؒ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۴۱ میں) حافظ ابن کثیرؒ

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۹۷ میں) اور قاضی ابوالطیب الطبرانی (المستوفی ص ۱۰۰) دیکھے
بذل المجموع جلد ۲ ص ۹۵) اس کے مدعی ہیں۔ کہ یہ نعت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی۔ اور دلیل
باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

آیت قوموا لله قانتین سے ہوئی ہے جیسا کہ بخاری جلد ۱۶ ص ۱۶۰ و مسلم جلد ۱ ص ۲۰۴ میں حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے اور اس کی پوری تحقیق پہلے گزر چکی ہے کہ آیت و اذا قرئ القرآن کا شان نزول ہی خاص قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہے۔

دسواں اعتراض

حضرت امام بخاری رحمہ فرماتے ہیں کہ آیت و اذا قرئ القرآن ... الا یہ میں استماع اور انصات کا حکم ہے اور استماع کا تحقق صرف ان نمازوں میں ہو سکتا ہے جن میں قرأت سنی جاسکتی ہو اور ستر می نمازوں میں چونکہ قرأت سنی نہیں جاسکتی۔ اس لیے ان میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی جائز ہوگی۔ لہذا آیت اپنے عموم پر باقی نہ رہی اور منکرین قرأت خلف الامام کا علی الاطلاق استدلال اس آیت سے صحیح نہ ہوا (اوکما قال جزء القراءة ص ۱۹ اور یہی سوال امام بیہقی رحمہ نے کتاب القراءة ص ۷۶ میں اور نواب صاحب نے دلیل الطالب ص ۲۸۰ میں اور مبارک پوری صاحب نے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱، اور ابکار المنن ص ۱۳۸ میں کیا ہے)۔

جواب۔ ان اکابر کے سوال یا استدلال کے مرکزی نقطے اصولی طور پر صرف دو ہیں۔ ان کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ استماع کا معنی سننا ہے۔

۲۔ ستر می نمازوں میں آہستہ آہستہ امام کے پیچھے قرأت کرنا استماع اور انصات کے منافی نہیں ہے علی الترتیب دونوں شقوں کا جواب ملاحظہ کریں:

استماع کا معنی۔ استماع کا معنی سننا نہیں بلکہ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، قرآۃ سنی جاسکتی ہو یا نہ۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں حضرت ابن مسعود رضی کی وہ صحیح روایت پیش کرتے ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے کہ حبشہ سے لوٹنے کے بعد انھوں نے بحالت نماز آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سلام کہا۔ مگر جواب نہ ملا۔ کیونکہ نہی عن المتکلم فی الصلوٰۃ نازل ہو چکی تھی۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت چونکہ بالاتفاق مدنی ہے اس سے معلوم ہوا کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ کی نہی مدینہ ہی میں نازل ہوئی (فتح الباری جلد ۱۲ ص ۵۹) اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ بعض مہاجرین حبشہ مکہ مگر یہ بھی آپس آئے اور بعض مدینہ منورہ میں اور حضرت ابن مسعود رضی کا یہ رجوع مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔

۱- آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بسلسلہ جہاد کسی قصبہ یا شہر پر حملہ کرنا چاہتے تھے تو

وکان یستمع الاذان فان سمع..... پچلے توجہ کرتے۔ اگر اذان کی آواز سن لیتے تو حملہ سے باز رہتے۔ ورنہ پہلے بول دیتے تھے۔

..... اذانا امسك والا اغار
 (مسلم ۱۶، ابوعوانہ جلد ۱ ص ۳۳۵، دارمی ص ۳۲۳، طیبی ص ۲۷۱)

قطبی پڑھنے والا طالب علم بھی نجوبی اس امر سے واقف ہوگا کہ تقسیم الشئ الی نفسہ والی غیرہ مجال ہے۔ اگر استماع اور سماع کا ایک ہی معنی ہو تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اذان سنتے تھے۔ سو اگر آپ سن لیتے تو حملہ نہ کرتے والا حملہ کر دیتے تھے جب پہلے اذان سن لی ہوتی تھی تو پھر اگر اذان سن لیتے گا کیا مطلب؟ استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ پہلے کان دھرتے اور توجہ کرتے۔ توجہ کے بعد اگر اذان سن لیتے تو فیہا والا حملہ کر دیتے تھے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ استماع سے مراد ارادۃ استماع ہے..... ص ۳۸۱۔ ایک بے کار بہانہ ہے۔ اس لیے کہ مجازی معنی کے لیے قرینہ درکار ہے اور اس جگہ قرینہ مفقود ہے۔ فان سمع... الخ کے واضح الفاظ اس کا بار کرتے ہیں کیونکہ حرف فا سے سماع کا ترتیب امر باطنی یعنی ارادہ پر چسپاں نہیں ہوتا بخلاف کان دھرنے کے جو ظاہری امر ہے۔

۲- صراح ص ۳۱۳ میں لکھا ہے۔ استماع گوش داشتن۔ کان دھرنا اور توجہ کرنا۔

۳- لغت کے امام ثعلب سے روایت ہے واذ قرئ القرآن... الا یہ کا یہ مطلب نقل کیا گیا ہے کہ قال ثعلب معناه اذا قرء الامام فاستمعوا الی قرآنہ ولا تتکلموا (تاج العروس ج ۱ ص ۵۹۱) ثعلب کہتے ہیں کہ استماع کا معنی یہ ہے کہ جب امام قرآن کرے تو اس کی قرأت کی طرف توجہ کر دو اور بولو مست۔
 ۴- اور امام راغب فرماتے ہیں کہ والاستماع الاصغاء۔ استماع کا مطلب کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ (مفردات ص ۲۳۲)

۵- اور نختار الصحاح میں ہے: واستمع له ای اصغی۔ کہ استمع لہ کا یہ معنی ہے کہ اس نے

توجہ کی اور کان دھرے۔

۶- منجد اور قاموس میں ہے: استمع له والیہ اصغی۔ استمع لہ اور الیہ کا ایک ہی مطلب

ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔ (منجد صفحہ ۳۶، قاموس جلد ۳ ص ۱۳۱)

۷۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

الاستماع الاستماع۔ (شرح مسلم کہ استماع کا معنی توجہ کرنا اور کان دھرنا ہے۔

جلد ۱ ص ۱۸۴)

۸۔ امام رازمیؒ لکھتے ہیں:

لان السماع غیر والاستماع غیر۔ سماع اور چیز ہے اور استماع اور ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۵۰۴)

۹۔ قاضی شوکانی صاحب قرأت خلف الامام کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

يدل على النهي عن القراءة عند مجرد

الجهل من الامام وليس في ولا في غيره

ما يشعر باعتبار السماع۔

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۱۴)

اس پر دلالت نہیں کہتی کہ مقتدی کو قرأت سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ قرأت سن رہا ہے۔

اس عبارت میں قاضی صاحب واشگاف الفاظ میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ترک قرأت

خلف الامام کی علت سماع نہیں ہے۔ موصوف جہر امام کو اس کی علت ٹھہراتے ہیں اور جہور

اہل اسلام بڑے وسیع الطرف ہیں۔ وہ صرف قرأت امام کو ترک القرات خلف الامام کی علت

سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

ومعتبر استماع است نہ سماع پس ہر کہ بانتهار ووقف واقف شد و نمی شنود یا اصم است یا

صوت خطیب خفی است وے بچو سماع است۔ (بدور الابلہ ص ۷۳)

ان تمام پیش کردہ اقتباسات سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ استماع اور سماع دو

الگ الگ چیزیں ہیں اور استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ اس میں سننے کا

معنی ملحوظ نہیں ہے۔ لہذا اس آیت کو صرف جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص کر دینا

باطل ہے بلکہ یہ آیت ستری اور جہری ہر قسم کی نمازوں کو شامل ہے اور سماعِ قرأت ،
ترکِ قرأت کی علت نہیں۔ جیسا کہ قاضی شوکانی صاحب کو بھی مسلم ہے۔

انصات کا معنی

انصات کا معنی ہے خاموشی بدون (صراح ص ۶۹) قاموس جلد ۱ ص ۹۲ میں ہے۔

انصت ، سکنت یعنی انصات کا معنی خاموشی ہونا ہے اور یہی معنی مغرب ۲ ص ۲۱۲ اور
منجد ص ۸۸۳ وغیرہ کتب لغت میں آئے ہیں۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں: الانصات السکوت
کہ انصات کا معنی سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸۳) امام بیہقیؒ
لکھتے ہیں: اذلا فرق بین السکوت والوانصات عند العرب (کتاب القراءت ص ۸)
اہل عرب کے نزدیک سکوت اور انصات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور مختار الصحاح میں ہے کہ الا انصات السکوت والوا ستماع انصتہ وانصت لہ
(ص ۵۸)۔ انصات کا معنی خاموش رہنا اور کان دھرنا ہے لام کے ساتھ ہو یا بدون لام دونوں کا
ایک ہی معنی ہے۔

اور منجد میں ہے کہ انصت وانتصت لہ سکت مستمعا لحدیثہ (ص ۸۸۳)
انصت اور انتصت لہ کا معنی یہ ہے کہ اس کی بات کے لیے توجہ کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔
اور تاج العروس میں ہے کہ

وانصتہ وانصت لہ اذا سکت
لہ مثل نصحه ونصح لہ وانصتہ و
انصت لہ مثل نصحتہ ونصحت
لہ والوانصات هو السکوت والاستماع
للحدیث یقال انصتہ وانصت لہ۔
انصتہ اور انصت لہ کا معنی ایک ہی ہے
کہ اس کے لیے خاموش ہو گیا جیسے نصحہ اور
نصح لہ کا ایک ہی مطلب ہے اور انصات کا
معنی سکوت اور بات کی طرف توجہ کرنا ہے۔ کہا
جاتا ہے انصتہ وانصت لہ۔

(جلد ۱ ص ۵۹۱)

امام ابو بکر الرازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

قد بینا دلالة الآية علی وجوب الانصات
ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت وجوب انصات

پر دلالت کرتی ہے جب کہ امام قرآت کر رہا ہو جوہر سے قرآت کرے یا آہستہ اور اہل لغت کہتے ہیں کہ انصاف کا معنی کلام سے حرکت جانا اور قرآت کی توجہ کے لیے خاموش رہنا ہے اور پڑھنے والا کسی صورت میں منصت اور ساکت نہیں ہو سکتا کیونکہ سکوت کلام کی ضد ہے اور سکوت کا یہ معنی ہے کہ زبان کو کلام کے لیے حرکت نہ دی جائے۔

عند قراءة الامام في حال جهرا الامام
والاخفاء وقال اهل اللغة الانصاف
الامساك عن الكلام والسكوت لا يمنع
القراءة ولا يكون القاري منصتا ولو ساكتا
بجاء وذلك لان السكوت ضد الكلام وهو
تسكين الالة عن التحريك بالكلام۔
- ۱۵ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۳۹)

سکوت کا معنی

امام اللغت والادب ابو عبد اللہ الحسین بن احمد المعروف بابن خالونید (المتوفی ۳۸۵ھ) لکھتے ہیں: نزلت الرجل اذا انقطعت حجته عند المناظرة وسکت وامسکت مثله۔
(اعراب ثلاثين سورة من القرآن ۳۸)

یعنی مناظرہ کرتے وقت جب کوئی آدمی بالکل لاجواب ہو کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو اس پر نزلت کا لفظ اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے تو اس پر سکت اور اسکت بولا جاتا ہے۔

منجد ص ۳۵۲ اور قاموس جلد ۱ ص ۹۲ میں لکھا ہے: اسکت انقطع كلامه فلم يتكلم کہ سکوت کا معنی یہ ہے کلام بالکل ترک کر دیا اور کوئی بات نہ کی۔ مجمع البحار جلد ۲ ص ۲۵ میں اس کی تصریح یوں کی ہے۔ جرى الوادي ثلاثا ثم سکت ای انقطع یعنی تین دن تک سیلاب چلتا رہا پھر بالکل ٹرک گیا۔

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۰۳ھ) لکھتے ہیں: السكوت منقطع بترك الكلام۔ (مفردات ص ۲۲۵) سکوت ترک کلام کے ساتھ مختص ہے۔

امام لازمی تحریر فرماتے ہیں:

لان السكوت عدمی معناه انه

سکوت عدمی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس

لم یقل شیئاً ولم یقل امداً ولم یصرف فی قولٍ ولا فعلٍ ولا شک ان هذا المعنی عدمی محض۔

نے کچھ بھی نہیں کہا نہ کوئی بات نقل کی ہے اور نہ کسی قول اور فعل میں تصرف کیا ہے اور اس کے عدمی محض ہونے میں کیا شک اور شبہ

(مناظرات امام رازی ص ۳۵) ہو سکتا ہے؟

ان منقولہ جوالوں سے یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ بغیر مکمل خاموشی کے انصات اور سکوت اور اسکات کا مفہوم کسی طرح بھی محقق نہیں ہو سکتا اور جو لوگ جہری یا سسری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت تجویز کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح انصات پر عامل نہیں تصور کیے جا سکتے اور یہ بھی وضاحت کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے کہ استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، سننا اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے سسری اور جہری کا سوال اٹھانا محض بے جا اور دور از کار بحث ہے۔

آہستہ پڑھنا بھی انصات اور استماع کے سراسر منافی ہے:

جو حضرات بحالت اقتدار امام کے پیچھے آہستہ قرأت تجویز کرتے ہیں اور اس کو انصات اور استماع کے منافی نہیں سمجھتے وہ غلطی پر ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قرآن کہہ کر پڑھاتے تو آپ بھی آہستہ آہستہ ساتھ پڑھتے جاتے کہ مبادا حضرت جبرائیل علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد میں مجھول نہ جاؤں اور کان یحرنک شفقتیہ آپ آہستہ آہستہ ہونٹ مبارک ہلاتے جاتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند نہ آیا کہ آپ قرأت قرآن کے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دیں اور یہ حکم نازل ہوا۔ لا تحریک لہ لسانک کہ آپ اپنی زبان تک کو حرکت نہ دیں۔

فاستمع لہ وانصت۔ (بخاری جلد ۱) سو آپ کان دھریں اور پوری طرح توجہ کریں

ص ۳، مسلم جلد ۱ ص ۱۸۲، طیب النسخی (۳۳۳) اور مکمل خاموشی اختیار کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ پڑھنا، زبان کو حرکت دینا اور ہونٹ ہلانا استماع اور انصات کے بالکل منافی ہے۔ اسی لیے تو آپ کو تحریک لسان اور تحریک شفقتین سے بھی منع کیا گیا۔

حالانکہ آپ آہستہ ہی پڑھتے تھے۔ بعض علمائے واذکربک فی نفسک... الا یہ سے آہستہ قرأت کرنے کے جو ان پر استدلال کیا ہے۔ حاکم ابن کثیر علیہ الرحمہ ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
 وهذا بعید مناف لانصات المأمور، یہ معنی حق اور انصاف سے بعید اور انصات
 بہ۔ (تفسیر ابن کثیر مع المعالم ص ۳۶۷ وغیرہ) مامور بہ کے قطعاً اور سراسر منافی اور مخالف ہے۔

جلد ۲ ص ۲۸۱

حضرات! آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقتدی کے لیے سترمی اور جہری کسی بھی نماز میں قرأت کرنا استماع، انصات اور سکوت کے منافی ہے۔

گیارہواں اعتراض: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان جو اسکات اور خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کیا پڑھا کرتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ دعا پڑھا کرتا ہوں۔ اللھم باعد بینی وبين خطایا می۔ (الحدیث۔ بخاری جلد ۱ ص ۱۸۱) امام بیہقیؒ اس روایت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ پڑھنے پر اسکات کا اطلاق صحیح ہے، لہذا جو شخص امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرتا ہے تو وہ آیت استماع و انصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔ (کتاب القرات ص ۷۵) یہی بات مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے بھی نقل کی ہے۔ (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱)

جواب۔ یہ اعتراض یا استدلال بھی غرور و شہ ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ ہمارا استدلال نص قرآنی سے ہے جس میں لفظ استماع اور انصات آیا ہے۔ اسکات اور سکوت کا لفظ صراحت کے ساتھ اس آیت میں مذکور نہیں ہے۔ استماع اور اسکات و سکوت کے درمیان فرق نمایاں ہے۔ امام بیہقیؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ان میں فرق نہیں ہے صحیح نہیں ہے اور اسی سے قاضی مقبول احمد صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ (دیکھیے الاعتصام) اس میں اہل علم کے لیے اشکال کی کوئی وجہ نہیں اور انصات اور سکوت میں جو فرق ہے وہ مبارک پوری صاحبؒ کو بھی مسلم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انصات اور سکوت کا معنی ایک نہیں ہیں بلکہ انصات کا معنی سکوت مع الاستماع ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱ و

تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۳۵۸) لہذا حدیث اسکا تہ سے استماع اور انصاف کی تفسیر کرنا اور اس پر استدلال کی بنیاد رکھنا باطل ہے۔

دو ثانیاً۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حضرت زبیر بن ارقم کی آمدنا بالسکوت کی روایت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں نمازیں مطلقاً سکوت کا حکم دیا گیا کہ نہ تو تم شہداء اور آمین پڑھو اور نہ تسمیہ، تہمید، تشہد اور درود وغیرہ پڑھو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حکم سابق سے سکوت کا حکم دیا گیا کہ سلام و کلام وغیرہ سے سکوت اختیار کرو تو اس روایت میں سکوت عن الکلام المتقدم مراد ہے۔ (فتح الباری جلد ۲ ص ۶۰ محصلہ) گویا جن چیز سے سکوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے حقیقتاً سکوت ہی مراد ہے۔ اس بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب (المتوفی ۱۳۵۲ھ) حدیث اسکا تہ کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں اسکا تہ عن التکبیر مراد ہے یعنی تکبیر تحریمہ سے اسکا تہ اور سکوت کرنا (فصل الخطاب) خلاصہ یہ ہوا کہ اسکا تہ کا معنی آہستہ پڑھنا نہیں جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ کو دھوکا ہوا ہے بلکہ اسکا تہ کے حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔ وہ یہ کہ جس چیز سے خاموش رہنے کا حکم تھا اس کو حقیقتاً ترک کر دینا اور اس سے خاموش ہونا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو یہ ایک مجازی معنی ہے اور آیت زبیر بحث میں جمہور سلف و خلف نص صحیح احادیث اور لغت کی روشنی میں حقیقی معنی مراد لیتے ہیں۔ لہذا مجازی معنی کو حقیقی معنی کے ترک کی دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ امام ابو بکر الرازیؒ اسی حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: انما سکتینا ہ ساکتا ہجازا ون من لوی سمعہ یظنہ ساکتا ہ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۹) یعنی اس کو ہم نے مجازی طور پر ساکت کہا ہے کیونکہ جو شخص اس کی قرأت کو نہیں سُن رہا وہ اس کو ساکت ہی خیال کرتا ہے۔ مجازی معنی خود قرینہ کا محتاج ہوتا ہے اور فریق ثانی اس سے حقیقت کو ترک کرنے پر تلا ہوا ہے۔

بارہواں اعتراض۔ مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ صاحب مجمع البحار نے (جلد ۱ میں) حدیث قرآ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما امد وسکت فیما امد کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ قرآن کے معنی جہر کے ہیں اور سکت کے معنی اَسْر کے ہیں یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے بھی قرأت کی اور آہستہ بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے معنی جہر بھی آتے ہیں۔ اس

معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت واذا قرئ القرآن کا مطلب یہ ہوگا کہ جب قرآن جہر سے پڑھا جائے تو تم خاموش رہو۔ لہذا یہ آیت صرف جہری نمازوں کو شامل ہوگی۔ نہ کہ سہری نمازوں کو۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۵۰ محصلہ)

جواب۔ مبارک پوری صاحب نے کا یہ بیان بھی قابل التفات نہیں ہے۔
 اولاً۔ اس لیے کہ آیت کا شان نزول صحیح روایات سے ترک قرأت ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے

ثانیاً۔ اہل عرب کے نزدیک قرآن اور جہد میں نمایاں فرق ہے اور حقیقت کو بلا کسی قوی اور صارف قرینہ کے ترک کرنا کئی وجوہ سے باطل ہے۔

ثالثاً۔ اگر اس حدیث کا معنی ہی بیان کرنا مقصود ہے تو اس کی صحیح صورتیں بھی عرض کی جاسکتی ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امامت کی حالت میں قرأت کرتے تھے۔ (قرآن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما أمر) اور اقتدار کی حالت میں آپ نے سکوت اور خاموشی اختیار کی (وسکت فیما أمر) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد قرأت کی اور کوئی نہ کوئی صورت یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھا (قرآن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما أمر) اور پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی صورت نہ پڑھی۔ اور حقیقتاً سکوت اختیار کیا (وسکت فیما أمر) اور صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں

لے بیت اللہ کے پاس دو مرتبہ آپ نے حضرت جبرائیلؑ کی اقتدار میں نماز پڑھی ہے۔ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۵ ترمذی جلد ۱ ص ۲) سفر تبرک سے واپسی پر آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی اقتدار کی ہے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۳۷) ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۵) اہل قبا کے درمیان مصالحت کرنے کے بعد واپسی پر آپ نے عصر کی نماز میں حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار کی ہے۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶) اور نزل جبرائیل فامنی۔ الحدیث بخاری جلد ۱ ص ۱۳۷) مسلم جلد ۱ ص ۲۲۱) اور عوطا امام مالک ص ۱۵ وغیرہ میں موجود ہے۔ جس سے حضرت جبرائیلؑ کی اقتدار میں آپ کا نماز پڑھنا ثابت ہے اور آخری نماز میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ آپ کی نفس اقتدار کے ثبوت کے لیے یہ دلائل کافی ہیں۔

آپ صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ جب سکت کے اور قرآن کے معنی کے لیے صحیح احادیث سے اور احتمالات کا بھی ثبوت مل سکتا ہے جن سے حقیقی معنی درست ہو سکتے ہیں تو پھر مجاز مراد لینے کی کون سی مجبوری ہے، جس کے لیے ایسی رنگ اور بار دتاویل اختیار کی جائے؟ اور چارہ بیان کردہ مطلب ہی سابق اور آئندہ دلائل کا ساتھ دیتا ہے، جس کو صحیح ہونے کے ساتھ جہود کی تائید کا شرف بھی حاصل ہے۔

ورابعداً۔ کیا مبارک پوری صاحبؒ فَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبِ اور اِمْرًا بِالسُّكُوتِ اور سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرَّوْحِ فَسَكَتَ (بخاری جلد ۱ ص ۲۴) وغیرہ کا یہ معنی کریں گے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ آہستہ آہستہ بولنا رہا۔ ہمیں نماز میں آہستہ آہستہ سلام و کلام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ ساتلیں کے سوال کے بعد آپ آہستہ بولتے رہے؟ اور کیا یہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ مَنْ کے خلاف نہ ہوگا؟ اور دل میں آہستہ آہستہ بولنے سے ساتلیں کو کیا فائدہ تھا؟ لہذا اس استدلال میں بھی کوئی جان نہیں ہے۔

تیرھواں اعتراض۔

حافظ ابن ہمامؒ نے آیت وَاذْقِرْهُ الْقُرْآنَ كَايَهِ مَطْلَبِ بِيَانِ كَيْفَ هِيَ كَمَا فَاسْتَمَعُوا مِنْ اللّٰهِ تَعَالٰی نے جہری نمازوں میں قرأت سے مقتدیوں کو منع کیا ہے اور انصاف میں ستری نمازوں میں ان کو قرأت سے روکا ہے۔ مبارک پوری صاحب ان پر گرفت کرتے لکھتے ہیں کہ ابن ہمامؒ کے کلام میں تین فساد ہیں:

۱۔ ابن ہمامؒ انصاف کا معنی سکوت سمجھے ہیں۔ حالانکہ انصاف کا معنی مطلق سکوت کے نہیں ہیں بلکہ سکوت مع الاستماع کے ہیں۔

۲۔ ابن ہمامؒ کی تفسیر بالرائے ہے۔ (جس کا حرام ہونا مبرہن ہے)

۳۔ ستری نمازوں میں سماع قرأت کے بغیر تدبیر کیسے متصور ہو سکتا ہے؟ (تحقیق الكلام ص ۲۴)

جواب۔ مبارک پوری صاحبؒ کی تینوں شقیں مردود ہیں:

پہلی اس لیے کہ مبارک پوری صاحبؒ خود غلطی کا شکار ہیں۔ وہ سماع اور استماع کو ایک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سماع اور استماع میں زمین آسمان کا فرق ہے اور متعدد دعوائل سچے ہیں امرنا

کیا جا چکا ہے۔ اگر واقعی استماع کا معنی سننا ہوتا تو حافظ ابن ہمام پر اعتراض کی گنجائش تھی۔ اور دوسری شق اس لیے مخدوش ہے کہ حافظ ابن ہمام کی تفسیر بعینہ قرآن کریم، صحیح احادیث لغت اور جمہور مفسرین کی تفسیر ہے۔ لہذا اس کو تفسیر بالرائے سے تعبیر کرنا ان دلائل سے غفلت اور بے خبری پر مبنی ہے۔ اور بلا تحقیق یہ الزام لگانا کھلی جسارت ہے۔ اور

تیسری شق اس لیے باطل ہے کہ اگر مبارکپوری صاحب دعوہ کے میں مبتلا ہیں کہ استماع کا مطلب سماع ہے (اور جبھی تو وہ سماع قرأت کی آڑ لیتے ہیں) تو اس کی پوری تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ سماع اور استماع میں فرق ہے۔ اور اگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انصات کا سماع کے بغیر تحقق نہیں ہو سکتا تو یہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ انصات کے مفہوم میں من وجہ استماع اور توجہ تو شامل ہے لیکن اس میں سماع پر گز شامل نہیں ہے۔ ایک حدیث بایں الفاظ آتی ہے۔

وان نأی وجلس حیث لا یسمع فانصت
 اگر کوئی شخص جمعہ کے خطبہ کے وقت امام سے دور بیٹھ گیا جہاں سے امام کی آواز وہ نہیں سن سکتا اور
 (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۱) خاموش رہا تو اس کو ایک درجہ ثواب حاصل ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انصات کے لیے سماع شرط نہیں ہے۔ انصات وہاں بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے جہاں خطبہ وغیرہ کچھ بھی نہ سنا جاسکتا ہو۔ اگر انصات کے تحقق کے لیے سماع شرط ہوتا تو بغیر سماع کے انصات نہ پایا جاسکتا۔ اور یہ بھی مت بھولے کہ انصات میں گو فی الجملہ استماع ملحوظ ہے لیکن من کل الوجوہ استماع بھی اس میں ضروری نہیں ہے۔ انصات کا معنی خاموش ہونا ہے اور یہ معنی بغیر استماع اور توجہ کے بھی متحقق ہو سکتا ہے اور استماع کے ساتھ بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر مکتبے میں:

فلا انصات هو السکوت وهو یحصل
 انصات کا معنی سکوت کرنا اور خاموش رہنا
 ممن یتبع وممن لا یتسمع کان
 ہے اور انصات ایسے شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو
 یکنون مفکرانی امر آخر۔
 استماع اور توجہ کرے اور انصات اس شخص سے بھی

ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ نہیں کرتا، بلکہ کسی اور امر کی فکر میں ڈوب کر خاموش ہے۔
 (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۰۴) (بجاء الفتح الملمم ۲)

بہر حال مبارکپوری صاحب کی پیش کردہ تینوں شقیں باطل ہیں اور اس کے مصداق ہیں کہ... ع: میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکال یا مؤلف خیر الکلام نے (اور انھیں کی بیروی میں قاضی مقبول احمد صاحب نے ملاحظہ ہو الاغتصاص ۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء) اس سلسلہ میں جو نخلص تلاش کیا ہے وہ بھی بڑا ہی عجیب ہے۔ انھوں نے ص ۳۷۰ سے ص ۳۹۴ تک کئی صفحات اس پر سیاہ کر ڈالے ہیں مگر بعض باتوں کو یاد وہ خود بھی نہ سمجھے ہوں کہ میں کیا کہ رہا ہوں صرف کچھ کہنے اور لکھنے کا نام جواب نہیں ہوتا۔ ذیل کے امور کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ ہم نے کتب لغت سے باحوالہ یہ ثابت کیا ہے کہ انصاف کے معنی بالکل خاموشی اور استماع کے معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، مؤلف مذکور کا یہ فریضہ تھا کہ وہ باحوالہ کتب لغت یہ ثابت کرتے کہ انصاف مطلق خاموشی نہیں بلکہ اس میں کلام کرنا درست ہے اور استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا نہیں بلکہ اس کا معنی سُننا اور آہستہ آہستہ بولنا ہے لیکن جب وہ اس سے بالکل لاجواب رہے تو یہ کہہ کر جان چھڑالی ہے کہ پھر ہم کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سکوت اور انصاف لغت کے لحاظ سے آہستہ پڑھنے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ ہمارے لیے اس قدر کافی ہے کہ ہم ثابت کر دیں کہ قرآن مجید کی آیت زیر بحث میں جو استماع اور انصاف آیا اس سے بالکل خاموشی مراد نہیں۔ (ص ۱۳۷) مگر یقین جانیے کہ اس سے بالکل خاموشی مراد ہے۔ حضرات ائمہ لغت اور جہور مفسرین کی روشن عبارتیں اس کا بین ثبوت ہے۔ جن کے حوالے گذر چکے ہیں چونکہ لغت سے یہی ایک ایسا فن ہے جو بلا کسی فریق کے لحاظ کے صحیح بات بتاتا ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام لغت سے اپنی تائید پیش کرنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔

۲۔ جن روایات سے انھوں نے استدلال کیا ہے کہ سکوت قرآن کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے ان میں ایک روایت بخاری کی اور ایک مستدرک وغیرہ کی ہے کہ اسکا تک ما بین التکبیر والقرآن ما تقول... الخ ویسکت بعد القراءة ہنیۃ یسأل اللہ من فضله۔ تو ہم نے احسن الکلام میں اس کی تصریح کر دی ہے کہ نص قرآنی میں انصاف و استماع

کالفظ ہے اور باقر المبارکی پوری صاحب انصاف اور سکوت میں فرق ہے اس لیے یہ جملہ حوالے ہمارے خلاف نہیں ہیں کیونکہ ہمارا استدلال تو انصاف و استماع کے لفظ سے ہے اور اور انصاف و سکوت میں فرق ہے۔

۳۔ فتح الباری جلد ۱ ص ۳۴۰ کے حوالہ سے ابن جریرؒ سے جو روایت نقل کی گئی ہے کہ لوگ مؤذن کی اذان کے لیے خاموش رہتے تھے بایں ہمہ وہ اذان کے کلمات دہراتے تھے جس سے مؤلف خیر الکلام نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ انصاف میں تکلم درست ہے۔ (مختصر خیر الکلام ص ۳۷۷) تو یہ اثر بالکل ضعیف ہے کیونکہ اس میں حدیث ہے اور یہ معلوم نہیں کہ بیان کرنے والا کون ہے؟ اور ہے بھی موقوف اس میں مرفوع روایات کے مقابلہ میں کیا حجت ہے؟ علاوہ ازیں اذان پر قیاس باطل ہے کیونکہ اذان میں ہر کلمہ کے بعد وقف ہوتا ہے جس میں اجابت مؤذن ہو سکتی ہے۔ بخلاف امام کے پیچھے قرأت کے کہ سکوت کا صحیح احادیث سے ثبوت نہیں اور مقدمہ ہی کو بڑھانا منع ہے۔

۴۔ مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۱۲۳ سے جو روایت نقل کی ہے کہ من صام رمضان فی انصاف وسکون.... الخ اس کی سند و کار ہے کہ آیا صحیح بھی ہے یا نہیں؟ ضعیف قسم کی روایتوں سے قرآن و احادیث صحاح اور اجماع امت اور لغت کو کس طرح رو کیا جاسکتا ہے؟ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں الولید بن الولید ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ اس کی توثیق کرتے ہیں۔ وضعفہ جماعة اور دیگر حضرات محدثین کرامؒ اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (مجمع الزوائد، جلد ۳ ص ۱۲۳) علاوہ ازیں اس سے جھوٹ، گالی گلوچ اور غیبت وغیرہ سے صحیح معنی میں انصاف مراد ہے جیسا کہ متقدمی کے لیے انصاف عن القراءة مراد ہے۔ کیونکہ باقی باتوں کا تو نماز میں احتمال ہے ہی نہیں اور جن حضرات سے اس کے علاوہ کچھ اور منقول ہے تو وہ لاعلمی پر مبنی ہے۔

۵۔ جو آیات مؤلف خیر الکلام ص ۳۷۷ پر پیش کی ہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت کچھ کلمات کہہ سکتے ہیں تو انہوں نے یقولون اور قالوا کے الفاظ پر غور نہیں کیا کیونکہ یہ زبان کے ساتھ پڑھنے پر نص نہیں ہے دل میں کہنے پر بھی قال اور یقول کا اطلاق صحیح ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خاص موقع پر اپنے بھائیوں سے کہا: قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا.....
 الآتیه۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ قال هذا في نفسه (ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۸۶) یہ
 قول انھوں نے دل میں کہا تھا، مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ نزاع قرآن اور یقرا کے الفاظ
 میں ہے قال اور یقول میں نہیں ہے اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے انصاف اور استماع
 کے وقت قرأت ثابت ہوتی ہے۔

۶۔ مؤلف خیر الکلام نے جو قرأتیں پیش کیے ہیں کہ انصاف و سکوت وغیرہ کے ساتھ قرأت ہو
 سکتی ہے تو اگر ان کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مجاز ہے اور انصاف و استماع کا جو معنی ہم نے کیا
 ہے وہ حقیقت ہے جو صحیح احادیث کے علاوہ اجماع اُمت اور لغت سے قوی طور پر مؤید ہے
 اس لیے اس کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ اس کوئی سُننے کے لیے تیار ہے چنانچہ
 خود مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ ہم کو اس امر کی ضرورت ہے کہ معلوم کریں کہ آیت میں
 استماع اور انصاف کا کیا درجہ ہے خواہ وہ اطلاق حقیقی ہو یا مجازی۔ جب یہ ثابت ہو جائے تو
 مدعی حاصل ہو جاتا ہے باقی بحث زائد ہے (ص ۳۷۱) آپ پر کیا مصیبت وارو ہوتی ہے کہ آپ
 اطلاق مجازی کے پیچھے کمر بستہ ہو کر نصوص صحیحہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو کچھ ائمہ لغت اور
 جہور اُمت نے کہا ہے اسے تسلیم کر لیں۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جن حضرات سے انصاف و
 استماع اور سکوت وغیرہ کے حوالے مؤلف خیر الکلام نے نقل کیے ہیں چونکہ وہ اس مسئلہ میں فریق کی
 حیثیت رکھتے ہیں جن کی تفسیر میں ان کا اپنا ذہن بھی کار فرما ہے اور ان کی تفسیر خود محل نزاع ہے
 اس لیے صحیح احادیث اور کتب لغت ہی سے ان کے معانی حل ہو سکتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام ص
 ۳۸۶ میں لکھتے ہیں کہ پس ضروری ہے کہ جو آیت میں بالکل خاموشی کا معنی لیتا ہے وہ دو باتیں
 ثابت کرے۔ ایک یہ کہ انصاف لغت میں بالکل خاموشی کے معنی میں آتا ہے۔ دوم یہ کہ
 اس کے خلاف جو قرأتیں پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں..... ۱۷

بجاء اللہ تعالیٰ ہم کتب لغت سے ثابت کر چکے ہیں کہ انصاف کے معنی لغت میں بالکل خاموشی
 کے آتے ہیں اور جو قرأتیں اس کے خلاف پیش کیے گئے ہیں وہ سب مجازی ہیں۔ اس لیے حقیقت
 کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ شاذ اور خلاف اجماع قول کو لے کر جہور کا مسلک رو

کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۷۰ میں جو یہ لکھا ہے کہ اگر انصت بدون لام کے ذکر ہو تو سکوت کے معنی میں ہے اور جب اس کے ساتھ لام ہو تو اس میں استماع بھی ہے۔ اور قاموس جلد ۱ ص ۵۹ کا حوالہ انصتہ ولہ سکت لہ واستمع لحدیث نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ اس کا عطف فاسمہ عوالہ پر ہے لہذا یہاں بھی لام ہے یا مقدر مافی جاتیگی۔ (مختصر) تو یہ محض لفظوں کا کرب ہے محض لفظوں کی شعبہ بازی سے کیا بنتا ہے۔ قاموس میں انصتہ ولہ لام کے ساتھ ساتھ ہو یا بدون لام کے دونوں کے معنی سکت کیا ہے اور قرآن کریم میں انصت اور استماع دو الگ الگ حکم ہیں۔ ایک کی لام دوسرے کو دے کر کام نکالنا اور اس طرح کی خانہ پری سے کچھ نہیں بنتا۔

۸۔ ہم نے قاموس کا حوالہ دیا ہے۔ اس پر مؤلف خیر الکلام ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ قاموس میں اس سے آگے لکھا ہے کہ وَجِبَلٌ سَكَّتْ قَلِيلٌ اَنْكَلَمَ اِحْسَنَ (قاموس جلد ۱ ص ۹۳) یہ آدمی سکت ہے یعنی کم باتیں کرتا ہے جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے۔۔۔۔۔ ۱۱ھ مگروس حوالہ سے مؤلف کو کیا فائدہ؟ وجبل سکت کا معنی تو یہ ہے کہ خاموشی طبع کم گو ہے مگر جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ وہ خاموشی اور انصت کے وقت کلام کرتا ہے جو مؤلف مذکور کا مدعی ہے۔ انصت اور خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ دونوں کا وقت ایک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف مذکور کو سمجھ عطا فرمائے ان کو ثابت تو یہ کرنا ہے کہ انصت کے وقت کلام ہو رہا ہے۔ اور اس حوالہ میں اس کا ذکر کوئی نہیں۔ خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ اور اس بات کو ایک عام آدمی بھی بخوبی سمجھتا اور سمجھ سکتا ہے۔ مگر صحیح؛ اک دل ہے جو ہر خطہ الجھتا ہے خود سے

چودھواں اعتراض

حضرت امام بخاری رحمہ، امام ترمذی رحمہ، امام بیہقی رحمہ، مولانا شمس الحق رحمہ، مولانا ابو عبد الرحمن

۱۲۵ کتاب القراءۃ ص ۲۹ و ۱۷

۱۲۵ جزء القراءۃ ص ۵۸ و ۹

۱۲۵ التعلیق المعنی جلد ۱ ص ۱۳۵

۱۲۵ ترمذی جلد ۱ ص ۳۲

محمد عبد اللہ، مولانا عبد الصمد اور مبارک پوری صاحب وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ آیت استماع اور انصات کا مطلب یہی ہے کہ مقتدی کو بجالتِ قرأتِ امام توجہ کرے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیے اور جب امام قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی کو کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے لیکن مقتدی کو سکنا تِ امام میں قرأت کرنی چاہیے اور سکنا تِ میں قرأت کرنا آیت مذکورہ کے منافی نہیں ہے اور سکنا تِ کا ثبوت یہ ہے۔

۱۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ امام جس وقت سکتے کرے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے کیونکہ جس شخص نے قرأت نہ کی۔ اس کی نماز میں غل اور نقصان واقع ہوگا۔ (کنز العمال جلد ۴ ص ۹۶)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے ساتھ فرض نماز میں شریک ہو۔ اس کو امام کے سکنا تِ میں سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ (کتاب القراءۃ ص ۵۴، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸)

۳۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جده سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انصات اور سکنا تِ کرتے تھے تو اس وقت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ کے پیچھے قرأت کر لیا کرتے تھے۔ (کتاب القراءۃ ص ۶۹، ۸۶)

۴۔ ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اے فرزند جب امام سکتے کرے تو تم اس وقت قرأت کر لیا کرو۔ اور جب امام قرأت کرے تو اس وقت تم خاموش ہو جاؤ۔ کیونکہ فرض نماز ہو یا نفل۔ اگر اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی۔ (جزء القراءۃ ص ۵۸، کتاب القراءۃ ص ۸۷)

۵۔ حضرت ابوسلمہ یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ امام کے لیے دو سکتے ہوتے ہیں۔ ان کو سورۃ فاتحہ کی قرأت کے لیے غنیمت سمجھو۔ (جزء القراءۃ ص ۵۸، کتاب القراءۃ ص ۷۷)

۴۔ حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ سلف کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کو کوئی نماز پڑھانا اور امامت کا فریضہ بجالاتا تو نماز میں ضرور سکتہ کیا کرتا تھا تاکہ مقدمی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔
(جزء القراءۃ ص ۵)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ سکنات امام کا وجود اور ثبوت بھی ہے۔ لہذا اس صورت میں قرآن کریم اور حدیث دونوں پر عمل ہو جائے گا۔

جواب۔ ان حضرات کا یہ استدلال نہایت ضعیف اور کمزور ہے۔ کیونکہ یہ اکثر و بیشتر روایات حضرات صحابہ و تابعین پر موقوف ہیں اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک در موقوفات صحابہ حجت نیست۔ جب حضرات صحابہ کرام کا یہ حال رہا تو تابعین اور اتباع تابعین وغیرہم کی کیا پوزیشن باقی رہ جاتی ہے۔ اور یہ جتنے آثار و روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ ترتیب و ارجو بات ملاحظہ کریں:

اثر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اولاً۔ یہ اثر موقوف ہونے کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نہیں۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نام لینا راویوں میں سے کسی کی غفلت اور غلطی کا نتیجہ ہے۔ (دیکھیے کتاب القراءۃ ص ۲۵)

وثانیاً۔ اس میں سورۃ فاتحہ کی تصریح موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اثر مجمل ہے۔

وثالثاً۔ اس کی سند میں شنی بن صباح راوی کمزور ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس کے داغ میں فتور آ گیا تھا۔ (ضعفاء صغیر ص ۳۰) امام نسائی رحمہ اللہ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۳۲۶) امام بخاری القطن

اور ابن ہدی رحمہ اللہ اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ محض بیچ ہے۔ ابن معینؒ اس کو لیس بذالک اور ابن عدیؒ ضعیف کہتے ہیں (میزان الاعتدال جلد ۱)

ص ۷۔ امام ترمذی رحمہ اللہ، ابن سعد رحمہ اللہ، علی بن الجندی رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ، ابن جبار، ساجی رحمہ اللہ، ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ، سحنون رحمہ اللہ اور امام عقیلی رحمہ اللہ وغیرہ سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۷۴)

حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس روایت کی سند میں محمد بن عبداللہ بن

غیر موجود ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف تھا (ضعفار ص ۲۸) امام مسلم لکھتے ہیں کہ امام یحییٰ القطان اس کی تضعیف کرتے تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۲۰) امام نسائی اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفار صغیر ص ۲۵) امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ (کتاب القراءة ص ۵۴) امام دارقطنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱) امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں (ترمذی جلد ۲ ص ۱) امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔

(میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۷۷ و لسان المیزان جلد ۵ ص ۲۱۶) علاوہ انہوں نے اس روایت میں صلوات مکتوبہ کی قید ہے۔ حالانکہ فریق ثانی کے نزدیک صلوات تراویح..... صلوات عید اور صلوات و ترغیرہ میں بھی امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ضروری ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک موقوف اثر بھی مروی ہے۔ کہ سکتہ امام میں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز مکمل نہیں ہو سکتی (کتاب القراءة ص ۶۶) لیکن اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ نہایت ضعیف اور کمزور راوی موجود ہے۔ جس کی پوری بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز

روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ..... الخ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے روایتی سلسلہ میں محدثین کا کلام معروف و مشہور ہے۔ امام یحییٰ القطان فرماتے ہیں کہ اس کی سند ہمارے نزدیک ضعیف اور کمزور ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۳، ص ۸۲) امام ابو داؤد رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ وہ آدمی حجت بھی نہیں۔ امام ابو زرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محدثین اس لیے ان پر کڑی جرح کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ سے چند روایتیں سنیں ہیں اور وہ باپ دادا کی تمام غیر مسموع روایات کو بلا تشاہید بیان کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۸۹) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ کتاب سے نقل کر کے محض تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات المدلسین ص ۱۱) امام طحاوی رحمہ اللہ بھی ان کی سند کو منقطع سمجھتے ہوتے اس کو ضعیف کہتے ہیں (طحاوی جلد ۱ ص ۴۵)

لہٰذا حضرات محدثین کرام کا یہ ضابطہ ہے۔ اگر اسناد اپنی کتاب اور بیاض سے روایت کرنے کی شاگرد کو اجازت نہ دے۔ تو وہ اس کتاب اور بیاض سے روایات بیان کرنے کا جواز نہیں اور اس کی ایسی روایتیں قابل حجت نہیں ہو سکتیں۔ (شرح نکتہ الفکر ص ۱۰۰)

امام حاکم کہتے ہیں کہ ان کی روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف سمجھی جاتی ہے۔
 (مسند رک جلد ۱ ص ۱۹۷) محدث ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کتاب سے روایت
 نقل کرتے ہیں جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اما حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ
 فصحیفۃ لا تصح۔ (محلی ابن حزم جلد ۱ ص ۲۲۲)

امام علی بن المذہبی فرماتے ہیں کہ عمرو بن شعیب جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت
 نقل کرے تو وہ کتاب سے (جو انھوں نے پائی تھی) نقل کرتا ہے فہو ضعیف الذاوہ ضعیف
 ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے مگر عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مرسل ہے
 ابن جبان فرماتے ہیں کہ جب وہ طاؤس اور سعید بن المسیب وغیرہ ثقات سے روایت
 نقل کرے تو حجت ہے۔ اور جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کرے تو اگر
 جدہ سے عبد اللہ مراد ہیں تو حدیث منقطع ہوگی اور اگر محمد مراد ہوں تو مرسل ہوگی (تہذیب
 التہذیب جلد ۸ ص ۵۳) اور محدث ساجی فرماتے ہیں کہ

قال ابن معین ہو ثقہ فی نفسہ و
 ماروی عن ابیہ عن جدہ لا حجة
 فیہ ولیس بہ متصل و هو ضعیف... الخ
 (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۸)

امام ابن معین نے فرمایا کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے
 لیکن جب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کرے تو
 حجت نہیں اور اس کی سند متصل نہیں بلکہ ضعیف ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے سنا:

يقول له اشياء منا كير وانما يكتب
 حدیثہ یعتبر بہ فاما ان یکون حجة فلا
 انھوں نے فرمایا کہ اس سے بہت سی منکر اشیا
 بھی ہیں اس کی حدیث اعتبار کے لیے تو لکھی
 جاسکتی ہے لیکن حجت کسی صورت میں نہیں سکتی۔
 (ایضاً ص ۲۹)

اور امام ائرم فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ میں اس کی حدیثیں لکھ لیتا ہوں کبھی
 تو اس سے احتجاج کر لیتا ہوں۔

اور کبھی اس سے دل میں کھٹکا گذرتا ہے۔

وربما وجس فی القلب مند شیئ (ایضاً ص ۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ مولف تحبیر الکلام نے (۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء) میں بحوالہ تحفۃ الاحوذی جلد ۱

امام احمد اور امام علی بن المدینی کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ عمرو بن شعیب کی روایت کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے اور علامہ ذہبی نے عمرو بن شعیب کی روایت کو جو حسن کہا ہے تو اس سے اس کی دوسرے طرق سے روایت مراد ہے نہ کہ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کیونکہ اس پر امام الجرح والتعدیل امام یحییٰ بن سعید القطان اور یحییٰ بن معین وغیرہ کی مفصل جرح موجود ہے۔

امام ابن حبان اپنا فیصلہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فی روایت عن ابیہ عن جدہ مناکیر کثیرة لا يجوز عندی الاحتجاج بشیء منها۔ (اسعاف المبطأ برجال المؤطا ص ۲) عمرو بن شعیب کی عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے میرے نزدیک کوئی روایت قابل احتجاج نہیں ہے کیونکہ ان میں کثرت سے نکارت ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: بعض محدثین ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں اور جہور ان کی توثیق کرتے ہیں اور بعض دیگر ان کی بعض روایتوں کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں اور اپنا فیصلہ یوں ارقام فرماتے ہیں:

ومن ضعفه مطلقاً فهو محل علی ردائنه
عن ابیہ عن جدہ (تہذیب التہذیب ص ۸)

جو حضرات ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں۔
سوان کی یہ تضعیف صرف عن ابیہ عن جدہ کے طریق پر مؤملہ ہوگی۔

علامہ سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ اور یہ بیچارے اس لیے ضعیف سمجھے جاتے تھے کہ ان کو کتاب مل گئی تھی جس سے حدیثیں نقل کرتے وقت وہ تالیس سے کام لیتے تھے۔ (خطبات مدراس ص ۵۳) عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک اور روایت بھی مروی ہے کہ جس نے سکناات امام میں سورۃ فاتحہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز کامل ادا نہ ہوگی۔ (کتاب القراۃ ص ۵۵-۵۴)

لیکن اس کی سند میں علاوہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے محمد بن عبد اللہ بن عبید بن عمیر واقع ہے جس کا حال ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں۔

ہشام بن عروہ رحمہ کی روایت: ان کی روایت موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف بھی

ہے اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود ایک راوی ہے۔ امام احمدؒ اس میں کلام کرتے ہیں۔ ترمذی ان کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اس سے احتجاج درست نہیں۔ بغدادی اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۸۱) ابوحاتم رحمتے ہیں کہ مؤمل بن اسماعیل اور ابو حذیفہ (موسیٰ) دونوں کی کتابوں میں بہت غلطیاں ہیں۔ عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں کہ کوئی صاحب بصیرت محدث اس سے احتجاج نہیں کر سکتا۔ ابوالحماد حاکم کا بیان ہے کہ وہ قوی نہ تھا۔ ابن قانع کہتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم اور سعی المحفظ تھا۔ ساجی اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ دارقطنی اس کو کثیر الوہم بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۳۷)

علاوہ ازیں اس روایت میں فصاعدا کی زیادت بھی موجود ہے۔ کیا فریق ثانی سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا مقدمی کے لیے جواز سمجھتا ہے؟

اثر ابو سلمہ یا ابو ہریرہ۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف ہے۔ اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود واقع ہے جس کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے۔ مزید برآں روایت کو اس کا پورا یقین بھی نہیں کہ یہ روایت حضرت ابو سلمہ (تابعی) سے ہے یا حضرت ابو ہریرہ سے مؤلف خیر الکلام کا اس کو مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے حدیث حسن کہنا (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۳۳۷) غلط ہے۔ کیونکہ یہ راوی نرا مختلف فیہ ہی نہیں بلکہ جمہور محدثین کرام کی اس پر کڑی جرح منقول ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

اثر سعید بن جبیر۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اس کی سند کا ایک راوی عبداللہ بن رجاہ کی ہے۔ امام احمدؒ اور ازہدی رحمتے ہیں کہ اس کی روایت میں نکارت ہوتی ہے۔ (میزان جلد ۵ ص ۱۳۷) ساجی کا بیان ہے عندہ مناکیر (تہذیب التہذیب جلد ۵) کہ وہ صاحب مناکیر ہے۔ اس سند کی کڑی کا دوسرا ضعیف راوی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے اسکے بارے حدیث محدثین کرام کے متضاد اقوال منقول ہیں امام ابن معینؒ اس کو ثقہ جتھ کہتے ہوئے بھی یہ فرماتے ہیں احادیثہ لیست بالقویۃ۔ امام ابوحاتمؒ ماہدہ بآس صالح الحدیث کہنے کے باوجود فرماتے ہیں وکان یخطی (اور نیز فرمایا لا یحتج بہ میزان الاعتدال ص ۲۱۵) امام نسائی نے ایک مرتبہ ثقہ اور ایک مرتبہ لیس بالقوی کہا اور امام علی بن المدینیؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ص ۳۱۵)

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا بیان ہے۔ ضعیف لیتوہ وہ ضعیف ہے اور محدثین اس کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں۔ (نصب الرأی جلد ۱ ص ۳۵۳) مبارکپوری صاحب کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ مولانا عبدالحی کے رسالہ امام الکلام ص ۷۳ کی آڑ لیتے ہوئے اس ضعیف اور کمزور اور راہی اثر کو صحیح کہتے ہیں۔ (دیکھیے ابکار المنن ص ۱۶۷، فواہ اسفا۔

سعید بن جبیر کا بعینہ اس مضمون کا اثر کتاب القراءة ص ۸۷، ۶۹ میں بھی مذکور ہے، لیکن سند میں وہی عبد اللہ بن عثمان بن حنیتم ہے۔

یہ ہیں وہ روایات و آثار جن سے یہ حضرات سکات امام میں مقتدی کے لیے قرأت سورۃ فاتحہ تجویز کرتے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ سکات امام کا روایتی پہلو تھا۔ اب آپ درایتی پہلو بھی سن لیجئے۔ جہاں تک سکات امام کا ثبوت مل سکتا ہے وہ صرف دو سکتے ہیں، پہلا سکتہ تجزیہ تحریمیہ کے بعد کا سکتہ ہے اور فریق ثانی کو اس امر میں اتفاق ہوگا کہ نہ تو اس میں قرأت سورۃ فاتحہ کا ثبوت ہے اور نہ گنجائش اور دوسرا سکتہ سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہونے کے بعد امام اس لیے کرتا ہے تاکہ امام

حتی یتزاد الیہ نفسہ۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۱۱) قرأت سے فارغ ہونے کے صرف سانس لے سکے۔

ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱، ترمذی جلد ۱ ص ۳۴، داعمی ص ۱۲۶)

اور صرف اس سکتہ میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کیسے ممکن ہے؟ اور پھر ایک سکتہ کے سکات کیسے بن گئے؟ خود مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں:

بل السکتہ الثانیۃ کانت لاون یتزاد الیہ نفسہ بلکہ دوسرا سکتہ تو صرف اس لیے ہوتا تھا کہ امام کما صرح بقادۃ۔ قرأت سے فراغت کے بعد سانس لے سکے۔ جیسا کہ حفرة

(تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۹) قنادۃ نے اس کی تصریح کی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ امام احمد، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور جہور اہل اسلام اس کے ہرگز قائل نہ تھے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد امام اس لیے سکتہ کرے تاکہ مقتدی اس میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں اور نہ یہ حضرات سکتہ کے وجوب کے قائل تھے اور نہ استحباب کے۔

(تنوع العبادات ص ۸۵)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولم نعلم نزا عابین العلماء انه
لا یجب علی الامام ان یقرأ
المأموم بالفاتحة ولا غیرها الی ان
قال - ولا یتحبت للامام السکوت
لیقرأ المأموم عند جما هیر العلماء
وهذا مذهب مالک وابی حنیفة و

یعنی جہاں تک ہمیں معلوم ہے علماء کا اس بات
پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے تاکہ مقتدی
سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔ امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور
امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ جو راہل اسلام اس پر بھی متفق
ہیں۔ کہ امام کے لیے یہ بات مستحب بھی نہیں ہے کہ وہ
سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کر سکیں۔

احمد بن حنبلؒ وغیرہ۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۲۶)

قاضی محمد بن عبداللہ ابوبکرؒ ابن العربی المالکی الاندلسی (المتوفی ۵۴۳ھ) مجز سکتات سے
یوں خطاب کرتے ہیں کہ

عجبا لك كيف يقدر المأموم في المحبة
على القراءة اينا زع القرآن الامام امر
بعرض عن استماعه امر یقرأ اذا
سکت قيل له فان لم یسکت وقد
اجمعت الامة علی ان سکوت الامام
غیر واجب فمتی یقرأ ؟

تعجب ہے تم پر مقتدی کو بھری نمازوں میں قرأت
پر کیسے قادر تصور کیا جائے؟ کیا وہ قرأت قرآن پر امام
سے منازعت کرتا ہے؟ یا استماع سے اعراض کرے؟
یا جب امام سکتہ اختیار کرے تو اس وقت وہ قرأت کرے؟
اگر امام سکتہ نہ کرے تو مقتدی کب پڑھے؟ کیونکہ تمام
امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں

(عارضۃ الاحوذی جلد ۱ بحوالہ او جز المسالك جلد ۱ ص ۲۲۸)

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی صحیح حدیث سے
یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آپ نے محض اس لیے سکتہ اختیار کیا ہو تاکہ مقتدی سورۃ
فاتحہ پڑھ لیں۔
(بحوالہ غیث الغمام ص ۱۶۵)

لہٰذا صرف بہت بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے۔ متبحر علمی ذہانت اور خصائل و عادات میں بے نظیر
تھے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، علامہ اور القاضی لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۸۶)

محمد بن اسماعیل بن الصلاح امیر میانی (المتوفی ۷۳۳ھ) لکھتے ہیں کہ

ثم اختلف القائلون بوجوب القراءة
فقیل فی محل سکتات الامام وقیل
فی سکوته بعد تمام القراءة ولا دلیل
لهذین القولین فی الحدیث۔
امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت تجویز کرنے
والے آپس میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے۔ کہ
امام کے سکتات میں قرأت کرنی چاہیے۔ اور دوسرا گروہ
کہتا ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو اس
وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے لیکن ان دونوں
باتوں کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ص ۱۰۶

ان اقتباسات سے یہ بات آفتاب نیروز کی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ سکتات امام کا کسی حدیث
سے ثبوت نہیں ملتا۔ اور امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نہ تو امام پر سکتہ واجب ہے اور
نہ مستحب اور یہ بات بعید از قیاس اور انصاف ہے کہ شریعت حقہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت
سورہ فاتحہ کا مکلف تو بنائے لیکن اس کو قرأت کا موقع اور محل نہ بتلائے، یہ تو ایسا ہی ہوا
جیسا کسی نے کہا ہے ۵

در میان قعد دریا تختہ بندم کردہ

باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ ایسی خرافات ہے، جس سے شریعت حقہ کا دامن انصاف بالکل مبرا اور پاک ہے امام
ابوبکر الجصاص رح فرماتے ہیں کہ مقتدی کا کام تو یہ ہے کہ وہ امام کی پیروی کرے اور جانتے نہیں
کہ امام مقتدی کا تابع ہو۔ تو اس قائل کا قول کہ امام سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کرے۔ آن حضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کے خلاف ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ امام اس لیے مقرر
کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدی کی جائے اور پھر باوجود اس کے یہ معاملہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے مخالف ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ اور جب امام قرأت کرتے
لے نواب صاحب لکھتے ہیں کہ امام صنعا و علامہ زین و شاعر مجید و محدث مفید و محدث کامل و عارف و اصل
است، حامل بود کتاب و سنت بحسب اجتهاد نفس خود تقیید بر تقلید احد سے از اہل علم مذہب است۔

(تقصیر جہود الاحرار من تذکار خود الابرار ص ۸۰)

تو تم خاموش رہو اس حدیث میں آپ نے مقتدی کو امام کی قرأت کے لیے خاموشی کا حکم دیا ہے اور سکنات کا قائل امام کو مقتدی کے لیے انصات کا حکم دے رہا ہے۔ اور امام کو مقتدی کا تابع بنا رہا ہے اور یہ قول بالکل اگٹ ہے۔ اور اس پر بحث کرتے ہوئے مزید ارقام فرماتے ہیں:

وقوله انما جعل الامام ليقنعه به فاذا قرأ فانصتوا اخباره من ان من الائمة بالامان
ان ينصت الامام لقرأة المأموم لانه لو كان
مأمورا بالانصات له كان مأمورا بالائمة
به فيصير الامام مأموماً والمأموم اماماً في
حالة واحدة وهذا فاسد... الخ
(احكام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے پس جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو اس میں آپ نے خبر دی ہے کہ امام کی اقتدائیں یہ امر شامل ہے کہ اس کی قرأت کے لیے خاموشی اختیار کی جائے اور یہ ارشاد و صاف بتاتا ہے کہ جائز نہیں کہ امام مقتدی کی قرأت کے لیے انصات کرے کیونکہ اگر وہ اس کا مأمور ہوتا تو وہ اقتدا کا مأمور ہوتا تو ایک ہی حالت میں امام مقتدی ہو جاتا اور مقتدی امام اور یہ بالکل

فاسد ہے۔

پندرہواں اعتراض۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ خطبہ جمعہ کے وقت اتنی توجہ اور خاموشی کا حکم اور تاکید آتی ہے کہ اگر کوئی شخص شور و غل مچاتا ہو تو اس کو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ خاموش ہو جاؤ جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے۔

اذقلت لصاحبك يوم الجمعة انصت
فقد لغوت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۸)

یعنی جب تم کسی کو جمعہ کے خطبہ کے وقت یہ کہو کہ خاموش ہو جاؤ تو تم نے ایک بیجا اور بے ہودہ حرکت کی۔

مسلم ۱ ص ۲۸۱)

اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کے وقت ایسی توجہ اور خاموشی مطلوب ہے کہ امر بالمعروف اور

۱۲ کتاب القراءۃ ص ۸۲

لہ جزع القراءۃ ص ۳۵

۱۲ یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۰۶، ابوداؤد جلد

۱۲ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۲۰۶ وغیرہ

ص ۱۵۸، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

نہی عن المنکر بھی اس وقت ساقط ہے لیکن مع بذآن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اذا جاء احدکم يوم الجمعة والامام یخطب فلیکر رکعتین ولیتجوز فیہما (مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷) — جب تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں آئے کہ امام جمعہ کا خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس آنے والے کو مختصر طریق سے دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز ہے، جس میں بہر حال تلاوت قرآن کریم کی جاتی ہے اور یہ انصاف کے منافی نہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص امام کے پیچھے بجا اقتدار قرأت کرتا ہے تو وہ بھی آیت استماع اور انصاف کی مخالفت نہیں کر رہا۔

جواب۔ جمہور اہل اسلام خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ امام مالک، امام لیث بن سعد، امام ابو حنیفہ اور جمہور حضرات صحابہ و تابعین اور سلف کا مسلک یہ ہے کہ خطبہ کے وقت نماز صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷)

علامہ عراقی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، ابن عباس رضی اللہ عنہما، عروہ بن زبیر، مجاہد، عطاء بن ابی رباح، سعید بن المسیب، محمد بن سیرین، امام زہری، قتادہ، ابوالبرکات، یحییٰ بن یحییٰ اور قاضی شریح کا بھی یہی مذہب ہے۔ (فتح الملام جلد ۲ ص ۴۱۵)

امام ترمذی لکھتے ہیں کہ کوفے کے فقہاء اور محدثین کا یہی مسلک تھا۔ (جلد ۱ ص ۶۷) جب جمہور اہل اسلام کے نزدیک خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں۔ تو اس پر مقتدی کی قرأت خلف الامام کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا اور جس طرح خطبہ کے وقت نماز استماع اور انصاف کے منافی ہے اسی طرح قرأت خلف الامام بھی منافی ہے، جمہور کا کہنا ہے کہ گو آیت واذا قرئ القرآن..... التذکرۃ کا شان نزول صرف نماز ہے لیکن یہ آیت اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ اس لیے خطبہ کی حالت میں بھی ہر ایسے قول و فعل سے اجتناب ضروری ہے جو استماع و انصاف کے منافی ہو اور ظاہر ہے کہ نماز قولاً و فعلاً استماع و انصاف کے منافی ہے۔ لہذا نماز بھی صحیح

یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۹، نسائی جلد ۱ ص ۱۵۷، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی

جلد ۱ ص ۱۷۹ وغیرہ میں بھی موجود ہے بعض میں مختصر اور بعض میں قدرے تفصیل سے۔

نہ ہوگی اور آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ
یصلی ماکتب لہ، ثم نینصت اذا تکلم الامام امام کے آنے سے پہلے جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے
(بخاری جلد ۱ ص ۱۲۱، مسلم جلد ۱ ص ۲۸۳) اور پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو اس وقت نماز
طیالسی ص ۶۵) ترک کر کے خاموش ہو جائے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کے خطبہ پڑھنے سے قبل نماز پڑھنا جائز ہے لیکن خطبہ شروع
ہونے کے بعد گنجائش نہیں نکلتی اور بغیر خاموشی اور انصاف کے کوئی چارہ نہیں اور طیالسی کے یہ
الفاظ بھی مد نظر رکھیے فاذا تکلم الامام استمع وانصت۔ جب امام خطبہ پڑھے تو مقتدی اس
وقت توجہ کرے اور خاموش رہے اور حضرت نبی شہداء الہندی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے روایت کرتے ہیں کہ

فان لو یجد الامام خرج صلی ما بدالہ
وان وجد الامام قد خرج جلس فاستمع
وانصت الحدیث (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۴۱)
وقال رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح خلو
شیخ احمد وهو ثقہ... انتہی)

اگر امام ابھی خطبہ کے لیے نہ آیا ہو تو جتنی نماز پڑھی
جاسکتی ہے پڑھنی چاہیے اور جب امام خطبہ کے لیے
آچکا ہو تو اس وقت ہر شخص کو بیٹھ کر توجہ اور خاموشی
اختیار کرنی چاہیے۔ علامہ ہمیشی کہتے ہیں کہ اس روایت
کے سبب راوی بخاری کے راوی ہیں۔ ہاں مگر امام احمد کے
اشاد لیکن ہیں وہ بھی ثقہ۔

لہ ان کا نام علی بن اسحاق ہے۔ (فتح الملکم جلد ۲ ص ۴۱۵) ابن مینان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعد نسائی نے
اور محدث محمد بن حمدویہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۲)
حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۹۹) حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری ص ۴۲ میں لکھتے
ہیں کہ ہم فتح الباری میں جو حدیث بغیر گرفت کے نقل کریں گے۔ وہ صحیح یا حسن ہوگی۔ اور یہ روایت حافظ موصوفو
نے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۹۴ میں نقل کی ہے اور اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ مؤلف خیر الکلام نے (ص ۵۶۳)
۵۶۴ میں) یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں عطار خراسانی ہے اور حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ وہ ارسال
تدلیس اور کثرت وہم کا شکار تھے۔ اور بخاری نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ (تقریب ص ۱۷۹) اور مقدمہ فتح الباری
ص ۴۳۶ میں لکھتے ہیں کہ وہ بخاری کی شرط پر نہیں ہے۔ یہ علامہ ہمیشی کا وہم ہے۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ نماز کی گنجائش صرف اس وقت ہے۔ جب امام خطبہ کے لیے ابھی نہ آیا ہو۔ لیکن جب امام خطبہ کے لیے آچکا ہو تو پھر نماز کی گنجائش ہے اور نہ سلام و کلام کی اور خطبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی حدیث کا جواب جہور نے یہ دیا ہے کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے۔ بعض روایات نے نقل بالمعنی کے پیش نظر اس کو تعمیم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیم غطفانی رضی اللہ عنہما فاقہ کا شکار تھے۔ ان کی خستہ حالی اور پریشانی کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے لیے چندہ کرنے کا قصد فرمایا اور اس کا حکم دیا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھ لیں تاکہ لوگ ان کی پرگانہ صورت اور بے بسی کو دیکھ لیں اور دل کھول کر اس کی اعانت اور امداد کریں۔ چنانچہ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

جاء رجل يوم الجمعة والنبي صلى الله عليه وسلم يخطب بهيئة اذينة فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم اصليت قال لا قال حمل ركعتين وحث الناس على الصدقة الحديث۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نہایت خستہ حالی میں آیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے نماز پڑھی ہے؟ کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھو۔ اور لوگوں کو اپنے صدقہ اور خیرات کی تلقین فرمائی تاکہ اس کی امداد و اعانت ہو سکے۔

(سنائی جلد ۱ ص ۱۵۸)

(بقیہ پچھلا صفحہ) کہ اس کو صحیح کی شرط پر مانتے ہیں۔ (محصلاً) مگر یہ حافظ ابن حجر کا وہم ہے کیونکہ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۳۲۲ اور ص ۴۹۶ میں عطار کی روایت موجود ہے۔ محدث ابو سعید الدمشقی اور ان کے پیروکار اور علامہ قسطلانی وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ یہ عطار خراسانی ہے۔ لہذا یہ علامہ ہیشمی رحمہ اللہ کا وہم نہیں بلکہ حافظ ابن حجر کا وہم ہے اور جس بنا پر مولف مذکور انکار کرتے ہیں کہ چونکہ یہ کذب ہے لہذا بخاری کی شرط پر نہیں اتر سکتا۔ نہایت کمزور ہے۔ کیونکہ اس سے ضعیف تر راوی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ عرض کر سکتے ہیں۔ اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۲ میں نشان دہی کی ہے کہ یہ مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ صحیح مسلم کا راوی ہے اور یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اور اصول حدیث کی رو سے اس کے حسن ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

اور مسند احمد کی روایت کے الفاظ یوں ہیں۔ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ان هذا الرجل دخل المسجد في هيئة
بذرة فامرته ان يصلي ركعتين وانا
ارجوان يفتن له رجل فيتصدق
عليه - (فتح الباری ۲ ص ۳۲۶)

یہ شخص مسجد میں داخل ہوا اور یہ بہت شکستہ
حال تھا۔ میں نے اس کو اس امید سے دو رکعتیں
نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تاکہ کوئی صاحب دل اس
کو دیکھ لے اور اس پر صدقہ کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص واقعہ تھا۔ اور روایت میں سے بعض نے اس کو عمومی
رنگ میں پیش کر دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے جو محض بطور تائید پیش کی جاتی
ہے، جس کی مزید تائید معتمر کامرسل کرتا ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹)

وامسك عن الخطبة حتى فرغ من
صلواته - (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۲۰۳)

کہ جب تک وہ شخص نماز سے فارغ نہ ہو
گیا۔ آپ نے خطبہ بند کر دیا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں جو محض تائیداً پیش کی جا رہی ہے نہ کہ استدلالاً
ارکع رکعتین ولا تعد لمثل هذا -

(دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ و زیلعی جلد ۱ ص ۱۶۹)

حافظ ابن حجر مکتبے میں:

واما قصة سليك رضی اللہ تعالیٰ عنہ
فقد ذكر الترمذی انها اصح شییء
روی فی هذا الباب واقوی -

امام ترمذی رح کا ارشاد ہے کہ اس باب
میں سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ سب سے زیادہ
صحیح اور قوی تر ہے۔

(فتح الباری جلد ۲ ص ۲۲۵)

چونکہ یہ شخص نہایت ہی غریب تھا اس لیے آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس
کے لیے دس سواری سے چندہ کیا اور جب دوسرے اور تیسرے جمعہ چہر آیا تو پھر بلشیر گیا
آپ نے فرمایا اٹھ اور نماز پڑھ۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۳۹۹) اور چارے خیال میں یہ
بھی اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے کے لیے تھا تاکہ لوگ اس مفلوک الحال کو دل کھول کر

چندہ دیں بلکہ امام بخاریؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ دوسرے جمعہ پر آیا تو اس وقت
 آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ان یصدقوا
 علیہ وان یصلی رکعتین۔ (جزء القراءۃ ص ۳۷) کہ اس پر صدقہ کریں۔ اور اس کو دو رکعتیں
 پڑھنے کا حکم دیا اور بقول مولف خیر الکلام حافظ ابن حجر رحمہ نے اس کے لیے چندہ مانگنے کو
 جزو وعلت کہا ہے۔ (خیر الکلام ص ۵۶۵) مگر یہ جزو وعلت نہیں پوری علت ہے کیونکہ آپؐ
 دو تین جمعے متواتر صرف اسی خستہ حال شخص کو نماز کا حکم دیا ہے رہا امام نوویؒ اور حافظ
 ابن حجر رحمہما کا مسلم کی روایت کے پیش نظر یہ کہنا کہ یہ نص ہے اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔
 (محصلاً خیر الکلام ص ۵۶۵ والا عتصام ص ۱۲۷، اکتوبر ۱۹۶۲ء) درست نہیں۔

اولاً۔ اس لیے کہ روایت بالمعنی کا یہ جواب نہیں ہے۔

ثانیاً۔ اگر الفاظ یہی ہوتے تو کم از کم حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اس کے خلاف نہ کرتے
 ان کا عمل ہی اس کے غیر نص ہونے کی دلیل ہے اور جمہور اہل اسلام کی تائید اس پر مستزاد ہے
 امام نسائی سنن الکبریٰ میں اس حدیث کا یہ باب قائم کرتے ہیں: باب الصلوٰۃ قبل الخطبۃ
 زیلی جلد ۲ ص ۲۰۳) گو یا امام نسائی رحمہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ (نماز پڑھنے کا) خطبہ شروع ہونے
 سے پہلے پیش آیا تھا اور امام نسائی کا ایسا سمجھنا محض بے وجہ نہیں ہے کیونکہ میخطب مضارع کا
 صیغہ ہے اور زمانہ حال مستقبل دونوں کا اس میں احتمال موجود ہے۔ اور زمانہ استقبال مراد

لہ اسی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض محققین نے میخطب کا معنی یرید الخطبۃ کیا ہے۔ دیکھئے
 فتح الملہم جلد ۶ ص ۲۱۷، فیض الباری جلد ۲ ص ۳۳۳۔ امام نووی رحمہ اذا امن الامام فامتنوا کی شرح
 میں لکھے ہیں۔ قالوا معناه اذا اراد التامین۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۳) علماء کا بیان ہے کہ
 جب امام آئین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آئین کہو۔ جب امین ماضی میں اراد التامین کی گنجائش نکل
 سکتی ہے تو میخطب میں یرید الخطبۃ کا احتمال کیوں بعید ہے؟ علاوہ بریں بخاری جلد ۱ ص ۱۵۶
 میں (وقال الحافظ فی الفتح جلد ۲ ص ۳۶۸ متفق علیہ) اصل الفاظ میں تروو ہے۔ والہ امام میخطب
 او قد خرج کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو یا خطبہ کے لیے آ رہا ہو او قد خرج جملہ ہوتے ہوئے فریق ثانی کا دعویٰ
 اور کزور ہو جاتا ہے۔ دیکھئے مزید تحقیق کے لیے عارضہ الاحوذی جلد ۲ ص ۳۰۶۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

لینے کی صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے۔ جب تم میں کوئی شخص آئے۔ درآں حالیکہ امام خطبہ پڑھنا چاہتا ہو اور اس کا ارادہ کرتا ہو (جو قرآن سے معلوم ہو سکتا ہے) تو خطبہ سے قبل ہی تم نماز پڑھ لیا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں صرف دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ امام کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے ہی فارغ ہو کر استماع اور انصاف پر صحیح طور پر عامل ہو سکے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مؤلف خیر الکلام نے دو باتیں ایسی کہی ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے پہلی بات یہ کہ ولادہ امام یحییٰ بن اوقدیح میں تردّد صرف سعید کے بعض شاگردوں کو ہے۔ روح بن قاسم اور سفیان بن عیینہ کی روایت میں تردّد نہیں اس طرح شعبہ کے بعض شاگردانہ شمیم ابو زید ہروی و ہبیب بن خریزہ بغیر تردّد کے بیان کرتے ہیں۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۸) اور انہیں تنویح کے لیے ہے (محصلاً ص ۵۶۷)۔ مگر ہم نے بخاری شریف جلد ۱ ص ۱۵۱ کا حوالہ دیا ہے جس کی سندوں سے محدثنا آدم اخبارنا شعبہ قال حدثنا عمر بن دینار قال سمعت جابر بن عبد اللہ... الخ نہ تو اس سند میں سعید ہے اور نہ اس کے وہ مذکور شاگرد ہیں جن کا ذکر مؤلف مذکور نے کیا ہے۔ اس لیے حرف او کے ساتھ ہی اصل روایت ہے جو برائے شک ہے اور اگر حرف او تنویح کے لیے ہوتا اور خطبہ اور غیر خطبہ کی حالت اجابت نماز کے لیے بلا ہر ہوتی تو جہوراً و خصوصاً حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے خلاف نہ کرتے بلکہ وہ دونوں حالتوں کو برابر سمجھتے رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جہوریت حدیث کے معاملہ میں کوئی حجت نہیں (۵۶۳) تو یہ شکست فاش کی واضح علامت ہے۔ حتیٰ جامعیت کے ساتھ ہوتا ہے اور امت کی اکثریت کبھی غلط بات پر صحت نہیں ہو سکتی اور یہاں جہور کے پاس صحیح روایات ہیں محض جہوریت ہی نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام اپنے ناخواندہ حواریوں کو سمجھا رہے ہیں۔ دوسری بات مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ کہنا کہ خطبہ مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال مستقبل دونوں کا اس میں احتمال ہے۔ قواعد نحو سے بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہونا چاہیے اور خطبہ کا زمانہ وہی ہونا چاہیے جو آنے کا ہے... (ص ۵۶۶) بے شک یہ قواعد نحو سے بے خبری پر مبنی ہے اور ساری عمر پڑھا پڑھا کر بھی مؤلف خیر الکلام کو نحو کے بالکل ابتدائی گراں خبر بھی معلوم نہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جن حال اور عامل حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے وہ ایسا حال ہے جو ترکیب میں واقع ہوا اور یہاں خطبہ مضارع کا صیغہ ہے جو خود عامل ہے اور اس میں حال مستقبل کا معنی پایا جاتا ہے یہ راکباً کی طرح حال نہیں ہے جب کہ عامل اور ہوتا ہے۔ اور اس حال میں عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ بات اور حال کی ہے اور وہ بے خبری میں چسپاں دوسرے حال پر کر رہے ہیں۔

الحاصل خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جہور کے نزدیک صحیح حدیث کی روشنی میں ممنوع ہے۔ اور جس حدیث سے اجازت ثابت ہوتی ہے اس کا صحیح مجمل بھی آپ جہور کی طرف سے سن چکے ہیں۔ دریں حالات خطبہ کی حالت میں نماز کو جائز تصور کرتے ہوتے اس پر قرأت خلف الامام کے جواز کو قیاس کرنا ایک بے حقیقت اور بے اصل بات ہے، خصوصاً جب کہ مسئلہ مذکورہ منصوص ہے۔

سولھواں اعتراض۔ امام بخاری رحمہ مبارک پوریؒ اور مفتی کلا نوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب امام قرأت کر رہا ہو اور کوئی شخص آکر اس کی اقتدا کرنا چاہتا ہے۔ تو لامحالہ اس کو تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد ہی اقتدا نصیب ہو سکتی ہے اور اس کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے منافی ہے۔ لہذا مانعین قرأت خلف الامام کا عمل بھی آیت مذکورہ پر نہ ہوا۔ (جزیرہ القرآۃ ص ۳۵ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۲ وغیرہ)

جواب۔ پہلے پوری تفصیل کے ساتھ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ آیت کا مخاطب ہر ایسا شخص ہے جو امام کی اقتدا کر چکا ہو اور امام ابن جریر وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ

فان نصات خلفه لقرآته واجب علی
جو آدمی امام کی اقتدا کر چکا ہو۔ امام کی قرأت کے
من کاف مؤتایہ۔
لیے خاموش ہونا اس پر واجب ہے۔

رہا وہ شخص جس نے مطلقاً امام کی اقتدا نہ کی ہو یا ابھی اقتدا کرنے کا ارادہ ہی کر رہا ہو تو وہ شخص اس آیت کا مخاطب نہیں ہے اور تکبیر تحریمہ علمائے احناف کی تحقیق میں شرط ہے۔ (دیکھیے خانیہ جلد ۱ ص ۲۰ و سر اجیہ ص ۱۰ و ہدایہ جلد ۱ ص ۸۲ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۶۰ وغیرہ) اور شرط خارج ہوتی ہے۔ (و شرط الشئ خارج عنہ ہامش کنز ص ۳۰) لہذا قرأت امام کے وقت مقتدی کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے کسی طرح مخالف اور منافی نہیں ہے۔ ہاں اس کا قرأت کرنا یقیناً منافی ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہاں آیت کو اپنے عموم پر کیوں نہیں رکھا گیا؟ اور جو شخص نماز میں شریک نہ ہو اور وہ شور و غل مچاتا ہے (مصلحہ الاعتصام ص ۱۰، ۵، اکتوبر ۱۹۲۲ء) لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص نے اقتداء

نہ کی ہو اس کے لیے انصاف و استماع مستحب ہے، اس کو شور و غل کا حق کس نے دیا ہے؟ اور آیت استجاب کے حکم میں اپنے عموم پر ہے ہاں وجوب صرف مقتدی کے لیے ہے۔ کیونکہ شان نزول ہی خلف الامام کا مسئلہ ہے۔ کما مر۔

سترھواں اعتراض۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقی رحمہ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کرنے کے منکر ہیں۔ ان کا بھی آیت استماع و انصاف پر عمل نہیں ہے کیونکہ وہ بھی امام کے پیچھے ثناء وغیرہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں تو ثناء وغیرہ کی قرأت کیسے صحیح ہوتی؟ لہذا ثناء وغیرہ کی قرأت کرنا بالکل بھی آیت استماع و انصاف پر عمل نہ ہوتے۔

(جزء القراءة ص ۷، ص ۱۰، کتاب القراءة ص ۱۵، تحقیق الکلام ج ۲ ص ۴)

جواب۔ ان اکابر کا یہ اعتراض بھی سطحی قسم کا ہے اور قابل التفات نہیں ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے مدرک مراد ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے صرف ثناء کی قرأت کرنا ہے۔ اور امام کو ثناء، تقویٰ اور تسمیہ بھی پڑھنا ہے۔ اگر مدرک امام سے پہلے قرأت ثناء سے فارغ نہ ہوا۔ تو امام کے ساتھ تو بہر حال فارغ ہو ہی جائے گا۔ اور جب امام قرأت قرآن (سورۃ فاتحہ) شروع کرے گا تو مدرک ثناء کے پڑھنے سے فارغ ہو چکا ہوگا۔ لہذا مدرک باوجود ثناء پڑھنے کے آیت مذکورہ کا مخالف نہ ہوگا۔

ثانیاً۔ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے بلسوق مراد ہے تو محققین فقہائے احناف کی تصریح سے یہ بات ثابت ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت ثناء پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ قاضی خاں جلد ۱ ص ۴۲، فتاویٰ سراجیہ ص ۱ اور فتح القدیر جلد ۱ ص ۳۲۵ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، بلکہ علامہ حلبی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۵۹ھ) نے اس کی تصریح کی ہے کہ ولایاتی الثناء مطلقاً۔ (کبیری ص ۳۴) کہ جب امام قرأت شروع کر چکا ہو تو مقتدی کو کسی بھی نماز میں ثناء نہیں پڑھنی چاہیے۔ جہری نمازوں میں قرأت امام کا علم مقتدی کو آسانی سے ہو سکتا ہے اور سرسری نمازوں میں قرأت اور شواہد سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۶۹ میں امام ابو جعفر رحمہ کے والد سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مقتدی جب امام کو سورۃ فاتحہ میں پائے تو بالاتفاق شمار پڑھے۔ (منیۃ المصلیٰ ص ۶۵ محصلہ) اس میں بالاتفاق سے تمام فقہاء احناف کا اتفاق مراد نہیں ہے بلکہ صرف امام ابو یوسف رحمہ اور امام محمد کا اتفاق مراد ہے۔ (صغیری ص ۱۲۸ اور کبیری ص ۳۲۹) وراثتاً۔ قاضی شوکانی رحمہ لکھتے ہیں کہ

وظاهر التقیید بقولہ من القرآن یدل علی انہ لو باس بالو ستفتاح حال قرأۃ الامام بعمالیس بقرآن والتعوذ والدعاء (۵۱) اور دعاء وغیرہ جو قرآن نہیں، پڑھنے میں کوئی (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۴) ہرج نہیں ہے۔

اور نواب صاحب لکھتے ہیں:

وایں روایات (یعنی فلا تقرأوا بشئ من القرآن وغیرہ) و تخوآن دلالت وارندہ برآنکہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم ست فقط و اما قرأۃ توجہ واستعاذہ و تخوآن (یعنی شمار وغیرہ) پس لا باس بہ است۔ و نہی تناول آن نیست و نہ بوجہ از وجہ برآن دلالت وارد۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴) مگر سورۃ فاتحہ کو نواب صاحب نے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور یہی مضمون مولانا عبد الصمد صاحب نے بیان کیا ہے۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۲) اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو صرف قرأت قرآن سے منع کیا گیا ہے۔ شمار تجمید، تسبیح اور تشهد وغیرہ سے اس کو منع نہیں کیا گیا۔ اور آیت و اذا قرئ القرآن... الایۃ اور حدیث فلا تقرأوا بشئ من القرآن اس کی تائید کرتی ہے۔ اس سبب کو پیش نظر رکھنے سے حضرت امام بخاری رحمہ، امام بیہقی رحمہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ کا یہ مغالطہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ تمہارے نزدیک فرض (یعنی قرأت) سے غیر فرض (یعنی شمار وغیرہ) کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان دیگر امور میں امام کفایت نہیں کر سکتا۔ مگر قرأت میں کفایت کر سکتا ہے۔ (جزیر القراءۃ ص ۷، کتاب القراءۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۲)

یہ بات توجہ سے دیکھئے کہ ان اکابر کے نزدیک صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کی اہمیت کیوں

ہے اور قرآن کریم کی باقی ایک تیسویں سوورتوں کی اہمیت کیوں نہیں ہے آخر وہ سورتیں بھی تو قرآن کریم کی ہیں؟ - صحیح: ہے یہ گنت بد کی صد اجلیسی کہو ویسی سنو

مگر قرآن وحدیث کی فہمائش کے علاوہ قاضی شوکانی رح اور نواب صاحب بھی صحیح بات کہنے اور لکھنے پر مجبور ہیں کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم است، فقط۔ اس لیے جب مقتدی کو قرأت امام کے وقت صرف قرآن کریم کی قرأت سے منع کیا گیا ہے۔ تو شمار وغیرہ کا سوال اٹھانا دور از کار بات ہے۔

اٹھارواں اعتراض۔ حضرت امام بخاریؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب صبح کی نماز کی جماعت کھڑی ہو تو تمہارے نزدیک صبح کی سنتیں قریب ہی پڑھنی جاتیں ہیں۔ کیا تمہارا یہ فعل آیت استماع وانصات کے منافی نہیں ہے؟ لہذا تمہارا عمل بھی تو اس آیت پر نہ ہوا۔ (جزء القراءة ص ۸) جواب۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا وجوبی طور پر مخاطب صرف وہ شخص ہے جو امام کی اقتدا اختیار کر چکا ہو۔ جس نے ابھی تک امام کی اقتدار نہیں کی وہ اس کا وجوبی طور پر مخاطب نہیں ہے۔ لہذا جماعت کے پاس سنتیں پڑھنے والا کسی طرح بھی آیت کا مخالف نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں محققین علماء اخاف نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کو سنتیں ترک کر کے جماعت میں شریک ہونا چاہیے۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ مسجد کے علاوہ اگر اور کوئی جگہ نہ ہو تو نمازی کو صبح کی سنتیں پڑھنا جاتیں نہیں ہیں کیونکہ ترک مکروہ فعل سنت پر مقدم ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

واشد ما یكون كراهية ان یصلیہما
منا نطال لصف كما یفعلہ كثیر من
الجهلة۔ (فتح القدير جلد ۱ ص ۳۴ طبع مصر)
اور سب سے زیادہ کراہت اس بات میں ہے کہ صف
کے پاس ہی صبح کی سنتیں پڑھی جائیں جیسا کہ بہت
سے جاہل پڑھ لیا کرتے ہیں۔

غرضیکہ امام بخاری رح کا یہ اعتراض بھی کسی طرح ان کے لیے مفید نہیں ہے اور نہ اس طرح

ان کا مطلب پورا ہو سکتا ہے۔

انیسواں اعتراض۔ مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ آیت مذکورہ خطبہ کو بھی شامل ہے۔

لے جب صبح کی جماعت ہو رہی ہو تو اس وقت صبح کی سنتوں سے متعلق حضرات فقہاء اور محدثین کا اختلاف ہے۔
(باقی اگلے صفحہ پر)

حالانکہ تمہارے نزدیک جب خطیب یا ایتھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔
پڑھنا ہو تو سامعین کو آہستہ آہستہ درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ (کفایہ جلد ۱ ص ۶۸ اور
شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۷۵) لہذا آیت استماع وانصات پڑھنا راعمل بھی نہ ہوا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۳۳)

جواب — یہ تحقیق نقل کی جا چکی ہے کہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے۔ نزول آیت
کے وقت خطبہ کا وجود بھی نہ تھا۔ ہاں عموم الفاظ میں خطبہ بھی شامل ہے۔ اس لیے بالطبع اور
ثانوی حکم کی ظاہری مخالفت سے مقصود اولین اور بالذات حکم کی مخالفت کرنی کیسے جائز اور
صحیح ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں اگرچہ بعض علمائے احناف نے خطبہ کے وقت دل میں درود
شریف پڑھنے کی اجازت دی ہے بلکہ اس کو صواب اور صحیح کہا ہے۔ لیکن محققین آہستہ
پڑھنے سے بھی منع کرتے ہیں۔ چنانچہ امام قاضی خان ^{رحمہ} (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ایک گروہ کہتا ہے کہ پاس ہی پڑھ لی جائیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے موقوفاً درود
آتی ہیں۔ علامہ بیہقی ^{رحمہ} ایک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ روایت، ثقات اور دوسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ
رجالہ موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۷۵) دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جماعت کے بعد پڑھ لی جائیں جیسا
بعض احادیث میں آتا ہے لیکن اس مضمون کی بیشتر حدیثیں ضعیف ہیں۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر صبح کی ستیہ
رہ جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن یہ قول غلط ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ سورج نکلنے کے بعد پڑھی
جائیں (یہ ضروری نہیں کہ وہی جگہ اور وہی وضو ہو) جیسا کہ صحیح اور مرفوع حدیث میں آتا ہے۔ (ترمذی جلد
ص ۵۷، مستدرک جلد ۱ ص ۲۷۷، سنن الکبیرے جلد ۲ ص ۴۸۴) چونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
بیماری اور تندرستی، اقامت اور کسی حالت میں صبح کی ستیہ ترک نہیں کیں۔ (طیالسی ص ۲۲۰، زاد المعاد
جلد ۱ ص ۱۸۵) لہذا یہی آخری مسلک قوی تر ہے۔

۱۔ حسن بن منصور، امام کبیر اور بحر عمیق تھے، بڑے زریک اور نکتہ رس تھے، بڑے عابد اور فقیہ النفس تھے۔ ان کا
شمار مجتہدین فی المسائل میں ہوتا ہے۔ (فوائد بیہقیہ ص ۶۴، ۶۵) صاحب جواہر المصنیہ (علامہ ابو محمد عبدالقادر ۷۵ھ)
ان کو امام اکبیر سے یاد کرتے ہیں۔

(جواہر المصنیہ جلد ۱ ص ۲۰۵)

وہ مشائخنا قالوا یا نہ لہ یصلی علی النبی
صلی اللہ علیہ وسلم بل یستمع وینصت
لہ ان الہ استماع فرض والصلوۃ علی
النبی صلی اللہ علیہ وسلم یمکن
بعد هذه الحالة۔ (خانیہ جلد احث)

ہمارے مشائخ کا بیان ہے کہ خطبہ کی حالت
میں درود شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ
استماع اور انصاف ضروری اور فرض ہے اور
سامع کہ خطبہ کے لیے نہایت خاموشی سے توجہ
کرنی چاہیے اور درود شریف کا پڑھنا اس کے
بعد بھی ممکن ہے۔

فتاویٰ سراجیہ ص ۱۷ میں لکھا ہے کہ فقیہ حمام الدین نے آہستہ پڑھنے کی اجازت دی
ہے لیکن شمس اللائمہ سرخسی (المتوفی ۷۲۳ھ) آہستہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔
اور مسبوٹ سرخسی جلد ۲ ص ۲۹ میں آہستہ پڑھنے کی بھی صراحت کے ساتھ ممانعت بیان کی گئی
ہے، حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ محققین کا بیان ہے کہ چونکہ استماع اور انصاف فرض اور
ضروری ہے۔ اس لیے حضرت امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک خطبہ کے وقت آہستہ درود شریف
پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ (فتح القدیر جلد ۲ ص ۲۲۱، طبع مصر) اور یہی مسلک علامہ
ابن عابدین شامی رح (المتوفی ۱۲۵۲ھ) کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہو جلد ۲ ص ۲۲۱) لہذا مبارک
پوری صاحب کا یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے۔

بیسواں اعتراض۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سمری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ
فاتحہ پڑھنے کے استحباب پر استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ذکر قرأت اور
دعا کے بغیر سکوت اختیار کرنا نہ مامور بہ ہے اور نہ عبادت ہے بلکہ وسوس کا دروازہ
کھولنے کا ایک سبب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا سکوت سے افضل
ہوگا۔ اور قرأت قرآن سے بہتر ذکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہذا سمری نمازوں میں امام کے پیچھے

لہ علامہ سراج الدین اودمی رح المتوفی فی حدود ۷۰۰ھ۔

لہ امام، علامہ، حجت، تکلم، مناظر، اصولی اور مجتہد تھے، بسوط کی پندرہ جلدیں (باب الشرط تک)
بغیر مراجعہ کتب کے زبانی انھوں نے اظہار فرمائی تھیں۔ جب کہ حق گوئی کی پاداش میں حکومت وقت نے پرنس
دستور کے مطابق ایک تاریک کنوین میں ان کو مجسوس کر رکھا تھا۔ (فوائد بہیہ ص ۱۸۸)

سورۃ فاتحہ کا پڑھنا مستحب ہوگا۔ (محصلاً فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۵۰)

جواب۔ شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کا یہ استدلال بھی درست نہیں ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ مقتدی کا فریضہ استماع و انصات ہے نہ کہ قرآۃ اور استماع

و سماع کا فرق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

ثانیاً۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں سورۃ فاتحہ کے بعد

کم و بیش پچیس تیس آیتیں پڑھنی مسنون ہیں اور مقتدی کے لیے دیگر حضرات سلف

خلف کی طرح شیخ الاسلام رحمہ کے نزدیک بھی ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی

گنجائش نہیں ہے۔ اگر کم و بیش تیس آیتوں کے طویل وقفہ میں مقتدی پر وسوسہ

دروازہ نہیں کھلتا تو امید واثق ہے کہ سورۃ فاتحہ کے مختصر سی سات آیتوں کے وقفہ

میں بھی باب و وسوسہ مسدود ہی رہے گا۔

ثالثاً۔ خود شیخ الاسلام رحمہ اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کے لیے ما زاد علی الفاتحہ

میں قرأت کی بجائے استماع افضل ہے۔ نہ معلوم یہاں ذکر قرأت اور دعا کے بغیر

سکوت کیوں اعلیٰ اور افضل ہو گیا ہے؟ اس لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت کے وقفہ میں

بھی استماع افضل رہے گا کیونکہ بقول شیخ الاسلام رحمہ آیت و اذا قرئ القرآن کا

اولین مصداق صرف سورۃ فاتحہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اور سب سے زیادہ

میں بھی قرآۃ قرآن یقیناً ہوتی ہے۔ ہاں اگر و اذا جہر بالقرآن کا ارشاد ہوتا۔ تو بات الگ تھی۔

ہم نے شیخ الاسلام رحمہ کے جواب میں جو باتیں عرض کی ہیں وہ ہماری اپنی اختراع نہیں بلکہ خود

موصوف نے بیان کی ہیں۔

نیز مسلمانوں کے اس اجماع میں کہ ما زاد علی الفاتحہ

میں مقتدی کو قرآۃ کے بجائے استماع کا حکم ہے اس امر

پر دلیل ہے کہ مقتدی کو استماع کا حکم ہے اس امر پر دلیل

ہے کہ مقتدی کا استماع اس کے پڑھنے سے بہتر اور افضل

ہے بلکہ اس کو صرف حکم ہی یہ ہے کہ وہ قرأت نہ کرے

وایضاً ففی اجماع المسلمین علی انہ فیما

یزاد علی الفاتحہ یومر بالہ استماع دون

القرآۃ دلیل علی ان استماع لقرآۃ الامام

خیر لہ من قرأتہ معہ بل علی انہ مأمور

بالہ استماع دون القرآۃ مع الامام۔

(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۵) اور استماع کرے۔

اور لکھتے ہیں کہ

فان الكتاب والسنة امرت الموعوم بالاستماع
 دون القراءة والامه منفقون على ات
 استماعه لما زاد على الفاتحة افضل
 من قراءة ما زاد عليها۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۳)
 کتاب اور سنت نے مقتدی کو یہ حکم دیا ہے
 کہ وہ قرأت نہ کرے بلکہ سننے اور امت اس پر
 متفق ہے کہ "ما زاد على الفاتحة" میں استماع
 قرأت سے بہتر اور افضل ہے۔

موصوف کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھ کر سنجی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے نقل
 کردہ جملہ جوابات خود شیخ الاسلام کی عبارات سے ماخوذ ہیں۔ باقی استماع کا معنی اور مطلب
 پوری تشریح کے ساتھ پہلے نقل کیا چکا ہے۔ اس میں الجھ کر جاوے مستقیم سے پہلو تہی کرنا
 اور باب تحقیق کو زیب نہیں دیتا۔

قارئین کرام! ہم نے آیت کے سلسلے میں کافی وقت لیا ہے۔ اگرچہ فریق ثانی کی جانب
 سے اس سلسلے میں بعض لچر پوچ اور لایعنی اعتراضات یا استدلالات اور بھی کیے گئے ہیں
 لیکن ہمیں ابھی آپ سے بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے ہم ان کو نقل کرنے اور جواب عرض
 کرنے میں مزید آپ کے دماغ کو پریشان نہیں کرتے اور باب اول کو ہمیں ختم کرتے ہیں۔

باب دوم

پہلے باب میں قرآن کریم کی آیت اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور دیگر جمہور سلف و خلفؓ سے اس کی تفسیر نقل کی گئی ہے کہ واذا قرئ القرآن... الآية کا شان نزول صرف نماز ہے۔ اور مقتدی کو امام کے پیچھے کسی نماز میں قرآن کرنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ آیت کی یہ تفسیر معویدہ بالاجماع ہے۔ اور آیت کی تفسیر پر جتنے اہم سوالات کیے گئے تھے ان کے تفصیلی جوابات بھی عرض کیے جا چکے ہیں۔ اب باب دوم میں ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح صریح اور مرفوع قہرلی اور فعلی حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام کا وظیفہ پڑھنا اور مقتدی کا خاموش رہنا ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے ان پر جو سوالات کیے گئے ہیں ان کو نقل کر کے ان کے مسکت جوابات بھی عرض کر دے گئے ہیں:۔

باقول نبی چون و چہرارانہ شناسیم

داریم بہ اخلاص سرے بر خط تسلیم

قانون اشارات و شفا رانہ شناسیم

قرآن و حدیث است شفا تے دل رنجور

پہلی حدیث:

امام مسلم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق بن ابراہیم نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

امام مسلم (المتوفی ۲۶۱ھ) صحیح مسلم شریف کے مؤلف ہیں جو بخاری شریف کے بعد تمام حدیث کی کتابوں میں پہلے درجہ پر
(حاشیہ: لا اور حاشیہ: لکے صفحہ پر دیکھئے)

جریز نے بیان کیا۔ وہ سلیمان تمیمی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ یونس بن جریر سے اور وہ حطان بن عبد اللہ القاشی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ سے (المتوفی ۵۲ھ) روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک طویل حدیث میں فرمایا:

(تقیہ نوٹ نمبر ۱۰ نمبر ۲) صحیح تسلیم کی جاتی ہے اور امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ کہ بخاری و مسلم دونوں کی تمام روایتیں صحیح ہیں۔ علامہ ذہبی رح ان کو الامام، الحافظ اور حجت الاسلام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۰) علامہ بیروینی مشہور امام ہیں جو ابن راہویہ سے مشہور ہیں۔ مقدمہ میں ان کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے۔

علامہ ابو القاسم لاکطی رح کا بیان ہے کہ جریر رح بن عبد الحمید رح کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے اور ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۷۶) علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ اور الحجۃ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۰)

علامہ مسلم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم سلیمان سے بڑا حافظ حدیث چاہتے ہو؟ (مسلم جلد ۱ ص ۱۴۲) ورا یہ ص ۹۳) علامہ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (طبقات جلد ۱ قسم دوم ص ۱۸) ابن حبان نے ان کو امام اور شیخ الاسلام کہتے ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۲۱۲) امام ابن معین، امام احمد، نسائی اور عیسیٰ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ثوری کا بیان ہے کہ وہ حافظ بصرہ میں تھے۔ امام شعبہ فرماتے تھے کہ سلیمان خالص اور مجسم یقین تھے۔ امام یحییٰ کا بیان ہے کہ مجھے کسی ایسے شخص کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی جس کے دل میں سلیمان تمیمی سے زیادہ خوف خدا موجود ہو۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، متقن، حافظ، صاحب سنت اور بصرہ کے عبادت گزاروں میں تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۰۷) علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ، الامام اور شیخ الاسلام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۲)

علامہ محدث ابن ناصر الدین کا بیان ہے کہ وہ مفسر قرآن آیتہ فی الحفظ اور نسبی انی کے امام تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۵۳) ابن سعد ان کو ثقہ، مامون اور حجت کہتے ہیں۔ (طبقات جلد ۱ قسم دوم ص ۱) عبد الرحمن بن ہدیٰ کا بیان ہے کہ قتادہ حمیریہ کے جیسے پچاس آدمیوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے۔ (تہذیب الاسما جلد ۱ قسم اول ص ۱۵) حافظ ابن القیم کہتے ہیں کہ وہ بصرہ کی جامعہ افتار کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲) ابن سیرین کا بیان ہے کہ قتادہ سب لوگوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے (کتاب الحلال ترمذی ص ۲۳۸) اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا
 فیین لنا سنتنا وعلما صلواتنا فقال
 اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم
 احدکم فاذا کبر فکبروا واذ اقرأ فانصتوا
 واذ قال غیر الم غضوب علیہم ولا الضالین
 فقولوا آمین۔ الحدیث

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب
 فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین
 فرمائی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور یہ فرمایا کہ نماز پڑھنے
 سے قبل اپنی صفوں کو درست کر لو۔ پھر تم میں سے
 ایک تمہارا امام بنے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر
 کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور
 جب وہ غیر الم غضوب علیہم ولا الضالین کہے
 تو تم آمین کہو۔

(مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا فریضہ اور ڈیوٹی ہے۔ مقتدیوں کا وظیفہ
 صرف خاموش رہنا اور انصت کرنا ہے اور ان کے لیے بغیر انصت کے اور کوئی گنجائش
 نہیں ہے اور چونکہ یہ روایت مطلق ہے۔ لہذا ستری اور بھری تمام نمازوں کو شامل ہے۔
 اور مقتدیوں کو کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت اور گنجائش نہیں ہے۔
 یہ روایت صحیح مسلم کے علاوہ حدیث وغیرہ کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں بھی موجود ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۳۵۱۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلماء
 لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد علماء التابعین والائمة العالمین لکھتے ہیں
 (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۹ ص ۳۱۳) امام بیہقیؒ ان کو حافظ حدیث لکھتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۰۶)

اللہ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

لکہ یونس بن جبیرؒ امام مسلم کا بیان ہے کہ وہ حدیث کے بیان کرنے میں سچپتے کا رحدث تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۴۷۷)
 امام ابن معینؒ علیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو
 ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۳۶)
 حطان بن عبد اللہ الرقاشیؒ، امام علیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث ابن ماجہؒ ان کو ثبت
 کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۹۲) حضرت ابو موسیٰ
 الأشعریؒ جلیل القدر اور صاحب مناقب صحابی ہیں۔

جن طرح کہ حاشیہ سے بخوبی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حافظ ابو عوانہ رحمہ کی بعض سندیں ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو عوانہ رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الصائغ رحمہ نے مکہ مکرمہ میں بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی بن عبد اللہ رحمہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جریر بن عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ سلیمان بن تیمی سے اور وہ قتادہ سے اور وہ ابو غلاب یونس بن جبیر سے اور وہ حطان بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، مسند احمد جلد ۲ ص ۴۱۵، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵، بیہقی جلد ۲ ص ۱۵۵

ابن ماجہ ص ۶۱، محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۲۲۰۔ مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۸۱۔ جامع صغیر سیوطی ص ۳۰۔ معنی ابن قتادہ

جلد ۱ ص ۶۰۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲ ص ۱۲۲، نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۴۹۔ نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۲۴۔

توجیہ النظر ص ۲۲۰۔ شرح بلوغ المرام جلد ۱ ص ۲۲۵۔ فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱۔ زہر الربی جلد ۱ ص ۱۲۶۔

درایہ ص ۹۹۔ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۰۔ اعلیٰ السنن جلد ۲ ص ۲۲۶۔ کتاب القراءۃ ص ۸۴۔ امام الکلام

ص ۱۱۱۔ کنز العمال جلد ۲ ص ۱۸۶، ۶۶۔ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۱۔ شرح نقایہ ص ۸۳۔ سخن الباری

جلد ۲ ص ۳۶۲۔ سخن المعبود جلد ۱ ص ۳۲۵۔ تنقیح الرواۃ جلد ۱ ص ۱۵۲۔ عمدة القاری جلد ۳ ص ۶۵۹۔

فصل الخطاب ص ۲۴۔ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۵۔ جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۳۔ تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹۔

کتاب العلل جلد ۱ ص ۱۶۲۔ شرح المغنی للکبیر جلد ۱ ص ۱۳۲۔ منتقی الاخبار جلد ۲ ص ۱۳۲۔ تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲۔

فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲۔ جزر القراءۃ ص ۵۶۔ تنوع العبادات ص ۸۶۔ ازالۃ الستر ص ۵۱۔ خاتمۃ الخطاب

ص ۱۶۔ بدل الجود جلد ۲ ص ۵۵۔ برہان العجایب ص ۱۰۲۔ اور عقیدۃ الحمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۳ وغیرہ

حدیث، تفسیر، شرح حدیث اور کتب فقہ میں نقل کی گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اس طرح لکھتے ہیں:

كما رواه مسلم في صحيحه من حديث ابي موسى الاشعري رضي الله تعالى عنه قال قال

رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم انما جعل الامم ليؤتم به فاذا اكبر فكبروا

واذا قرأ فانصتوا۔ ۱۔ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰) اور قاضی شوکانی رحمہ نے روایت اسی طرح

نقل کی ہے۔ اور فرماتے ہیں رواہ احمد و مسلم... الخ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۵۰) اور امام احمد نے

کتاب الصلوٰۃ ص ۵۲ میں اسی طرح نقل کی ہے۔

(باقی نوٹ نمبر ۲۳۷ و ۲۳۸ کے صفحہ پر دیکھئے)

خطبتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فعلمنا سنتنا و بین لنا صلواتنا فقال

اذا کبر الامام فکبروا و اذا قرأ فانصتوا

(صحیح ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۳۳)

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہم سے

خطاب کیا اور سنت کی تعلیم دی اور نماز کا طریقہ

بتلایا اور فرمایا کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو

اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابوعوانہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سلیمان بن اشعث سجستانی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے

ہیں کہ ہم سے عاصم بن نصر نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معتمر بن عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ

فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سلیمان تمیمی سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں (حدیثنا قتادة) ہم سے

قتادہ نے بیان کیا۔ وہ ابو غلاب یونس بن جبیر سے اور وہ حطان بن عبد اللہ الرقاشی سے

روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

انہوں نے فرمایا:

(بضیر نوٹ پچھلا صفحہ) ۱۔ امام ابوعوانہ کا نام یعقوب بن اسحاق ہے (المتوفی ۳۱۶ھ) علامہ ذہبی ان کو

الحافظ اور الثقة الکبیر کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲)

۲۔ الصائغ کا نام محمد بن اسمعیل بن سالم تھا۔ (المتوفی ۲۷۶ھ) محدث ابو حاتم نے ان کو صدوق کہتے ہیں۔

ابن خراش نے ان کو اہل فہم و اہل امانت کہتے ہیں۔ ابن جبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۳۹)

تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۸)

۳۔ علی بن عبد اللہ بن مدینی۔ (المتوفی ۲۳۲ھ) علامہ ذہبی ان کو حافظ العصر قدوہ اور من اباب ہذا

الشان لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵) امام نسائی نے فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ مامون اور احد الاممہ فی

الحدیث تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۳۵۶)

۴۔ صحاح ستہ میں مشہور کتاب سنن ابوداؤد کے مصنف ہیں۔ علامہ ذہبی ان کو الامام الثبت اور سید

الحفاظ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲) ۵۔ ۲۷۷ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

۵۔ محدث ابن جبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۵۸) حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ

ان کو صدوق لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۸۵) کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔

۶۔ علامہ ذہبی ان کو الامام، الحافظ اور الثقة لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶)

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فکان ما بین لنا من صلواتنا وعلما سننتنا قال اقیمو الصوف ثم لیومکوا احدکم فاذا کبر الازمام فکبروا واذ اقرأ فانصتوا (صحیح ابوعوانہ ج ۱ ص ۱۲۱، ابوداؤد جلد ۱۲)

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پھر خطاب فرمایا اور نماز کا طریقہ سکھایا اور سنت کی تعلیم دی اور فرمایا کہ صفیں درست کیا کرو۔ تم میں ایک امامت کا فریضہ انجام دے جب امام تکبیر کے تو تم بھی تکبیر کرو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابو عوانہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سہل بن بجر چند سا بوری نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن رشید نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو عبیدہ رز نے بیان کیا۔ وہ قنادہ سے روا کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ الازمام فانصتوا واذ اقال غیر المغضوب علیہم واذ الضالین فقولوا آمین۔ (ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۳۶) کہو۔

آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین

لہ عبد اللہ بن رشید اور ابو عبیدہ کو علامہ سمعانی مستقیم الحدیث لکھتے ہیں۔ (کتاب الانساب ص ۱۳۶)۔ مولانا ظفر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ سہل بن بجر کا ترجمہ مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن کنز العمال جلد ۱ ص ۱ میں لکھا ہے کہ صحیح ابوعوانہ کی تمام حدیثیں صحیح ہیں۔ (اعلام السنن جلد ۲ ص ۴۹) اور تدریب الراوی ص ۵۵ میں ابوعوانہ کو صحیح کتابوں میں شمار کیا ہے اور علامہ ذہبی نے ابوعوانہ کو صحیح المسند کے الفاظ سے بیان کیا ہے (تذکرہ جلد ۲ ص ۱) راقم الحروف کہتا ہے کہ مبارک پوری صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ ایک سنہ کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ اور حافظ ابو عوانہ کی سند کا بھی صحیح ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ (بلفظ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۷۸) محقق نیموی نے اس کو متابعت میں پیش کیا تھا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۵) اور مبارک پوری صاحب نے تصحیح طلب کی تھی۔ (ابکار المنن ص ۱۵۲) مگر یہ عبارت خود ہی ان کا جواب ہے۔ خود اپنی پسند کے جواب سے بہتر جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟ وکفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔ مولانا عبد اللہ صاحب دہلوی مرحوم نے الکتاب المستطاب ص ۸۶ میں اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۱۶ اور ص ۴۱۷ میں ابو عبیدہ اور سہل بن بجر کے بارے میں ادھر ادھر کے راویوں کا نام لسان المیزان اور کتاب الکنی واولیائی سے نقل کر کے ان کی جو تضعیف (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ان تمام صحیح روایات سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے اور مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصاف کرنا ہے اور آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ جب امام ہر کرے تو تم خاموش رہو بلکہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور یہ مفہوم عبارتہ النص کے طور پر ہم چہری اور ستری سب نمازوں کو شامل ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پر فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی ہدیہ ناظرین کر دیے جائیں۔ تاکہ فن روایت اور درایت کے لحاظ سے اس حدیث کی حقیقت بھی آشکارا ہو جائے اور اعتراضات کی پوزیشن بھی واضح ہو جائے۔

پہلا اعتراض

حضرت امام بخاریؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سندیں سلیمان تیمی مدلس ہیں اور وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس لیے حسب قاعدہ محدثین یہ روایت قابل استدلال نہیں ہو سکتی۔ (جزء القراءة ص ۵۶، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۲ وغیرہ) جواب۔ یہ سوال بالکل سطحی قسم کا ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مدلس راوی جب حدثنا وغیرہ الفاظ سے تحدیث کرے تو تدریس کا الزام اس پر سے رفع ہو جاتا ہے اور ہم پہلے ابو عوانہ اور ابو داؤد کی صحیح سند کے ساتھ ان کی تحدیث (سلیمان تیمیؒ قال حدثنا قاسم دة) نقل کر چکے ہیں اور معتز بن سلیمانؒ پر بھی مدلس ہونے کا الزام ہے۔ مگر ابو عوانہ اور ابو داؤد کی سند روایت میں وہ بھی سمحت فرماتے ہوئے تحدیث کرتے ہیں۔

(بچپلا صفحہ۔ حاشیہ) کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ بھلا صحیح ابو عوانہ کے یہ ضعیف راوی کیسے ہو سکتے ہیں جو تصریح محدثین صحیح ہے۔ ابو عوانہ کی سند میں جو راوی ہیں وہ بالکل ثقہ ہیں اور جن راویوں کی انھوں نے نشانہ ہی کی ہے وہ راوی ابو عوانہ کے ہرگز نہیں ہیں۔

۱۔ شرح نجمۃ الفکر ص ۵۳، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۷۰ اور تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۲ وغیرہ میں محدثین کا یہ قاعدہ نقل کیا گیا ہے۔

و ثانیاً۔ جملہ محدثین کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ اگر مدلس راوی کا کوئی متابع موجود ہو تو تالیس کا عیب اور طعن اس سے اٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ مبارک پور ہی صاحب لکھتے ہیں کہ تالیس کا طعن متابعت سے اٹھ جاتا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۲) اور صحیح ابو عوانہ کی روایت میں ابو علیہ سلیمان تیمی کے متابع ہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا محمد حسن صاحب محدث فیض پور می فرماتے ہیں کہ صحیح ابو عوانہ کی مستقل سند میں ابو عبیدہ الحداد سلیمان تیمی کے متابع ہیں اور اس کی سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ (فی غایۃ الصحتہ) (الدلیل المبین) علاوہ ازیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ میں ان کے دو اور متابع موجود ہیں۔ عمر بن عامر اور سعید بن ابی عمرو جب سلیمان تیمی خود بخود حدیث کرتے ہیں اور ان کے تین ثقہ راوی متابع موجود ہیں تو پھر اعتراض کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

دوسرا اعتراض:

حضرت امام بخاری، امام دارقطنی اور امام ابوداؤد وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قلنا فانصتوا کی زیادت محفوظ نہیں ہے۔

لعمریٰ بہ الا سلیمان التیمی فی
 ہذا الحدیث۔ (جزء القراءة ص ۵۶)

کیونکہ سلیمان تیمی کے بغیر اس حدیث میں
 یہ زیادت اور کسی سے مروی نہیں ہے۔

و کتاب الکنیٰ ص ۳، دارقطنی جلد ۱

ص ۱۲۵ و ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۴۰

۱۔ عمر بن عامر۔ یہ مسلم کے روایات اور رجال میں تھے۔ امام ابن معین اور محدث عجلیٰ ان کو ثقہ کہتے ہیں

اور امام احمد ان کو ثقہ اور ثبت فی الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۴۶)

۲۔ علامہ ذہبی ان کو الامام، الحافظ اور احدا اعلام لکھتے ہیں۔ امام ابن معین اور نسائی ان کو ثقہ

کہتے ہیں۔ (مذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۶) امام دارقطنی (المتوفی ۳۸۵ھ) اور امام بیہقی نے اس پر یہ اعتراض

کیا ہے کہ عمر بن عامر اور سعید بن ابی عمرو کی سند میں سالم بن نوح واقع ہے۔ جو قوی نہیں ہے

اس لیے یہ روایت متابعت کے قابل نہیں ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶)

لیکن یہ اعتراض چنداں وزنی نہیں ہے۔ کیونکہ سالم بن نوح سے امام مسلم (مثلاً جلد ۱ ص ۲۳۶،

جواب۔ ان اکابر کا یہ عذر قابل سماعت نہیں ہے :

اولاً: اس لیے کہ سلیمانؑ تہی بلا اختلاف ثقہ اور ثبت، متقن اور حافظ تھے۔ (جیسا

کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں) اور تمام محدثین کا اس امر میں اتفاق ہے کہ ثقہ کی زیادت قابل قبول ہے۔ چند نقول ملاحظہ فرمائیں :

علامہ قسطلانی (المتوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ ثقات کی زیادت

مطلقاً قابل قبول ہے۔ (قسطلانی جلد ۱ ص ۵) علامہ حارمی (الشافعی المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے

ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت مقبول ہے۔ (کتاب الاعتبار ص ۲) امام ترمذی لکھتے ہیں کہ

ثقہ اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (کتاب العلل ۲ ص ۲۴) امام حاکم کا

بیان ہے کہ فقہائے اسلام کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ متون اور اسانید میں ثقات کی

زیادت مقبول ہوگی۔ (مسند رک جلد ۱ ص ۳) امام بیہقی لکھتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہ کا

بیان ہے کہ حافظ متقن اور مشہور راوی کی زیادت کا انکار ہرگز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی

زیادت بہر حال قابل قبول ہوگی۔ لیکن اگر کوئی ایسا راوی جو اس کے ہم پایہ نہ ہو اور متواتر حدیث

میں ایک جملہ زائد کرے تو وہ زیادت قابل قبول نہیں ہے۔ (محصلاً کتاب القراءۃ ص ۹۵) لیکن

سلیمان تہی تو دوسرے راویوں سے بڑے حافظ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ۲۹۹ ص ۳۵، ۳۵۶ ص ۱۸۷، ۲۲۴ ص ۲۹۵، ۲۳۴ ص ۳۹۶، ۳۹۸

وغیر میں) اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنے اپنے صحیح میں احتجاج کیا ہے۔ (جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۲) امام احمد

فرماتے ہیں کہ ما بعدیثہ بأس ان کی حدیث میں کوئی خرابی نہیں۔ ابو زرؓ ان کو لا بأس بہ اور صدوق

لکھتے ہیں۔ امام یحییٰ لکھتے ہیں ما بأس بذلك ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ابن عدی ان کی حدیثوں کو اقرب

الی الصواب لکھتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجی ان کو صدوق اور ثقہ لکھتے ہیں۔ ابن

ثناوی ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن قانع ان کو ثقہ لکھتے ہیں حافظ ابن حجر ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب

جلد ۳ ص ۴۳۳) فریق ثانی ان کا موازنہ فرما کر محمد بن اسحاق سے کر دیکھے جن کی روایت سے ان کا احتجاج

ہے : ع : وبضدھا تتباین الاشیاء

لہ امام دارقطنی نے تشہد کے باب میں وحدۃ اشرفیک لہ کی زیادت کو جس میں سلیمان تہی متغیر ہیں صحیح تسلیم

کیا ہے۔ دیکھو دارقطنی جلد ۱ ص ۱۳۴

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جہور محدثین اور علماء فقہ و اصول اس بات پر متفق

ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت اور فقر و مقبول ہے۔ (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۳۱) علامہ ماروینیؒ

لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (الجزء ہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۵) علامہ زلیعیؒ کا بیان ہے

کہ ثقہ متنقن اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (زیلعی جلد ۱ ص ۳۱۳) حافظ ابن

حجرؒ بھی اس کی تصریح کرتے ہیں۔ (شرح منجۃ الفکر ص ۳) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی

زیادت مقبول ہے۔ (توجیہ النظر ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی

جب تنہا کوئی زیادت نقل کرے تو وہ صحیح ہے اور اگر کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ اس

زیادت کو بیان کرتا ہو تو اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸)

نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وشک نیست کہ زیادت ثقہ مقبول است۔ (بدر الاہلہ ص ۵)

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۵)

مولانا گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اور زیادت ثقہ کی باتفاق جملہ محدثین قدیم و جدیدہ کہ جن میں خود

بخاری علیہ الرحمۃ بھی ہیں صحیح و معتبر ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (ہدایۃ المقتدی ص ۵)

ان تمام اقتباسات سے یہ بات یقیناً اور حتماً ثابت ہو جاتی ہے کہ سلیمان تیمیؒ (جو بلائیکر الامام، حافظ

ثقہ، ثبت اور شیخ الاسلام تھے) کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح اور معتبر ہے۔ اس

کا انکار کرنا فن حدیث کے طے شدہ اصول سے انحراف کرنا ہے جو یقیناً مردود ہے۔ امام بخاریؒ

فرماتے ہیں کہ

لہ یہ سب بحت روایتی حیثیت سے تھی اور روایتی لحاظ سے بھی یہ زیادت بالکل صحیح ہے مبارک پوری صاحبؒ

لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت اس وقت شاندار اور ناقابل قبول ہوتی ہے جب اصل روایت کے منافی ہو اگر

اصل اور ما قبل کے منافی نہ ہو تو جہور محققین کے نزدیک وہ زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (ابکار المنین ص ۴)

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ما قبل راہما جعل الوامام لیسوا

بہ کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ اس کے عین مطابق ہے کیونکہ انصت کرنا اور خاموش رہنا تمام اور

اقتدار کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کے وقت خاموشی اختیار نہیں کرتے وہ

درحقیقت مؤتم اور مقتدی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اس لیے کہ ان کی امام کے پیچھے قرأت کرنا سراسر

والزيادة مقبولة والمفسر يقضى على المبهم

اذا رواه اهل الثبت... اه (بخاری ج ۲۱)

امام خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ

قال الجمهور من الفقهاء واصحاب

الحديث زيادة الثقة مقبولة اذا انفرد

بها... اه (کفایۃ ص ۲۲۳)

زیادت مقبول ہے اور مفسر روایت مبہم پر

حاکم ہے جب کہ اہل ثبوت اس کو روایت کریں۔

جمهور فقہاء اور محدثین یہ فرماتے ہیں کہ ثقہ

راوی جب منفرد ہو تو اس کی زیادت قابل قبول ہے

اور مختلف اقوال و آراء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

ان اقوال میں سے جو قول ہم اختیار کرتے ہیں

وہ یہ ہے کہ زیادت جہاں بھی وارد ہو وہ بہ صورت

مقبول اور قابل عمل ہے جب کہ اس کا راوی عادل

حافظ اور متقن ضابطہ ہو۔

والذی نختار من هذه الاقوال ان

الزيادة الواردة مقبولة على كل الوجه

ومعمول بها اذا كان راويها عدلاً

حافظاً ومتقناً ضابطاً... اه (کفایۃ ص ۳۲۵)

اور نواب صاحب فرماتے ہیں کہ و نیز زیادت ثقہ مقبول است مطلقاً نزد جہاں ہر از

اہل حدیث و فقہ و اصول قالہ النووی... اه (هدایۃ السائل ص ۱۹۱) اور علامہ محدث حسین

بن محسن انصاری نے شاذ اور معطل پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جب ثقہ راوی

زیادت نقل کرے تو وہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے اس کو رد کرنے کا کیا معنی ہے (البیان المکمل

ص ۶، المنضم مع الدارقطنی) اور امام نووی لکھتے ہیں کہ

ومذهب الجمهور من الفقهاء والمحدثين

قبولها مطلقاً (تقریب النواوی مع تدریب

الراوی ص ۱۵۶)

اور علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ

اور ابن طاہر نے دعویٰ کیا ہے کہ اس قول پر

سبک اتفاق ہے۔

وقد ادعى ابن الطاهر اتفاق علماء

هذا القول... اه (تدریب الراوی ص ۱۵۶)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اقدار کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۳)

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۸ میں ایک راوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقف ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا ثقف کوئی مضر نہیں ہوگا۔۔۔ اھ

حافظ ابن حجر ایک مقام پر لکھتے ہیں :

وعلى تقدير تضرد الزه و زاعى بذكرها

لا يستلزم ذلك تخطئته لانه انما تكون

زيادة من ثقة حافظ غير منافية

لرواية رفقة فتقبل ولا تكون شاذة

وله معنى لرد الروايات الصحيحة بهذه

التعليقات الواهية - (فتح الباری جلد ۱،

ص ۲۴۷ طبع مصر۔)

اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس زیادت کے ذکر کرنے میں اوزاعی متفرد ہے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ان کی خطا ہے کیونکہ یہ ثقف اور حافظ کی زیادت ہے اور یہ اس کے باقی رفیق کی روایت کے منافی نہیں ہے سو یہ قابل قبول ہے اور شاذ نہیں ہے اور صحیح روایات کو ان رکیک بہانوں سے (کہ یہ شافعیوں) ٹھکرانے کا کوئی معنی نہیں ہے۔

اور قاضی شوکانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۱۶۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

اور شاذ کہہ کر روایت کو مطول قرار دینے کی طرف

وله يلتفت الى تعليل الحديث به اذا كانت

کوئی توجہ نہیں کی جاسکتی جب کہ رافع ثقہ ہے۔

الرافع ثقلة - (نیل جلد ۱ ص ۲۰۲)

حضرات محدثین کرام، فقہار عظام اور ارباب اصول کا یہ اتفاقی اجماعی اور طے شدہ قاعدہ

ہے کہ جب راوی ثقہ اور حافظ ہو اور وہ زیادت نقل کرے تو مطلقاً اس کی روایت مقبول ہے

اور بھلا اللہ تعالیٰ سلیمان تیمی ثقہ اور حافظ ہیں لہذا ان کی زیادت و اذ اقرأ فانصتوا بہر حال مقبول

ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا (ص ۳۱۵، ص ۳۱۶ میں) اور اسی طرح قاضی

قاضی مقبول احمد صاحب کا (ملاحظہ ہو الاعتصام ص ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

امام بیہقی کی تقلید میں اس کو شاذ کہنا بالکل غلط اور قطعاً باطل ہے اور تمام اصول کے خلاف ہے۔

جس کی حیثیت ایک پرکاش کی بھی نہیں ہے اور اصول حدیث کے پیش نظر اس کو کوئی سننے کے لیے

تیار نہیں ہے۔ اپنے جی کو خوش کرنے یا اپنے حواریوں کا غم ہلکا کرنے کے لیے وہ بڑے شوق سے

اس کو شاذ کہتے پھریں۔

وثانیاً۔ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمی متفرد نہیں، بلکہ صحیح ابو عوانہ کی روایت

میں ابو عبیدہؓ بھی اس زیادت کو نقل میں سلیمانؓ کی کے ساتھ ہیں اور ابو عوانہؓ کی سند کا صحیح ہونا خود مبارک پوری صاحبؓ کو بھی مسلم ہے۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ نیز عمر بن عامر اور سعید بن ابی عمروؓ بھی اس زیادت کو بیان کرتے ہیں اور دونوں ثقہ ہیں اور ان کی سند عالی شرط مسلم صحیح ہے کما م۔ الغرض فریق ثانی کا یہ اعتراض سراسر باطل ہے اور یہ اس حدیث کی صحت پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

وما اعله البخاری فلیس بقادح فی صحیحہ امام بخاری (وغیرہ) نے اس حدیث کو معلول ٹھہرانے کی جو کوشش کی ہے تو اس سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

الحاصل سلیمانؓ کی یہ روایت بلا شک و شبہ بالکل صحیح ہے اور اس میں ان کی غلطی بتلانان پر بہتان باندھنا ہے۔ امام احمدؒ سے کسی نے سوال کیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سلیمانؓ نے خطا کی ہے تو امام احمدؒ نے جواب دیا: جس شخص نے سلیمانؓ کی طرف خطا کی نسبت کی ہے وہ ان پر بہتان باندھتا ہے (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۵) اس روایت میں اصل قصور اور خطا ان روایت کی ہے جنہوں نے یہ صحیح زیادت تک کر دی ہے۔ فساھم اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔ مؤلف خیر الکلام نے اپنے پیشرو حضرات کے نقش قدم پر چل کر و اذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دھینگا دھینگا غیر مقبول اور شاذ بنانے کی کوشش ناکام کی ہے۔ اور شاذ کی تعریف پر مطلقاً غور نہیں کیا اور غور کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ پھر تو قلعی کھل جاتی تھی اگرچہ انہوں نے ص ۴۱۸ میں شرح شعبہ اور مقتدا بن الصلاح وغیرہ سے شاذ کی تعریف نقل کی ہے لیکن لفظ مخالف فیہ الناس پر غور نہیں کیا شاذ کی تعریف سے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ

شاذ وہ حدیث نہیں ہے جس کو ثقہ روایت

کرے اور دوسرے روایت نہ کرتے ہوں بلکہ

شاذ وہ روایت ہے جس کو ثقہ روایت کرتا ہو

مگر اس میں دوسرے لوگوں کی مخالفت کرے

قال الشافعی لیس الشاذ من

الحدیث ان یروی الثقة ما لا یرویہ

غیرہ هذا لیس بشاذ وانما الشاذ

ان یروی الفتحد یا مخالف فیہ الناس

یہ ہے سزا۔

هذا الشاذ من الحديث

(معرفة علوم الحديث ص ۱۱۹)

امام مسلم فرماتے ہیں کہ

وعلا مة المنكر في حديث المحدث

اذا ما عرضت رواية للحديث على رواية

غيره من اهل الحفظ والرعي مخالفت روايته

روايتهم اولم تكذ توافقها فاذا كان

ازه غلب من حديثه كذ لك كان مهجور

الحديث غير مقبوله ولا مستعمله۔

... اھ (مسلم جلد ۱ ص ۵)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

لان الزيادة امان تكون لا تنافي

بينها وبين رواية من لم يذکرها

فهذه تقبل مطلقاً لانها في حكم التحدث

المستقل الذي يتفرد به الثقة ولا يرويه

عن شيخه غيره واما ان تكون منافية

بحديث يلزم من قبولها رد الرواية

الآخرى فهذه هي التي يقع الترجيح

بينها وبين معارضتها فيقبل الراجح

ويرد المرجوح ... اھ

(شرح نخبة الفكر ص ۳۷)

اور محدث کی قابل انکار حدیث کی علامت

یہ ہے کہ جب اس کی روایت دوسرے اہل حفظ

اور پسندیدہ راویوں کی روایت پر پیش کی جائے تو

اس کی روایت ان کی روایت کے مخالف ہو یا ممکن

ہی نہیں کہ اس کے موافق ہو پس جب اس کی حدیث

پر اعلیٰ یہ ہو تو اس کی حدیث متروک اور غیر مقبول

ہوگی اور قابل عمل نہ ہوگی۔

کیونکہ زیادت یا تو ایسی ہوگی کہ اس میں اور

دوسرے راویوں کی روایت میں جنھوں نے اس کو

ذکر نہیں کیا منافاة نہ ہوگی تو ایسی زیادت مطلقاً

مقبول ہے کیونکہ یہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے

جس کے بیان میں ثقہ راوی متفرد ہو اور اس کے

شیخ سے اور کوئی روایت نہ کرتا ہو اور یا وہ زیاد

ایسی ہوگی کہ وہ دوسرے راویوں کی روایت

کے منافی ہوگی اس حیثیت سے کہ اس کے قبول

کرنے سے دوسری روایت کا رد لازم آتا ہو تو

اس میں اور اس کی معارض میں ترجیح کا سوال ہوگا

راجح کو قبول کیا جائے گا اور مرجوح کو رد کیا جائے گا۔

اور تدریب الراوی میں ہے۔

پھر حضرات محدثین شذوذ کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ثقہ راوی ثقہ تر راوی کی مخالفت کرے اور متقدمین ائمہ حدیث مثلاً ابن ہمدان، یحییٰ القطان، احمد بن معین، ابن المدینی، بخاری، ابو زرعة، ابو حاتم، نسائی اور دارقطنی وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ اعتبار ترجیح کا اس منافی زیادت سے متعلق ہے جس کا قبول کہ لینا دوسری روایت کے رد کو مستلزم ہو۔

ثم يفسرون الشذوذ بمنخالفة الثقة من هو وثق منه والمنقول عن ائمة الحديث المتقدمين كابن مهدي ويحيى القطان واحمد وابن معين وابن المديني والبخاري وابي زرعة وابي حاتم والنسائي والدارقطني وغيرهم اعتبار الترجيح فيما يتعلق بالزيادة المنافية بحيث يلزم من قولها رد الرواية الاخرى... اه (تدريب الراوي ص ۱۵۷)

اور ترجیح النظر میں ہے۔

وزيادة راوی الصحيح والحسن تقبل مطلقاً ان لم تكن منافية لرواية من لم يذكرها لونها حيثئذ كالحدیث المستقل الذي ينفرد به الثقة ولو يرويه عن شيخهم غيره فان كانت منافية لها بحيث يلزم من قولها رد الرواية الاخرى بحيث عن الراجح منها فان كان الراجح منها رواية من لعينه كذلك الزيادة لمزيد ضبطه او كثرة عدله او غير ذلك من موجبات الرجحان ردت تلك الزيادة وان كان الراجح

صحيح اور حسن کے راوی کی زیادت مطلقاً مقبول ہے اگر وہ ان راویوں کی روایت کے مخالف نہ ہو جنہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس وقت مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کو ثقہ راوی انفرادی طور پر بیان کرتا ہے اور اس کے شیخ سے کوئی اور اس کا راوی نہیں ہے۔ پس اگر وہ زیادت دوسری روایت کے جس میں زیادت نہیں ہے بایں طور منافی ہو کہ اس زیادت کے قبول کر لینے سے اس روایت کا رد لازم آتا ہو تو یہاں راجح و مرجوح کی بحث چلے گی۔ اگر راجح ان راویوں کی روایت ہے جنہوں نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ مزید ضبط

منہاروایتہ من ذکر تلك الزیادۃ
قبلت اھ

یا کثرتہ عدویا ترجیح کے اور اسباب میں سے
کوئی سبب ہو تو اس زیادت کو رد کر دیا جاتا
اور اگر راجح اس کی روایت ہے جس نے اس
کو ذکر کیا ہے تو زیادت قبول کر لی جائے گی۔

(توجیہ النظر ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

ان تمام اقتباسات سے روز روشن کی طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ مشاذا وغیر
مقبول روایت میں حضرات محدثین کرام کے نزدیک ایک بنیادی شرط ہے وہ یہ کہ
اس کی روایت باقی ثقات کی روایت کے مخالف اور منافی ہو اور مخالفت اور منافات
بھی یوں طور کہ اس کے تسلیم کر لینے سے ان باقی ثقات کی روایت (جس کو وہ اپنے شیخ
سے صحیح اور متصل سند کیساتھ روایت کرتے ہیں اور ان میں وجوہ ترجیح بھی موجود ہیں جن کو نظر انداز نہیں
کیا جاسکتا۔) کا رد لازم آتا ہو اور اس زیادت کی اصل حدیث کے ساتھ موافقت
کی مطلقاً کوئی راہ نہ پیدا ہوتی ہو (اولہو تکد توأخفا) لیکن یہاں واذقرأ فانصتوا کی
زیادت کا معاملہ ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل روایت سے قطعاً کوئی مخالفت
اور منافات نہیں ہے بلکہ یہ تو حدیث کے اول حصہ کی مؤید ہے جیسا کہ ہم نے شیخ الاسلام
ابن تیمیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کا کوئی جواب مؤلف خیر الکلام نے نہیں دیا بلکہ حواریوں
کو مغالطہ دینے کے لیے یہ لکھ مارا ہے کہ قبول کرنے والوں نے شذوذ کا کوئی جواب نہیں دیا
(ص ۲۲۲) ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ واذقرأ فانصتوا کی زیادت انما جعل الوامر
لیؤتوبہ کی عین مؤید ہے۔ اس کے منافی اور مخالف ہرگز نہیں اس لیے یہ کسی صورت
میں مشاذا وغیر مقبول نہیں ہے۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جو لوگ اس زیادتی کو بقیہ
حدیث کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کی تقریر یہ ہے کہ شروع حدیث میں یہ جملہ ہے انما
جعل الوامر لیؤتوبہ کہ امام کی پیروی کرو اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں یہ لفظ بھی
ہے فلا تختلفوا علیہ سنن کبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۴ اس کے ساتھ مخالفت نہ کر یعنی جس طرح
امام کرے اسی طرح کرو اس جملہ کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے پڑھے (محصلاً
ص ۲۳۱) تو یہ سب ان کی غفلت کا نتیجہ ہے :

اولاً۔ اس لیے کہ حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت میں انما جعل الامام ليعوثم بهہ کا حصہ عمر بن عامر اور سعید بن ابی عدوہ کے طریق سے آتا ہے اور مؤلف خیر الکلام تو ص ۳۱ میں ان کی حدیث کو شافکتے ہیں۔ پھر بقول ان کے اس شاذ پر بنیاد رکھنا کیونکر صحیح ہے؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی سالم بن نوح ہے جو مؤلف خیر الکلام کے نزدیک ضعیف ہے۔

وثانیاً۔ فلا تختلفوا علیہ کا جملہ محمد بن حجلان کی روایت میں ہے اور وہ ان کے نزدیک وہی ہیں پھر اس کا کیا اعتبار؟

وثالثاً۔ اگر امام کی مخالفت کا یہی معنی ہے تو مقتدی نہ صرف یہ کہ سورۃ فاتحہ ہی پڑھیں بلکہ مازاد بھی پڑھیں اور جہر کے ساتھ پڑھیں اور ہر ایک امام کی طرح مصلیٰ پر کھڑا ہو۔ کیونکہ جو امام کرتا ہے سو مقتدی بھی کریں فلا تختلفوا علیہ پر پورا عمل ہونا چاہیے۔ الغرض ان رکیقے جہت سے اس صحیح زیادت کا انکار اور اس کو شافکتہ سراسر باطل ہے۔

تیسرا اعتراض

مبارک پوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں قتادہ مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے اور مدلس کی معنی روایت قابل التفات نہیں ہوتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۱ و ۱۰۱ بکار المنہ ص ۵۸ وغیرہ)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے:

اولاً۔ اس لیے کہ یہ روایت مسلم کی ہے اور بخاری و مسلم کی ثقہ ذات سے مروی جملہ روایات کے صحیح ہونے پر اُمت کا اجماع و اتفاق ہے۔ اگر صحیحین کی معنی حدیثیں صحیح نہیں تو اُمت کا اتفاق اور اجماع کس چیز پر واقع ہوا ہے جبکہ راوی بسبب ثقہ ہیں۔ وثانیاً۔ یہ روایت ابو عوانہ کی ہے اور باقر مبارک پوری صاحب انہوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ لہذا قتادہ کی اس سند کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔

وثالثاً۔ محدثین کا اتفاق ہے کہ مدلس راوی کی تدلیس صحیحین میں کسی طرح بھی مضر نہیں ہے لہ صحیحین کی تدلیس کے مضر نہ ہونے کا یہ قاعدہ امام نووی و قسطلانی کے علاوہ علامہ بخاری (المتوفی ۹۰۲ھ) صحیحین کی تدلیس کے مضر نہ ہونے کا یہ قاعدہ امام نووی و قسطلانی کے علاوہ علامہ بخاری (المتوفی ۹۰۲ھ) (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر ۲)

چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں کہ

وما فی الصحیحین من التالیس فمحمول

صحیح بخاری و مسلم میں جو تالیس واقع ہو تو وہ دوسرے

علی السماع من جملۃ اُخری۔

دلائل سے سماعت پر محمول ہے۔

(مقدمہ ص ۱۸ و شرح مسلم جلد اٹھواں)

یعنی اگر صحیحین میں کوئی حدیث راوی عنعنہ سے روایت کرتا ہے تو محدثین کرام کے نزدیک

وہ ایسی ہے جیسے اس راوی نے حدیثنا اور اخبارنا وغیرہ سے تحدیث کی ہو اور علامہ قسطلانیؒ

لکھتے ہیں کہ امام اعمش، قتادہ اور سفیان ثوری وغیرہ سے بخاری و مسلم میں جو روایتیں عنعنہ سے مروی

ہیں وہ سماع پر محمول ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان کی تحدیث پر اطلاع نہ ہو سکے۔ کیونکہ امام بخاری و مسلم سے

متعلق ہم یہی اچھا اور نیک گمان قائم کر سکتے ہیں۔ (قسطلانی جلد ۱ ص ۹) امام بسکیؒ نے علامہ

مزنیؒ سے سوال کیا کہ امام بخاری اور امام مسلم نے جو روایتیں عنعنہ کے ساتھ نقل کی ہیں کیا ان میں

صراحت کے ساتھ تحدیث بھی ثابت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اکثر روایات میں اس کا

ثبوت موجود نہیں ہے مگر ہمیں تحسین ظن کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ (تدریب الراوی ص ۵۹)

مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۲۰ میں یہ لکھ کر اپنا دل خوش کر لیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث

میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوتی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا۔ الخ مؤلف مذکور کو معلوم ہونا

چاہیے کہ قاعدہ مذکورہ بخاری اور مسلم کی تمام حدیثوں کے متعلق ہے صحیحین کی کوئی حدیث اس قاعدہ

سے مستثنیٰ نہیں اور ایسی کوئی تنقید ان پر نہیں ہو سکتی جس سے انکی حدیثیں روایت ضعیف ہو سکے

لہذا صحیحین کے روایات کی تالیس کی طرف لے کر صحیح حدیث کا انکار کرنا قانون روایت اور فن حدیث کے

بالکل خلاف ہے جو بہر صورت مردود ہے ہاں اگر کوئی راوی ضعیف ہوتا تو معاملہ جدا ہوتا۔

و رابعاً۔ قتادہ کا شمار طبقہ اولیٰ کے ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تالیس کسی کتاب میں مضر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) نے فتح المغیث ص ۷۷ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی ص ۱۴۴ میں اور

محدث عبدالقادر القرشی (المتوفی ۷۷۵ھ) نے الجواہر المضمیہ جلد ۲ ص ۴۲۹ میں اور نواب صاحبؒ نے

ہدایۃ السائل ص ۱۹۱ میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نہیں ہے۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ مدلسین کا ایک گروہ وہ ہے جو اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر یا اپنے سے کچھ کم ثقہ راویوں سے روایت کرتا ہے، مگر وہ اس زمرہ سے خارج نہیں جس کی روایتیں قابل قبول ہوتی ہیں سو ایسے مدلسین میں ابوسفیانؒ طلحہ بن نافعؒ اور قتادہ بن دعائمہؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۰۳) علامہ جزائریؒ علامہ ابن حزمؒ سے محدثین کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے ان مدلسین کی فہرست بتاتے ہیں جن کی روایتیں باوجود تدلیس کے صحیح ہیں اور ان کی تدلیس سے صحت حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

منہم کان جلة اصحاب الحدیث وائمة
المسلمین کالحسن البصری وابی اسحاق السبئی
وقتادہ بن دعامة وعمر بن دینار وسلمین
الاعمش وابی الزبیر وسفیان الثوری
وسفیان بن عیینة۔ (توجیہ النظر ص ۲۵۱)

ان مدلسین میں جلیل القدر محدث اور مسلمانوں کے امام شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ، ابواسحاق السبئیؒ قتادہ بن دعائمہؒ، عمرو بن دینارؒ، سلیمان اعمشؒ، ابوالزبیر سفیان ثوریؒ اور سفیان عیینہؒ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ پہلے تو صحیحین میں کسی راوی کی تدلیس مضر نہیں۔ قتادہ کی ہوں یا کسی اور راوی کی اور پھر قتادہ کا شمار محدثین کے نزدیک ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی محل اور کسی موقع پر مضر نہیں ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام دارقطنیؒ نے جو یہ کہا ہے کہ قتادہ رحمہ اللہ مدلس ہیں۔ لہذا یہ روایت متصل نہیں مردود ہے اس لیے کہ ولا یشک عندنا ان مسلماً رحمہ اللہ تعالیٰ یعلم ہذہ القاعدة و یعلم تدلیس قتادہ فلوا ثبوت سماعہ عندہ لم یحتج بہ الی ان قال و نسبة الی امثل قتادہ الذی محلہ من العدالة والحفظ والعلم والغایة العالیة (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۰۹) اور ہمارے نزدیک اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ امام مسلم رحمہ اللہ یہ قاعدہ جانتے ہیں کہ مدلس کا عفتہ قبول نہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قتادہ رحمہ اللہ مدلس ہیں۔ اگر امام مسلم کے نزدیک قتادہ کا سماع ثابت نہ ہو تو وہ اس سے احتجاج نہ کرتے۔ (پھر آگے فرمایا) اور امام دارقطنیؒ نے قتادہ جیسی شخصیت کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جن کا مقام عدالت اور حفظ اور علم اور کمال کے انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا ہے۔ یہ حضرات محدثین کرامؒ کا طے شدہ ضابطہ ہے۔ علامہ ابن حزمؒ کی ظاہریت نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے اور امام حاکمؒ نے بھی

در علم کی سب روایتیں صحیح نہیں کیونکہ انکی بعض روایتوں پر تنقید ہو چکی ہے تو پھر پوز صاحب اور زودی صاحب کا کیا قصور ہے؟ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں حنجاری و مسلم کی سب روایتیں صحیح نہیں ہیں اور یہی فریق ثانی کے شیخ الحدیث صاحب کہہ رہے ہیں مگر کسی غیر مقلد کو اس پر ادبلا مچانے کی توفیق نہیں ہوتی؟ آخر کیوں؟ اگر انکی رائے کے مطابق کوئی اور بھی صحیحین کی بعض روایتوں پر تنقید کرے تو انکو صحیحین مجبین نہیں ہونا چاہیے۔ بلا شک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبقات

المدلسین میں قتادہ رو کو تیسرے طبقہ کا مدلس کہا ہے مگر آخر میں اس سے رجوع کر لیا ہے۔

چنانچہ قاضی شوکانی حافظ ابن حجر عسقلانی رو کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ونقل عنه انه قال لست راضياً عن شيء

من تصانیفی لانه عملتها فی ابتداء الامر

ثم لم يتبين لي من غير ما معي سوى شرح

البخاری ومقدمته والمشتبه والتهديب

ولسان الميزان ودوي عنه في موضع

آخر انه اثنى على شرح البخاری والتعليق

والنعبة... اه (البدرا الطالع من طبع اول

ص ۳۲۸)

اس سے معلوم ہوا کہ حافظ موصوف بغیر ان چند کتابوں کے جن میں فتح الباری بھی ہے اپنی اور کسی

تصنیف پر نہ راضی ہیں اور نہ اعتماد کرتے ہیں کیونکہ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ کتابیں لکھی ہیں جن

میں علم و عقل خام ہوتے ہیں اور قابل اعتماد و رفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہو سکا۔ تاکہ اس کی اصلاح

شامل ہو جاتی اور ان کی ابتدائی کتابوں میں طبقات المدلسین بھی ہے۔ بخلاف اس کے فتح الباری

اور دیگر چند کتابوں پر جن کے نام اوپر بیان ہو چکے ہیں وہ بڑے راضی ہیں اور فتح الباری

(مثلاً جلد ۲ ص ۲۰۲ وغیرہ) میں قتادہ کی معنعن روایت کو صحیح کہہ رہے ہیں۔ لہذا انھوں نے

اپنے سابق نظریہ سے رجوع کر لیا ہے۔ اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۰۶ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں

کہ اس کی سند میں قتادہ ہے جو تیسرے طبقہ کے مدلسین سے ہے اور یہاں عن کے ساتھ روا

کرتا ہے مگر بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے... الخ مؤلف مذکور نے اس روایت

لکھتے ہیں کہ

وَكذَاقال وحدث و ذكر و شبهه فكله
اور اسی طرح لفظ قال اور حدث اور ذکر اور
محمول علی الہ اتصال و السماع -
ان کی مانند اور الفاظ اتصال اور سماع پر محمول

(شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱)

ہیں۔

لہذا اصول حدیث کے رو سے قنادہ کی یہ روایت متصل اور صحیح ہے باقی خواتمے بدرا
بہانہ پاتے بسیار مؤرخ اسلام علامہ عبدالرحمن بن خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ) بخاری اور مسلم کی
صحت اور مزینت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ومن اجل هذا قيل في الصحيحين
اور اسی واسطے کہا گیا کہ بخاری اور مسلم کی روایات
بالاجماع علی قبولهما من جهة الاجماع
کے قبول کرنے پر اجماع ہے اس لیے کہ جو صحت
علی صحة ما فيهما من الشرط المتفق
کی متفق علیہا شرطیں ان میں موجود ہیں ان پر اجماع ہو
عليها فانه تاخذك ريبه في ذلك فالقوم
چکا ہے لہذا اس بارے میں ذرہ بھر شک نہ کریں کہ
احق الناس بالظن الجميل بهم -
وہ حضرات تمام لوگوں میں ظنِ جمیل کے زیادہ مستحق ہیں

اور صحیح مسلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ثم جاء الامام مسلم بن الحجاج القشيري
پھر امام مسلم بن الحجاج القشیریؒ آئے اور انھوں نے
رحمه الله تعالى فالف مسنده الصحيح
اپنا مسند صحیح تالیف کیا جس میں وہ امام بخاریؒ کے
حذافيه حذ والبخاري في نقل المجمع
نقش قدم پر چلتے رہے اور مجمع علیہا روایتیں نقل
عليه... ۵۱ (مقدمة: ص ۴۴۵)

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

ولكن الشيطان لا يذكر ان الوجود قد تناخلا
اور لیکن امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ صرف وہی حدیث
فيه مشائخهما واجمعوا علی القول به
ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنے اساتذہ سے
والتصحيح له (رحمة الله البالغة) ^{جلد ۱}
بحث و مناظرہ کیا ہوتا ہے اور جس کے بیان کرنے اور
تصحیح پر ان سب کا اجماع ہو چکا ہے

اور علامہ حسین بن محمدؒ لکھتے ہیں کہ

وقد حصل الاتفاق على الحكم بصحة ما في الصحيحين غير المستثنى... ۵۱ اور مسلم میں تمام روایتیں بغیر استثناء کے صحیح ہیں۔

(البيان المكمل ص ۲)

حضرات محدثین کرام کا یہ فیصلہ ہے لیکن غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث صاحب بخاری اور مسلم کی صحیح زیارات کو بھی دودی صاحب اور پرویز صاحب کی طرح تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔
فوا اسفہا۔۔۔ ترجمان الحدیث ماہ نومبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۳ میں جو بات ہمارے حق میں لکھی ہے وہ خود ان حضرات پر سو فیصد فٹ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

”ہم ناظرین کرام سے ایمان اور دیانت داری کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ اگر محدثین اور رواۃ حدیث کے متعلق یہ رائے صحیح ہے جس کا اظہار یہ حضرات کر رہے ہیں تو ازراہ انصاف بتلایا جائے کہ کیا محدثین کی امانت و دیانت محفوظ رہی؟ منکرین حدیث نے آخر کو نسا تیر مارا جس کے زخموں سے ہم پریشان ہیں؟“

چوتھا اعتراض۔ مبارکپوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ واذا قرأنا نصتوا کی زیادات کو امام بخاری، ابو داؤد، ابو حاتم، ابن معین، حاکم، دارقطنی، ابن خزیمہ، ذہبی، ابو علی نیشاپوری اور امام بیہقی وغیرہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے یہ زیادات صحیح نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۳ ص ۸۳) جواب۔ ان حضرات کا اس زیادت کو صحیح نہ تسلیم نہ کرنا اس بات پر مبنی تھا کہ اس زیادت کے بیان کرنے میں سلیمان بنی متفرد ہیں، نیز قنادہ کی طرح وہ مدلس بھی ہیں اور ان باتوں کے تسلی بخش اور مسکت جوابات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لہذا اس زیادت کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مبارک پوری صاحب اور ان کے اتباع مردم شماری کے لحاظ سے حق و باطل، صحیح و غلط میں تمیز قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو وہ بھی سن لیں:

حضرت ابو موسیٰ الأشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں واذا قرأنا نصتوا کی زیادت

کو صحیح سمجھنے والے یہ حضرات ہیں:

۱۔ امام احمد بن حنبل (مسند احمد ص ۳۸۶، تعلیق الحسن جلد ۲ ص ۸۶، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۶)

۲۔ امام مسلم (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷، درایہ ص ۹)

۱۳- امام ابن خزیمہ (برهان العجائب ص ۱۰۲،
نقحۃ العنبر ص ۴۹۔

۱۵- امام ابو عمر بن عبد البر (نقحۃ العنبر ص ۴۹)

۱۶- شیخ الاسلام ابن تیمیہ (فتاویٰ جلد ۳۱۲)
وتنوع العبادات ص ۸۶)

۱۷- امام ابو عوانہ (کیونکہ باقر ارباب کپوری صاحب
انہوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا
ہے اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی روایت
متعدد اسانید سے انہوں نے صحیح میں
درج کی ہے۔

۱۸- نواب صدیق حسن خاں صاحب

(عون الباری جلد ۱ ص ۳۲۳)

۱۹- علامہ مارونی (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶)

۲۰- علامہ عینی (عمدة القاری جلد ۳

ص ۵۶)

۲۱- امام ابن معین (۱۷)

۳- امام نسائی (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۴- امام ابن جریر (تفسیر جلد ۹ ص ۱۱)

۵- علامہ ابن حزم (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۶- امام منذری (عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵)

تعلیق المنقح جلد ۱ ص ۱۷۲، تحقیق الکلام

ص ۸۳، نقحۃ العنبر ص ۴۹)

۷- حافظ ابن کثیر (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰)

۸- امام اسحاق بن راہویہ (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶)

تنوع العبادات ص ۸۶)

۹- امام ابو بکر بن اثریم (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۱۰- حافظ ابن حجر (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰)

۱۱- امام ابو زرعة رازمی (مقدمہ فتح الباری ص ۲۲۵)

قسطلانی و تدریب الراوی ص ۳۳، مقدمہ مسلم

ص ۱۳ وازالہ ستر ص ۵۲)

۱۲- امام موفق الدین ابن قدامہ (معنی جلد ۱ ص ۶۰)

۱۳- امام شمس الدین ابن قدامہ (شرح مقنع للکبیر

جلد ۲ ص ۱۳)

۱۷- امام مسلم سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کی سند

کیوں بیان نہیں کی جب کہ وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو امام موصوف نے جواب ارشاد فرمایا کہ

لیس کل شیء عندی صحیح و ضعتہ

ہا ہنا انما وضعت ہا ہنا ما اجمعوا

علیہ۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۴۲)

واقع ہوا ہے۔

(بقیہ ماشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

۲۲- امام عثمانؓ بن ابی شیبہؓ

۲۴- امام علیؓ بن المدینیؓ

۲۳- امام سعید بن منصورؒ خراسانیؒ

۲۵- امام ابن صلاحؒ وغیرہ وغیرہ محدثینؒ و

فقہاءؒ اس حدیث کی تصحیح کرتے ہیں۔ جب سو فیصدی حنفی و مالکی اور حنبلی اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں اور جب شوائع اور غیر مقلدین حضرات کا ذمہ دار منصف مزاج اور معتد بہ گروہ و اذقانہ فاضلین کی زیادت کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہے؟ اور یہ بھی طے شدہ قاعدہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ تو پھر نہ معلوم اس زیادت کی صحت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر محض مردم شماری سے مبارک پوری صاحبؒ میدان جیتنا چاہتے ہیں تو اس میں بھی ان کی شکست یقینی ہے۔ رہا مبارک پوری صاحبؒ کا امام ابن خزمیہؒ کو اس زیادت کی صحت کے منکرین میں شمار کرنا تو یہ باطل ہے۔ کیونکہ بریلان العجائب کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام

(بقیہ حاشیہ بچھلا صفحہ) حافظ ابن صلاحؒ نے مقدمہ صفحہ ۸ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی صفحہ ۴۴ میں اور علامہ جزائریؒ نے توجیہ النظر ص ۲۴۰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ امام مسلمؒ کی مراد ما اجمعا علیہ کے جملہ سے یہ محدث ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام یحییٰ بن معینؒ، امام عثمان بن ابی شیبہؓ، امام سعید بن منصورؒ خراسانی اور حافظ ابن حجرؒ ان میں امام علی بن المدینیؒ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۳۳) اور امام ابن صلاحؒ فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم اپنے صحیح میں صحیح سمجھتے ہیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر میں یقینی ہے۔ (غایتہ المأمول جلد ۱ ص ۴) اس کاٹے سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ الاشعریؒ کی اس زیادت والی روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

۱۰ اثبات کوفی پر مقدم ہونا محدثین کا طے شدہ مسئلہ ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اثبات کوفی پر ترجیح ہوتی ہے۔

(شرح مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۰)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ المثلث اولیٰ من النافی۔ (شرح نختہ الفکر ص ۹) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں

کہ المثلث اولیٰ من النافی (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۱) امیر میانی لکھتے ہیں: والاثبات مقدم (سبل السلام

جلد ۱ ص ۲۲۲) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اثبات مقدم است بر نفی (بدور الابد ص ۳۷۹) مبارک پوری

صاحبؒ لکھتے ہیں کہ من اثبت مقدم علیٰ من نفی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱۶۱) مؤلف خیر الکلام کا یہ

کہنا کہ یہاں جرح ہی اثبات ہے۔ تصحیح اثبات نہیں ہے کیونکہ تصحیح ظاہر سند کے اعتبار سے ہے۔ اور (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

موصوف اس زیادت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح امام ابن معینؒ کو بھی منکرینِ صحت میں شمار کرنا غلط ہے۔ کیونکہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ مسلم کی تمام مسند روایتوں کو صحیح سمجھتے تھے جن میں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادتی والی روایت بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں امام ابن معینؒ اور امام ابو حاتم نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر کلام نہیں کیا بلکہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت پر کلام کیا ہے، جس کا ذکر عنقریب ہوگا۔ (دیکھیے کتاب العطل ابن ابی حاتم جلد ۱ ص ۱۶۳ و سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۵۶ و بغیۃ الالمی جلد ۲ ص ۱۶) اس لیے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت کے انکار کرنے والوں میں ان کا شمار کرنا جہالت اور غفلت پر مبنی ہے۔

و دونوں کی دنیا میں بھی دیکھ لیجیے کہ اس زیادت کے صحیح تسلیم کرنے والے زیادہ ہیں یا اس کے غلط قرار دینے والے: ع — چلی تھی بر بھی کسی پر کسی کے آن لگی

پانچواں اعتراض

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اور حافظ ابو علیؒ کہتے ہیں کہ حضرت قتادہ کے جملہ تلامذہ میں سے سلیمان تیمیؒ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو نقل کرنے میں متفرد ہیں اور ائمہ حفاظ کی تضعیف (بقید حاشیہ پچھلا صفحہ) تضعیف شدہ پر مطلع ہونے کی بنا پر اس جرح ہی اثبات ہے۔ (ص ۴۲۶) محض جی ہلانے کا ایک بہانہ ہے، ایک نئے بہانہ ہے، اس شعبہ بازی سے اثبات کو نفی اور نفی کو اثبات بنا دینا کون تسلیم کرتا ہے؟ تصحیح صرف ظاہر سند کے لحاظ نہیں بلکہ ثبوت اصول کے اعتبار سے ہے اور جرح کا مفہوم یہاں یہ ہے کہ روایت صحیح نہیں اور نفی کیا ہوتی ہے؟

امام برہان العجاوب مولانا محمد شبیر سہسوانیؒ (المتوفی ۱۳۲۶ھ) غیر مقلد کی تالیف ہے۔

امام مسلم کی ایک عبارت ملاحظہ کیجیے جس سے امام بیہقیؒ نے اصل مضمون کا حلیہ بگاڑ دیا ہے:

وفی حدیث جریر عن سلیمان التیمی عن	جریر بن سلیمان تیمیؒ کے طریق سے قتادہ سے روایت کرتے
قتادہ من الزیادۃ واذا قرأ فانصتوا ولیس	ہیں اور اس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بھی
فی حدیث احد منهم فان اللہ عزوجل	موجود ہے اور کسی کی روایت میں یہ مضمون نہیں ہے
	(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح پر مقدم ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قال علی لسان نبیہ
کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان پر سَمِعَ اللہُ لَمَنْ
حَمِدَهُ كَمَا حَكَمَ رِيَاءُ مَكْرِيهٍ مَضْمُونٍ صَرَفَ ابُو كَامِلٍ كِي
صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سَمِعَ اللہُ لَمَنْ حَمِدَهُ
الذی روایۃ ابی کامل و حدیث عن ابی عوانۃ
روایت میں ہے جس کو وہ ابو عوانہ سے روایت کرتے
(مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴) ہیں۔

اس عبارت کو آپ اچھی طرح دیکھ لیں اور پھر امام بیہقی رحمہ اللہ کے اس ادعا کی داد دیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ
واذا قرأ فانصتوا لیس فی حدیث احد منهم (کتاب القراءة ص ۸۷) واذا قرأ فانصتوا کی زیادت
ان میں سے کسی کی روایت میں نہیں ہے۔ امام مسلم کے قول و لیس فی حدیث احد منهم کا تعلق قبل
واذا قرأ فانصتوا سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ما بعد فان اللہ قال علی لسان نبیہ کے ساتھ ہے۔ اور
یہ مضمون صرف ابو کامل کی روایت میں ہے اور کسی نے اس کو نقل نہیں کیا۔ مگر امام بیہقی رحمہ اللہ نے لیس فی
حدیث احد منهم کا تعلق ما قبل واذا قرأ فانصتوا کے ساتھ جوڑ کر خود غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور
دوسروں کو مغالطہ دے رہے ہیں فساھتہ اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ۔
امام بیہقی رحمہ اللہ کا ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ بعض علماء نے آیت کی تفسیر میں زید بن اسلم کا قول نقل کیا ہے لیکن اس نے
پوری عبارت نقل نہیں کی اور اس کا یہی وتیرہ ہے کہ عبارات میں سے وہ صرف اس حصہ کو نقل کر دیتا ہے جو اس کے
مفید مطلب ہو سکتا ہے اور باقی عبارت چھوڑ دیتا ہے تاکہ دیکھنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ یہ ناقل کی دلیل ہے
اور وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتا کہ علیہم بذات الصدور اس کے اس فعل سے واقف ہے اور یہاں اوقات اس کی کتاب
کو پڑھنے والا اس کی تلبیس پر مطلع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ساتھ ایسی مغالطہ آفرینی سے محفوظ رکھے۔
(کتاب القراءة ص ۹۴) مگر امام بیہقی رحمہ اللہ نے دوسروں کی شکایت کرتے کرتے خود اس کے ترکیب ہو گئے ہیں۔ والمعصم
من عصمہ اللہ تعالیٰ۔ ہ
آپ ہی خود اپنے چور و جفٹا کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۲۸ میں غلط فہمی کے عنوان سے یہ بے مغز بات کہی ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ کی غلطی نہیں
معارض کی غلطی ہے اور پھر آگے لکھا ہے کہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عبارت امام مسلم کی ہو اور کچھ امام بیہقی نے اپنی
طرف سے کہ دی ہو۔ (محصلاً) مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ ادھر ادھر کی باتیں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ولہم ما ولیم یروہا مسندۃ فی صحیحہ (فوی شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۵۱) خصوصاً جب کہ اس روایت کو امام مسلم نے اپنے صحیح میں باسند پیش بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت مسلم کی مسند روایتوں میں شامل نہیں ہے۔

جواب۔ یہ بات جانے دیجئے کہ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان بنی متفرد ہیں یا کوئی اور بھی اس کو بیان کرتا ہے؟ اور یہ بات بھی جانے دیجئے کہ حفاظ حدیث اس کی تصحیح پر متفق ہیں یا تضعیف پر؟ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ حدیث جو حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور جس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ہے۔ امام مسلم کی مسند روایتوں میں ہے یا غیر مسند میں؟ امام نووی کا یہ خیال کہ یہ مسند نہیں باطل اور مردود ہے۔ حافظ ابن حجر اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ وہو حدیث صحیح الخیرہ مسلم من حدیث ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲ و نیل الاوطان جلد ۲ ص ۱۰۴) حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت صحیح ہے اور امام مسلم نے اس کی تخریج کی ہے۔ فریق ثانی اصول حدیث کی کتابوں کی طرف مراجعت کر کے دیکھ لے کہ محدثین کی اصطلاح میں تخریج کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور کوئی محدث جب کسی سند کے ساتھ روایت بیان کرتا ہے اور اسی سند کے روایت میں سے کسی کی زیادت کو بیان کرتا ہے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ مسند ہوتی ہے یا غیر مسند؟

حلا وہ بریں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ روایت امام مسلم نے باسند پیش نہیں کی تو کیا ابو ہریرہ اور ابو داؤد وغیرہ نے بھی اس کو مسند روایت نہیں کیا؟ اور کیا کسی حدیث کی تصحیح اس میں منحصراً ہے کہ امام مسلم اسے باسند نقل کریں تو صحیح ہوگی ورنہ ضعیف ہوگی؟ الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت امام مسلم کی مسند روایتوں میں شامل ہے۔ اور امام نووی کا یہ کھلا قصور ہے۔

کہ اس کو غیر مسند قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ عبارت ہے جس سے مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم (بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) سکتیں۔ بفضلہ تعالیٰ عربی دان کثرت سے موجود ہیں کسی ثالث عربی دان سے دریافت کر لیں کہ غلطی امام بیہقی کی ہے یا بقول مؤلف مذکور معترض کی خواہ مخواہ کا تعصب اور جرات نہ بن سکتی ہو اس کو بھی بنا ڈالنا علماء کی شان کے خلاف ہے۔

امر تسری کو غلط فہمی ہوتی۔ اور علی رؤس الاشہاد ان کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اس زیادت کے صحیح ہونے میں ذرا برابر شک و شبہ نہیں۔ البتہ۔ ع

تراہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

چھٹا اعتراض:

حافظ ابن حجر، امیر بیانی رحمہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں۔ کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت صحیح ہے مگر اس سے مراد ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت ہے۔ یعنی جب امام اور تم (مقتدی) سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہو جاؤ تو امام قرأت کرے اور تم خاموش رہو کیونکہ واذا قرأ فانصتوا عام ہے اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سورۃ فاتحہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۶، فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲، سبل السلام جلد ۱ ص ۲۳۵)

جواب: ان حضرات کی یہ توجیہ اور تاویل قطعاً باطل ہے۔ اس لیے کہ مسلم اور ابو عوانہ وغیرہ کے حوالہ سے صحیح روایت ان الفاظ کے ساتھ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جا چکی ہے۔

واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیہم کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو
ولا الضالین۔ فقولوا۔ آمین اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے
تو تم آمین کہو۔

یہ عقیدہ تو فریق ثانی ہی حل کرے گا کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے قبل وہ کون سی قرأت ہے جس میں امام کافر بیضہ قرآۃ کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموش رہنا بتلایا گیا ہے؟ شاید ان کے نزدیک اس اثنام میں سورۃ یسین کی قرأت سنت ہو جس کی امام قرأت کرتا رہے اور اس وقت مقتدی خاموش رہیں؟ اس صحیح حدیث کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ لہ مولف خیر الکلام لفظ قرأت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اثر اگرچہ مطلق ہے مگر قرأت بالاجماع چونکہ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اس واسطے اس اثر سے فاتحہ خلف الامام کا پڑھنا تاہم صحیح ہے۔ (صفحہ ۵۲۱) اس اعتبار سے مقتدی کو سورۃ فاتحہ کی قرآۃ کے وقت اولاً وبالذات خاموش رہنا ضروری ہے کیونکہ بالاجماع قرأت یہاں ہی سے شروع ہوتی ہے۔

اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تاویل قطعی طور پر باطل اور مردود ہے کیونکہ واذا قرأ فاصتوا کے حکم میں مقتدیوں کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ممانعت اولاً اور بالذات ہے اور قرآن کریم کی بقیہ سورتوں کی ممانعت ثانیاً اور بالتبع ہے۔ فریق ثانی کے سطحی قسم کے لوگ عموماً یہ مطالبہ کیا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی صحیح روایت بتلاؤ جس میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کی مقتدیوں کے لیے ممانعت آئی ہو۔ سو طلبہ کرام کو مسلم اور ابو عوانہ کی یہ صحیح حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے اور حدیث نمبر وغیرہ ملاحظہ کریں اور اگر بالفرض اس حدیث میں واذا قرأ فاصتوا کی زیادت نہ بھی نہ کوئی مکتب بھی یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے نہ کہ مقتدیوں کا اس زیادت کے بغیر روایت کا مضمون یہ ہو گا جب تم نماز پڑھنا چاہو تو اپنی صفیں درست کر لو۔ اور ایک تم میں سے امام بنے جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔ اگر مقتدیوں پر بھی سورۃ فاتحہ کی قرأت لازم ہوتی تو اذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کے بجائے اذا قلت غیر المغضوب ولا الضالین ہوتا جیسا کہ فقولوا آمین میں قولوا جمع کا صیغہ ہے حالانکہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھنے کی نسبت صرف امام کی طرف ہوتی ہے اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصاف کرنا ہے۔ ہاں البتہ آمین کہنے میں مقتدی برابر کے شریک ہیں اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۷۷ کی ایک روایت میں اس طرح آتا ہے کہ اذا قال القاری غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقال من خلفه آمین الحدیث کہ جب پڑھنے والا غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو جو اس کے پیچھے ہیں وہ آمین کہیں اس روایت میں شارح نے امام کو قاری اور پڑھنے والا کہا ہے اگر سب کے لیے قرآن لازم ہوتی تو صرف امام ہی قاری نہ ہوتا۔ (الدلیل المبین ص ۲۸۹) رہا حضرت عبادہ کی روایت کا حوالہ دینا تو اپنے مقام پر آئے گا کہ قرأت سورۃ فاتحہ برائے مقتدی کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ لہذا اس صحیح روایت سے اس کا تعارض قائم کرنا اور پھر اس کی تاویل اور توجیہ کرنا انصاف سے بعید تر ہے۔

لہ یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸، نسائی جلد ۱ ص ۱۳۲ اور طیبی ص ۳۳۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔

یہ کاوشیں سبب ہیں کیسی، کہ دونوں کی کچھ انتہا بھی
زبان کہتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو، سوال کیا ہے؟

مؤلف خیر الکلام نے (ص ۲۲۳ و ص ۲۲۴) میں یہ کہہ کر جان چھڑانے کی ناکام کوشش
کی ہے کہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ دونوں جملوں میں ترتیب ہے حالانکہ واو ترتیب کے
لیے نہیں ہوتی جیسے مرزائی لفظ **مَتَوَفِيكَ وَدَا فَعَلَّكَ** میں ترتیب ثابت کرنے میں غلطی کرتے
ہیں اسی طرح معترض نے بھی غلطی کی ہے اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ میں فانصتوا کا جملہ
واو الضالین کے بعد ہے مگر سند میں محمد بن یونس ہے جو ضعیف ہے۔ حدیث اگرچہ
ضعیف ہے مگر اس سے انصاف کے محل کی تعیین ہوتی ہے (مصلحہ) اور قاضی مقبول احمد
صاحب نے الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۸ میں بزعم خویش قرآن و حدیث کی چند
مثالیں دے کر آخر میں یہ کہا ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ واو ہمیشہ ترتیب کے لیے نہیں
ہوتی اور اس زیر بحث حدیث میں بھی ترتیب نہیں ہے تو مولانا موصوف کا طلبہ کو
نصیحت کرنا محض طفل تسلی ہے اور اس فقرہ سے ما زاد علی الفاتحہ مراد لینے میں کوئی
رکاوٹ نہیں۔ اھ

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل بے جان ہے:

اولاً۔ اس لیے کہ اگرچہ جہود سخاۃ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ حرف واو ترتیب کا فائدہ
نہیں دیتا لیکن بعض اکابر ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ اس میں ترتیب ہوتی ہے چنانچہ علم نحو کی مشہور
کتاب مغنی اللیب میں ہے کہ

وقول بعضهم ان معانها الجمع المطلق
غير سديہ لتقييد الجمع بقيد الاطلاق
وانما هي للجمع لا بقيد وقول السيراني
ان النحويين واللغويين اجمعوا على انها
لا تفيد الترتيب مردود بل قال بافادتها
اياها قطرب والربيعي والفراء وطلب

اور بعض کا یہ کہنا کہ حرف واو کا معنی جمع مطلق ہے
درست نہیں ہے کیونکہ جمع کے ساتھ اطلاق کی
قید لگ گئی ہے حالانکہ یہ بغیر قید کے جمع کے لیے
ہے اور سیرانی کا یہ کہنا کہ جملہ نحوی اور لغوی
اس امر پر متفق ہیں کہ واو ترتیب کا فائدہ نہیں
دیتی بالکل مردود ہے کیونکہ قطرب، ربیع، فراء

ثعلب، ابو عمر والزاہد، ہشام اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ترتیب کا فائدہ دیتی ہے اور امام نے برہان میں بعض حنفیوں سے نقل کیا ہے کہ واؤ معیت کے لیے ہے۔

بعض نے فرما، کسائی، ثعلب، ربیع اور درستیہ سے نقل کیا ہے اور اسی کے بعض فقہاء قائل ہیں کہ حرف واؤ ترتیب کے لیے ہے۔

وابوعمر والزاهد و ہشام و الشافعی و نقل الامام فی البرہان عن بعض الحنفیۃ انہا للحمیۃ ... ۱ھ (جلد ۲ ص ۳۱) اور علامہ رضی لکھتے ہیں کہ

و نقل بعضهم عن الفراء و الکسائی و ثعلب و الربعی و ابن درستیہ و بہ قال بعض الفقہاء انہا للترتیب ... ۱ھ (رضی جلد ۲ ص ۳۰۶)

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء شافعیہ اور بعض نحویوں کا یہی مذہب ہے کہ حرف واؤ ترتیب کو چاہتا ہے (محصلاً شرح مسلم جلد ۱ ص ۳۲) اس سے معلوم ہوا کہ حرف واؤ کو ترتیب کے لیے ماننے والے بڑے بڑے ائمہ ہیں جن میں امام شافعیؒ وغیرہ بھی ہیں۔ لہذا معترض کو استدلال میں مزاہتوں سے تشبیہ دے کر اپنے دل ماؤف کی بھڑاس نکالنا اور حواریوں کو خوش کرنے کی بے جا سعی کرنا علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

و ثانیاً۔ جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ حرف واؤ ترتیب کے لیے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ترتیب ضروری اور واجب نہیں یہ کب کہا ہے کہ ترتیب ناجائز اور حرام ہے کسی مستثنیٰ عالم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت پیش کی تھی کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقیہ حیات تھے اور ہم یوں کہا کرتے تھے۔ ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۲۱۲ و قال حسن صحیح) یعنی اس ترتیب سے ہم ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے تو اس پر ایک رافضی بدحواس ہو کر بولا کہ حرف واؤ ترتیب کے لیے نہیں ہوتا۔ مستثنیٰ عالم بولا کہ ترتیب ناجائز اور حرام بھی تو نہیں ہے۔

و ثالثاً۔ حدیث زیر بحث کے تین جملے ہیں: فاذا کبر فکبروا و اذا قرأ فانصتوا و اذا قال غیر المغضوب علیہم و لو انضالین فقولوا امین تو مؤلف خیر الکلام وغیرہ لے اور ابن رشدؒ نے سخا کوفیہ کا یہی مسلک نقل کیا ہے کہ واؤ میں ترتیب ہوتی ہے۔ (بدایۃ المجتہد

کے ذہن کے مطابق واذا قرأ فافصتوا اور واذا قال غیر المخصوص علیہم..... الخ جو حرف
 واو کے ساتھ مذکور ہیں فاذا کبر فکبروا سے پہلے بھی ہو سکتے ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ امام
 کے تکبیر کرنے سے پہلے ہی تم خاموش رہا کرو اور غیر المخصوص..... الخ پڑھا کرو اس لحاظ سے
 ماقبل التکبیر میں بھی انصات کی صورت نکل آئی جو فریق ثانی کو ٹہری مفید رہے گی اور امام
 بھی تکبیر سے پہلے ہی غیر المخصوص علیہم..... الخ پڑھ لیا کرے گا اور مقتدی بھی آمین کہ لیا
 کریں گے کیونکہ حرف واو ترتیب کو نہیں چاہتا اس طرح انشاء اللہ تعالیٰ سب مسئلے حل
 ہو جائیں گے۔

ورابعداً۔ واقطنی کی روایت کے متعلق خود مؤلف غیر الکلام ضعیف ہونے کا اقرار کیا ہے
 پھر اس سے تعین محل کا سہارا بالکل بیکار ہے انتہائی تعجب ہے کہ صحیح ابو عروانہ اور صحیح مسلم
 کے ثقہ راویوں کی متابعت تو مؤلف کے نزدیک کالعدم ہے مگر محمد بن یونس (جس کے بارے
 میں مولانا شمس الرحمن صاحب غیر مقلد لکھتے ہیں کہ ہوضعیف لا یحتج بہ (تعلیق المغنی
 جلد ۱ ص ۱۲۵) کی روایت سے تعین محل انصات ضرور ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ!
 آپ نے ملاحظہ کیا کہ فریق ثانی کس طرح بے جان اور بے وزن دلیلوں کا سہارا لیتا ہے۔

دوسری حدیث :

امام نسائی فرماتے ہیں کہ ہم سے جا روڑ بن معاذ ترمذی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ
 ہم سے ابو خالد الاحمر نے بیان کیا۔ وہ محمد بن عجلان سے روایت کرتے ہیں اور وہ زید بن اسلم
 نے امام نسائی (الموتوفی ۳۰۳ھ) جن کی کتاب سنن نسائی صحاح ستہ میں تیسرے درجہ پر مانی جاتی ہے۔

علامہ ذہبی ان کو حافظ الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (مذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۱)

امام نسائی رح ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مستقیم الحدیث

ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۵۳) حافظ ابن حجر ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۶۴)

امام وکیع ابن معین اور ابن مدینی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائی لا یاسب اور ابو ہشام رفاعی

ثقة اور امین کہتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں

عجل کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۶۲ و تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۸) علامہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابو صالحؓ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما جعل
الامم ليؤتم به فاذا اكبر فكبروا واذا قلوا
فانصتوا واذا قال سمع الله لمن حمده
فقولوا اللهم ربنا ولك الحمد -
کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا ہے کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی
اقتدار کی جائے سو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور
جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ
سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللہم ربنا لک الحمد کہو۔
(نسائی ج ۱ ص ۱۰۷)

(باقی پچھلے صفحے کے حاشیے) ذہبی ان کو الحافظ الصدوق اور مشہور محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۵)
لکہ امام ترمذی ان کو ثقہ اور مامون فی الحدیث کہتے ہیں۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۱۰۰ و کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۷)
امام بیہقی ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۲) امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ امام فقیہ
اور عابد تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۸۷) ابن حاد حنبلی کا بیان ہے کہ وہ عابد پابند شریعت
اور صداقت شعار تھے۔ (شذرات التہذیب جلد ۱ ص ۲۲۲) علامہ ذہبی ان کو الامام اور القدوہ لکھتے
ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۶) امام احمد سفیان بن عیینہ بن معین، بخاری، ابو حاتم، نسائی اور ابو زر عہد ان کو ثقہ
کہتے ہیں۔ یعقوب بن شیبہ ان کو صدوق وسط کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔
ساجی ان کو اہل صدق میں شمار کرتے ہیں۔ ابن سعد ان کو عابد ناسک اور فقیہ بتاتے ہیں۔
(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۳۲) مولانا شمس الحق ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تحلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲)
عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳) اور خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تاریخ جلد ۲ ص ۳۰۲)
یہ زید بن اسلم کو علامہ ذہبی الامام اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۲۲) امام احمد ابو زر عہد، ابو حاتم
محمد بن سعد، نسائی، ابن خراش۔ اور یعقوب بن شیبہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب
جلد ۱ ص ۳۹۶)

ابو صالح کا نام ذکون تھا۔ امام احمد ان کو ثقہ اجل الناس اور اوثق الناس کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۳)
امام ابن معین، ابو حاتم، ابو زر عہد، ابن سعد، ساجی اور بخاری سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث حبرئی
اور ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۱۹) حضرت ابو ہریرہؓ جلیل القدر
(باقی اگلے صفحہ پر)

اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ تمام نمازوں میں امام کا وظیفہ قرآن کرنا اور مقتدیوں کا فریضہ خاموش رہنا ہے۔ اس حدیث پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ ملاحظہ کیجئے اور ساتھ ہی ان کے جوابات بھی دیکھ لیجئے۔

پہلا اعتراض:

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام بیہقی اور مبارکپوری صاحب وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کرنے میں ابو خالد الاحمر رحمہ اللہ متفرق ہیں لہذا یہ زیادت قابل قبول نہیں۔ (جزیر القراءۃ ص ۵۶، کتاب القراءۃ ص ۹، ابکار المنن ص ۱۵۲ اور مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۴۳۲ اور ۴۳۳ میں اس روایت کو شاذ کہہ کر گلو خلاصی چاہی ہے اور قاضی مقبول احمد صاحب نے بھی اس کو شاذ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دی ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام) ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۱۰۸) جواب۔ اس زیادت کے رد کرنے کا یہ بہانہ محض بے کار ہے۔

(پچھلے صفحے کا باقی) صحابی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اس سند کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ رجال اسنادہ ثقات۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

۱۔ یہ روایت ابن ماجہ ص ۶۱، ابوداؤد جلد ۱ ص ۸۹، مسند احمد ص ۴۱۵، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۴، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶، محلی جلد ۳ ص ۳۴۰، جزیر القراءۃ ص ۵۶، کتاب القراءۃ ص ۹۱، ابن جریر جلد ۹ ص ۱۱۰، ابن کثیر جلد ۲ ص ۶۲۳، الجوزی النقی جلد ۲ ص ۱۵۶، تعلیق المننی جلد ۱ ص ۱۲۲، عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵، درایہ ص ۹۴، زیلعی جلد ۲ ص ۱۶، مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، آثار السنن جلد ۲ ص ۸۷، ابکار المنن ص ۱۵۳، اعلیٰ السنن جلد ۲ ص ۵۵، دلیل الطالب ص ۲۸۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳، بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵ اور فتح الملہم ص ۲۲ وغیرہ میں مروی ہے۔ لہٰذا نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ ودر حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ است واذا قرأ فانصتوا پس خطہ موتم انصت و استماع قرآن امام است و انصت خاص بچہرہ نیست بلکہ شامل سر یہ ہم است پس واجب سکوت باشد مطلقاً نہ و قرأت الخ (ہدایۃ السائل ص ۱۹۳)

۲۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ لہریتا بع علیہ مبارک پوری صاحب ایک سند کی تحقیق میں لکھتے (باقی اگلے صفحہ پر)

اولاً۔ اس لیے کہ جب ابو خالد بن الاثری اختلاف ثقہ اور ثبت میں تو پھر ان کی زیادت کیوں قابل قبول نہ ہوگی؟

ثانیاً۔ اس زیادت کے بلیغ کرنے میں ابو خالد بن الاثری متفقہ نہیں بلکہ محمد بن سعد انصاری اشہلی بھی اس زیادت کو نقل کرتے ہیں۔ اور اس روایت کے باقی وہی راوی ہیں جن کی توثیق عرض کر دی گئی ہے۔ البتہ محمد بن عبد اللہ بن مبارک کا ذکر نہیں ہوا۔ اور یہیں وہ بھی ثقہ، نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ ابو خالد از ثقات اثبات است، بخاری و مسلم بے احتجاج کردہ اند۔ دریں صورت تفرش مضر نیست، و نیز و سے نہ تنہا باین زیادت متفقہ است، بلکہ ابو سعید محمد بن سعد انصاری نیز تابع او بریں زیادت بوده است۔

(دلیل الطالب ص ۲۹۳)

غرضیکہ یہ زیادت بھی سابق کی طرح بالکل صحیح ہے اور اس کے غیر صحیح ہونے کا ادنیٰ احتمال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض؛

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ محمد بن عجلان میں کچھ کلام اور مقال ہے۔ نیز وہ مدلسی (پچھلے صفحہ کا بقید) ہیں کہ امام بخاری کا محمد بن عبد اللہ بن الحسن سے متعلق روایت بع علیہ کناہر کہ مضر نہیں کیونکہ محمد مذکور ثقہ تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۳۱) کیا ہم بھی مبارک پوری صاحب اس انصاف کی امید رکھ سکتے ہیں۔

لہ یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۷، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲، عون المعبود جلد ۱ ص ۲۲۵، نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۶ اور تعلق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

۳۔ امام نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۰۷) دارقطنی ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۲۵) زبیدی کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (جلد ۲ ص ۱۶) ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۵) مولانا شمس الحق ان کو ثقہ کہتے ہیں (عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵ و تعلق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲)

۴۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص ۳۲۷) الحاصل اس روایت کے بھی جملہ راوی ثقہ ہیں۔ اور اصول حدیث کی رو سے یہ روایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (ابکار المنن ص ۱۵۲)

جواب۔ مبارک پوری صاحب ان میں مقال کا شاید مطلب ہی نہیں سمجھے۔ یہی

ان کی تدلیس تو وہ بھی مفروغ عنہ ہے۔

اولاً۔ بقول بعض یہ مکحول کے درجہ کے دلس تھے۔ مگر فریق ثانی مکحول کی تدلیس سے

صرف نظر کر جاتا ہے۔ ا۔

ثانیاً۔ اگر ان کی تدلیس مضر ہوتی تو امام بخاری اور ابو داؤد وغیرہ ضرور اس کا تذکرہ کرتے

مگر وہ صرف ابو خالد الناعم کے تفرق کی شکایت کرتے ہیں۔

ثالثاً۔ دیگر محدثین کو عموماً اور علامہ ذہبی کو خصوصاً یہ قاعدہ معلوم ہے لیکن وہ محمد

بن عجلان کی متعدد معنعن حدیثوں اور روایتوں کو صحیح کہتے ہوئے تصحیح کرتے ہیں۔ (مثلاً تلخیص

مستدرک جلد ۱ ص ۱۰ وغیرہ)

رابعاً۔ محدثین اور محققین کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عجلان، قتادہ، سفیان

ثوری اور حسن بصری وغیرہ کی طرح ان دلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں

خامساً۔ محمد بن عجلان کے دو متابع بھی موجود ہیں۔ خارج بن مصعب اور یحییٰ بن عمار

(دیکھیے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷) اور گویہ کمزور اور ضعیف ہیں لیکن متابعت میں پیش کرنے پر

مبارک پوری صاحب کو بھی کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔

لہ بعض لوگوں نے ان میں یہ کلام کیا ہے کہ امام بخاری و مسلم نے ان سے احتجاج نہیں کیا۔ لیکن یہ اعتراض

باطل ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ ثقہ اور مثبت راوی کے لیے یہ شرط نہیں کہ ان سے امام بخاری و مسلم نے

ضرور احتجاج کیا ہو۔ ثانیاً۔ امام مسلم نے ان سے احتجاج کیا ہے (مستدرک جلد ۱ ص ۱۰، نزل الجہود جلد ۲ ص ۵۵)

اور مسلم جلد ۲ ص ۳۱ وغیرہ ملاحظہ کر لیجئے) محمد بن عجلان بطریق سعید مقبری عن ابی ہریرہ کی بعض روایتوں پر

کچھ کلام کیا گیا ہے (کتاب العطل ترمذی جلد ۲ ص ۲۳۷ و تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۳۱) لیکن وہ بھی صرف چند

روایتیں ہیں اور علامہ ذہبی نے ان کا جواب بھی دے دیا ہے (میزان جلد ۲ ص ۱۰۲) مگر ہم نے جو سند پیش

کی پیش کی ہے وہ سعید مقبری کے طریق سے نہیں بلکہ زید بن اسلم کے طریق سے ہے۔

۳۔ دیکھتے ابکار المنن ص ۱۳۱ اور دیگر محدثین بھی اس قاعدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سادماً۔ جرح کرنے والے جرح پر بھی متفق نہیں ہیں۔ بعض ابو خالد کا تفریق بتاتے ہیں اور بعض محمد بن عجلان کی تدلیس اس سے بھی جرح کمزور ہو جاتی ہے۔ (اعلام السنن جلد ۴ ص ۵۶) سابقاً۔ اگر محمد بن عجلان میں واقعی کوئی کلام ہوتا۔ یا ان کی تدلیس مضر ہوتی تو حضرات محدثین کرام کی ایک بہت بڑی جماعت اس حدیث کی ہرگز تصحیح نہ کرتی، حالانکہ اس حدیث کی ذیل کے ائمہ حدیث تصحیح کرتے ہیں:

- ۱۔ امام احمد بن حنبل (جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۶) ۲۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (جلد ۱ ص ۱۶۴)
- ۳۔ علامہ ابن حزم (محل جلد ۳ ص ۳۲۲) ۴۔ امام نسائی (جلد ۱ ص ۱۰۶)
- ۵۔ دارقطنی (جلد ۱ ص ۱۲۲) ۶۔ ابن جریر (تفسیر جلد ۱ ص ۱۱)
- ۷۔ حافظ ابو عمر بن عبد البر (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۰۶) ۸۔ حافظ ابن کثیر (تفسیر جلد ۳ ص ۶۲۳)
- ۹۔ علامہ مار دینی (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶) ۱۰۔ امام منذری (ذیلی جلد ۲ ص ۱۶۱ و تطبیق المغنی جلد ۱ ص ۲۳۵، تطبیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲)
- ۱۱۔ علامہ جمال الدین (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۶۱) جلد ۱ ص ۱۲۲
- ۱۲۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی (عون المعبود ۱۳۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب جلد ۱ ص ۲۳۵، تطبیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲) (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

بلکہ نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

وهذا الحديث مما ثبت عند اهل السنن
وصححه جماعة من الائمة۔
یہ حدیث ارباب سنن کے نزدیک ثابت اور محقق
ہو چکی ہے اور ائمہ حدیث کی ایک بہت بڑی جماعت
نے اس کی تصحیح کی ہے۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا حوالہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ بڑی شد و مد سے
واذا قرأ فانصتوا کی روایت اور اس میں زیادت کو صحیح ثابت کرتے ہیں، علامہ ابن حزم رحم
(بقیہ پچھلا صفحہ) ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳ و مقدمہ نووی ص ۱۶ و کتاب القراءۃ
ص ۱۲۹ و تدریب الراوی ص ۲۸، اور اعلام السنن ص ۲۳، اور لکھا ہے و هذا مجمع
بین المسحوشین مگر یہ یاد رکھیے کہ اصل راوی صرف مدلس ہو ضعیف اور کمزور نہ ہو۔
ور نہ متابعت بے سود ہوگی۔

لکھتے ہیں کہ بعض کا خیال ہے کہ اس زیادت میں محمد بن عجلان نے خطا کی ہے۔ مگر ہم ثقہ راوی کے بارے میں کسی واضح برہان کے بغیر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بہر حال سند کے لحاظ سے یہ زیادت بالکل صحیح ہے (محلّی ابن حزم جلد ۳ ص ۲۴۲) انصاف سے فرمائیے کہ کسی حدیث کی تصحیح کے لیے اس سے بڑھ کر حضرات محدثین کرام کے پاس اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ مگر۔

آنکھیں اگر ہیں بست تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور ہے کیا آفتاب کا۔

الحاصل حضرات ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت بھی اور اس کی پوری سند بالکل صحیح اور بے غبار ہے اور محض تعصب کی وجہ سے اس کو شاذ کہہ کر رد کرنا بے سود ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے جعفر خلّعی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسن بن علی بن شیبہ المعمری نے امام بیہقی کا ترجمہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۱۱ حافظ ابو عبد اللہ الحاکم صاحب مستدرک کا ترجمہ بھی باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔
۱۲ جعفر بن محمد بن نصیر الخلدی، علامہ خطیب ان کو ثقہ، صادق، دیندار اور فاضل لکھتے ہیں (تاریخ خطیب جلد ۲ ص ۲۷۷)

۱۳ علامہ ذہبی ان کو حافظ، العلامة اور البارع لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اور فہم سے بہرہ ور تھے۔ امام دارقطنی ان کو صدوق اور حافظ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۵) ابن عدّی ان کو کثیر الحدیث اور امام ربانی کہتے ہیں۔ (ایضاً) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ تمام محدثین ان کے عادل ضابطہ اور صاحب فضیلت ہونے پر متفق ہو چکے ہیں۔ موسیٰ بن ہارون کا بیان ہے کہ وہ اوثق الناس اور اثبت الناس تھے اور ان کی یہ خوبی تھی کہ تالیس نہیں کرتے تھے۔ محدث عبدان ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ میں نے معمری جیسا محدث تمام روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۱ تا ۲۲۵) اور علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے فہم و حفظ سے متصف تھے۔ ان کی احادیث میں کچھ

نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن محمد نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے طفاویمی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ایوب نے بیان کیا۔ وہ زہری سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا
قرأ الہمام فانصتوا۔ (کتاب القراءۃ ص ۹۲)
کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔

اس روایت میں بھی مقتدی کا وظیفہ (تمام نمازوں میں) خاموشی اور امام کا فریضہ قراءت بتلائی گئی ہے اور اگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جاتے تو اس روایت پر بھی کوئی معقول اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ گو امام بیہقی نے یہ فرمایا ہے کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بیان کرنے میں المعمری متفرد ہیں۔ لیکن جب معمری ثقہ ثبت اور الحافظ اور الامام ہیں تو ان کی یہ صحیح روایت اور زیادت بیان کس طرح رد کی جا سکتی ہے؟ معمری کے طریق سے ایک روایت کی امام حاکم اور علامہ ذہبی دونوں علی شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں (مستدرک جلد ۱ ص ۳۵۸) مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۳۵ اور ۳۳۶ میں یہ لکھا ہے کہ معمری

(بقیہ پچھلا صفحہ) مغائب اور افراد بھی تھے۔ دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور حافظ تھے، ان پر

جرح موسیٰ بن ہارون نے از روئے عداوت کی ہے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۷۰)

امام ابو حاتم ان کو صالح الحدیث اور صداقت شعار کہتے ہیں۔ محدث صالح جزیرہ، مسلم بن قاسم

ابن عبد البر اور دیگر محدثین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خزیمہ ان کو دانا محدث کہتے ہیں۔ نسائی لا بأس بہ

اور ابن عدی صدوق کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۸۱) علامہ ذہبی ان کو احد الاشبائ

المسنین کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۴۲)

امام علامہ ذہبی ان کو مشہور محدث اور ثقہ کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۳ ص ۸۹) امام ابن معین ان کو لیس

بہ باس اور ابن مدینی ثقہ کہتے ہیں اور ابو داؤد اور ابو حاتم لیس بہ باس سے ان کی توثیق کرتے ہیں

ابن جبان ثقات میں لکھتے ہیں دارقطنی کا بیان ہے کہ بخاری نے ان سے احتجاج کیا ہے ابن عدی کا بیان ہے

کہ تمام مستقدمین ان کی ثقاہت پر متفق ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۰۹)

امام احمد ابن معین، ابو زرہ، نسائی، ابن سعد، دارقطنی اور ابو داؤد سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم

(باقی اگلے صفحہ پر)

صاحبِ غرائب و افراد ہیں اور بعض محدثین نے ان کو کذاب کہا ہے۔ عبدان کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ حسد سے کہا ہے اور بغدادیوں کی طرح یہ بھی موقوف کو مرفوع کر دیا کرتا تھا اور حدیث میں اضافے کرنے کی ان کی عادت تھی۔ (محصلة خیر الکلام بحوالہ لسان المیزان)

الجواب: بخاری اور مسلم میں ایسے متعدد راوی موجود ہیں۔ مؤلف خیر الکلام کا شوق ہو تو ہم ماشار اللہ تعالیٰ باحوالہ عرض کر سکتے ہیں اس لیے صاحبِ غرائب و افراد ہونا اصول حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے محض عداوت اور دشمنی کی وجہ سے ان پر جرح کی ہے اور کبھی یہ کہا کہ یہ موقوف کو مرفوع کر دیتے ہیں اور کبھی یہ کہا کہ یہ اضافے کرتے ہیں اور ان کے بڑے دشمن اور معاند موسیٰ بن ہارون نے ان کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر بھی انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۴) اور ان کی تقلید کرتے ہوئے لوگ اس پر جرح کرتے اور اس زیادت کو انکار کرتے ہیں جب محدثین کے سامنے حقیقت حال کھل گئی تو انھوں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ پس آخر میں بات ان کی توثیق پر پکی ہوئی ہے زیادہ

فاستقر الحال اخرا علی توثیقہ فان
غایۃ ما قیل فیہ انہ حدث باحادیث
لم یتابع علیہا وقد علمت من کلام
الدارقطنی انہ رجع عنہا فان کان
قد اخطأ فیہا کما قال خصمہ فقد
رجع عنہا وان کان مصیبا بہا کما کان
یدعی فذاک ارفعہ لہ واللہ اعلم۔

(لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۵)

سبب ہے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) ان کو صالح الحدیث اور ابن عبد البر ثقہ اور حافظ کہتے تھے۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۱۲)

۱۔ ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ معرّی ثقہ ہیں اور ثبت بھی۔ اور ان کی یہ زیادت جو واذا قرأ فانصتوا سے وارد ہوئی ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ دوسری اسانید میں ثقہ راویوں سے بھی یہ مروی ہے اور قرأت خلف الامام انصتات کے بالکل خلاف ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں باب سوم میں آئیں گی کہ وہ بھی امام کے پیچھے سب یا بعض نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے اور شاذ مقبول کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مستقل حدیث ہو جس کو ثقہ راوی بیان اور روایت کرتا ہو انصاف کی دنیا میں اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور کسی حافظ کی قرآن کریم میں غلطی سے کوئی جملہ بڑھا دینا یہ شاذ مردود کی مثال ہے اس کو مؤلف خیر الکلام اپنے پاس ہی رکھیں۔ بات ثقہ راویوں کی زیادتی کی ہو رہی ہے۔ الغرض واذا قرأ فانصتوا کی زیادتی بالکل صحیح ہے ایک رتی شک اس کی صحت میں نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت میں فاستمعوا وانصتوا کا حکم تھا اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انس بن مالک کی صحیح اور مرفوع روایتوں میں بھی اس کی تصریح ہے کہ واذا قرأ الامام فانصتوا اور ایک ایک سند کا صحیح ہونا بھی آپ معلوم کراتے ہیں۔ اب ان کے حجت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وحدیث صحیح حجت است برامت در رنگ حجت کتاب عزیز۔ (دلیل الطالب ص ۸۸) اور لکھتے ہیں کہ اصل در امر وجوب فعل مامور بہ است۔

(بدور الابلہ ص ۲۲)

اور نیز تحریر فرماتے ہیں کہ امر بشیٰ نہیں است انضداد او۔ (بدور الابلہ ص ۳۲۸) الغرض مقتدی کے لیے استماع اور انصتات کے وجوب کا حکم اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کے ممنوع اور منہی عنہ ہونے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھیے فریق ثانی

لے ارباب اصول کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ امر مطلق کا مفاد وجوب ہے، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: "وامره المطلق علی الایجاب۔" (القواعد النورانیۃ الفقہیۃ، طبع مصر ص ۵۲، شیخ الاسلام) یعنی صاحب شرع کا امر مطلق وجوب پر محمول ہوتا ہے، شیخ الاسلام ابن وقین العیفریؒ فرماتے ہیں: "وظاھرا من الوجوب۔" (احکام الاحکام جلد ۳ ص ۵۳) امر ظاہری طور پر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صیغہ امر بے صارف محمول پر وجوب است۔

(افادۃ الشیوخ ص ۱۰۶)

مانتا ہے یا نہیں۔ کہیں وہ یہ نہ ارشاد فرمادے کہ یہ سب سوچ کر دل لگا یا ہے ناصح !
نئی بات کیا آپ مندرہا رہتے ہیں۔

قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت ابو ہریرہؓ
و حضرت انسؓ بن مالک کی پیش کردہ صحیح روایتیں اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے سہری
اور جہری سب نمازوں کو شامل ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے اقتدا کر لینے کے
بعد مقتدی کو سوائے استماع، انصات اور خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب
بعض ایسی روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں خاص طور پر جہری نمازوں میں مقتدیوں کو امام
کے پیچھے قرأت کرنے کی سخت تنبیہ اور مانعت آتی ہے۔ اور بعض روایتیں وہ بھی ہیں جن
میں جہری نمازوں کی کوئی قید مذکور نہیں ہے بلکہ وہ سب نمازوں کو شامل ہیں۔

چوتھی حدیث۔ حضرت امام مالکؒ، امام ابن شہاب زہریؒ سے روایت کرتے ہیں
اور وہ ابن اکیمہ لیشیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کر
تے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

لے حضرت امام مالکؒ اور امام ابن شہاب زہریؒ دونوں کا ترجمہ مقدمہ..... میں نقل کیا
جا چکا ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ صحابی ہیں۔ ابن اکیمہ لیشیؒ کا نام عمارہ تھا۔ امام ابو حاتمؒ اور یحییٰ بن
سعید ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام یعقوب بن سفیان ان کا مشہور تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن حبان
ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۳۱) امام بستیؒ فرماتے ہیں کہ ابن اکیمہؒ اور
ان کے بھائی دونوں ثقہ ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸ و مرقات جلد ۱ ص ۵۳۷) شیخ الاسلام
ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ابو حاتمؒ راضی ان کو صحیح الحدیث اور حدیثہ مقبول لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ
بستیؒ کا بیان ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمر بن مسلمؒ، امام زہریؒ اور سعید بن ابی ہلالؒ نے تواتر
کی ہے۔ (فتاویٰ جلد ۱ ص ۱۳۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (تقریب ۲۷۶) مبارکپوری
صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور اوساط تابعینؒ تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۲) اور دوسرے
مقام پر لکھتے ہیں کہ ثقہ رووی کی یہ شرط نہیں کہ اس سے روایت کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔
(باقی اگلے صفحہ پر)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصرف من صلوة جہر فیہا بالقرآۃ فقال هل قرأ معی منکم احد انفا فقال رجل نعم انا یا رسول اللہ قال فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی اقول ما لی انازع القرآن فانتھی الناس عن القرآۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما ارشاد فرمایا جہر میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ ایک شخص بولا۔ جی ہاں یا رسول اللہ! میں نے قرأت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جہر تو میں (اپنے دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم کی قرأت میں منازعت اور ہاتھ پائی کیوں ہو رہی ہے؟ اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے

(بقیہ پچھلا صفحہ) جیسے ابن اُکیمہ لیشی رحمۃ اللہ علیہ ثقہ ہیں۔ حالانکہ امام زہری کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی۔ (ابکار المنن ص ۶۱) امام ابن معین کا بیان ہے کہ ابن اُکیمہ کی توثیق کے لیے یہی ایک دلیل کافی ہے کہ امام زہری جیسے جلیل القدر امام ان سے روایت کرتے ہیں۔ (ابجہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس حدیث کی امام ترمذی اور ابو حاتم سے تحسین اور تصحیح نقل کرتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۳ ص ۶۲۳) مولانا میر صاحب ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ یہ موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی سند روایت ہے جس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہ تفسیر واضح البیان ص ۴۲۰)

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور مبارک پوری صاحب وغیرہ نے جو یہ کہا ہے کہ ابن اُکیمہ لیشی ثقہ ہیں۔ مگر امام زہری کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی تو یہ ان کا وہم ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کا حوالہ پہلے نقل ہو چکا ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمر بن مسلم (ان کی روایت صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۶۰) میں ہے ملاحظہ کیجئے) امام زہری اور سعید بن ابی ہلال نے روایت کی ہے۔ علاوہ انہیں ان سے ایک چوتھے راوی بھی ہیں۔ چنانچہ مستدرک جلد ۲ ص ۴۸۴ میں ہے عن ابی الحویرث عن عمارۃ بن اُکیمۃ اللیشی..... الخ ابوالحویرث کا نام عبدالرحمن بن معاویہ تھا۔ ابن معین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۱۱۸) ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۲۷۶) لہذا علامہ ذہبی اور مبارک پوری صاحب کی رائے صحیح نہیں ہے۔ ع خذ ما تراه ودع شیئاً سمعت بہ۔

وسلم فیما جہر فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالقرآن حین سمعوا ذلک
قرأت کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت
ترک کر دی تھی۔

من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (موطأ امام مالک ص ۲۹، ۳۰)

یہ روایت موطأ امام مالک کے علاوہ حدیث کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں مذکور ہے
جس کے صحیح ہونے میں قطعاً کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت
کی ممانعت میں یہ روایت قطعی ہے۔

یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷ اور ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰
وغیرہ) جس میں تقریباً تمام حضرات صحابہ کرامؓ موجود ہوں گے، مگر ان میں آپ کے پیچھے قرأت
کرنے والا صرف ایک شخص تھا اور آپ نے ان دیگر حضرات کو کچھ بھی نہیں کہا جنہوں نے قرأت
نہیں کی تھی بلکہ اسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جس نے قرأت کی تھی اور حضرات صحابہ کرامؓ میں
سے کسی نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ حضرت آپ نے تو قرأت کرنے کا خود حکم دیا ہے۔ پھر
کیا ممانعت کا کوئی جدید حکم آیا ہے؟ اور محال ہے کہ آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے
کا حکم دیا ہو اور اس پر عمل کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہو اور آپ نے قیام رکوع، سجود
اور قعدہ وغیرہ کو نیز تسبیح، تحمید اور تشہد کو ناگوار نہیں فرمایا۔ اگر ناگوار گزری ہے تو صرف
مقدمی کی قرأت، جہری نمازوں میں اس سے بڑھ کر امام کے پیچھے قرأت کے منع ہونے
کا اور کیا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے؟ متواف خیر الکلام کا (ص ۲۳۷) میں یہ کہنا کہ اگرچہ
حدیث میں لفظ مطلق قرأت ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت سے باز آگئے مگر قرأت کی

۱۔ یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۷۰، ترمذی جلد ۱ ص ۲۲، ابن ماجہ
ص ۶۱، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۰۱، علی جلد ۳ ص ۲۳۰، جزر القرآن ص ۵۵، ۲۲، سنن الکبریٰ
جلد ۲ ص ۱۵۷، کتاب القرآن ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۱۹۷، البحر المنقح جلد ۲
ص ۱۵۸، ابن کثیر جلد ۳ ص ۶۲۳، مرقات جلد ۱ ص ۵۳۳، فتاویٰ ابن تیمیہ ۲ ص ۱۲۹،
عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۹، فتح الملہم ۲ ص ۲۳، بذل المجموع ۲ ص ۵۷، تحقیق الکلام ۲
ص ۱۲۵، بکار المنن ص ۱۵۵، فصل الخطاب ص ۳۳، اور اعلام السنن جلد ۲ ص ۸۷ وغیرہ
کتابوں میں مذکور ہے۔

بننا پر مطلق کی تقدیر ہو سکتی ہے۔ ایخ بالکل ایک بے وقعت بات اور مطلب پرستی کے لیے صرف ایک بہانہ ہے جس کو ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے اور یہی بے سود بہانہ قاضی مقبول احمد صاحب نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱) اور انھوں نے اس مطلق قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر محمول کر کے بالکل ایک اور غیر معقول بات کہی ہے جو طفل تسلی سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امام ابو بکر الرازنی فرماتے ہیں کہ یہ روایت جہر اور ستر دونوں پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا۔ ہاں البتہ راوی نے اس کی تاویل یہ کی اور وہ یہ سمجھے کہ یہ جہر سے متعلق ہے۔ (محصلاً احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

فریق ثانی کی طرف سے اس روایت پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کو ان کے جوابات کے ساتھ ملاحظہ کر لیجئے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقی، علامہ حانفی، علامہ ابن حزم، امام نووی اور مبارکپوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ ابن اکیمہ لیشی محمول ہے۔ بنا بریں یہ روایت قابل التفات نہیں۔ (سنن الکبریٰ ص ۱۵۹، کتاب القراءۃ ص ۹۹، کتاب الاعتیاب ص ۹۸، محلی جلد ۳ ص ۲۲۰، شرح منہب جلد ۳ ص ۳۷۸ و بار المنہن ص ۱۵۵ وغیرہ)

جواب: ان اکابر کا یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ اولاً۔ پوری تشریح کے ساتھ ابن اکیمہ کی توثیق نقل کی جا چکی ہے۔ اور باقر میر صاحب و مبارکپوری صاحب موطا کی مسند روایت پر کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابن اکیمہ ثقہ تھے۔ پھر بھی اعتراض کیے جانا انصاف کے بالکل منافی ہے۔

ثانیاً حضرات محدثین کرام کا یہ ضابطہ ہے کہ اگر کسی راوی کی دیگر محدثین توثیق کریں (بلکہ اس سے روایت کرنے والا بھی اگر وہ اہل توثیق ہے ہو خود توثیق کرے) تو اس پر جہالت کا الزام نہیں ہوتا۔ وہ ثقہ اور عادل راویوں کی صف میں آجاتا ہے۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۷۰ و غنیۃ اللمعی ص ۳۵۶، مولانا شمس الحق المنعم مع معجم الصغیر للطبرانی ص ۱۷) اور ابن اکیمہ کو دیگر محدثین بھی ثقہ کہتے ہیں۔ اور امام زہری (جن کا اہل توثیق میں پایہ بہت بلند تھا) بھی توثیق کرتے ہیں۔ اور چار راوی ان سے فن حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ اندر میں حالات ان کو محمول کہتے جانا انصاف کا خون کرنا ہے۔

ثالثاً۔ مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر جہالت کا الزام ہو اور امام ابن

جب ان کی توثیق کر دیں تو جہالت کا الزام رفع ہو جاتا ہے۔ (ابکار المنین ص ۱۳۱) اور ابن اکیمہ کو ابن حبان ثقافت میں لکھتے ہیں۔ غرض کہ کسی راوی سے متعلق ثقہ ثابت اور عادل ہونے کے جتنے قواعد محدثین کرام کے نزدیک ثابت ہیں۔ وہ تمام ابن اکیمہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور جہالت سے نکلنے کا کوئی ضابطہ ایسا نہیں جو ان میں نہ پایا جاتا ہو۔ پھر فریق ثانی ہی انصاف سے فرمادے کہ ابن اکیمہ نے وہ کون سا جرم کیا ہے کہ ان کے لیے جہالت کے چکر سے نکلنے کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ توثیق کا نام ہی جہالت ہے۔ ع

نام ان کا رکھ لیا ہے آسمانِ تحریر میں

الحاصل فن حدیث کے لحاظ سے اس حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے میں مطلقاً کوئی کلام نہیں ہے۔ رہا اس حدیث کا حضرت ابو ہریرہ کے موقف اثر (اقرأ بھا فی نفسک) سے معارضہ کرنا تو اس کی بحث اپنے مقام پر آ جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

دوسرا اعتراض۔ حضرت امام بخاری، امام بیہقی، امام نووی، مولانا ابو عبد الرحمن محمد عبداللہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ فانتهی الناس عن القراءة حين سمعوا ذلك من رسول الله صلى الله عليه وسلم کا جملہ حضرت ابو ہریرہ نے بیان نہیں کیا بلکہ یہ حضرت امام زہری کا بیان ہے۔ اور امام زہری کی عادت تھی کہ مرفوع حدیث میں اپنا قول ملا دیا کرتے تھے۔ اور اس دعویٰ کی دو دلیلیں ہیں۔ اول۔ امام لیث بن سعد اور ابن جریر فانتهی الناس الخ کا ٹکڑا اپنی روایت میں بیان نہیں کرتے۔ دوم۔ امام اوزاعی، امام زہری سے روایت کرتے ہیں کہ

قال الزهري فانعظ الناس فلم يکونوا
يقراءون۔ (جز القراءة ص ۲۳، ابوداؤد
جلد ۱ ص ۱۲۰، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸)

امام زہری نے فرمایا کہ اس قول سے لوگوں نے نصیحت
حاصل کر لی اور امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ جملہ امام زہری کا مدرج ہے اور یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام اوزاعی نے یہ بات تو اچھی طرح محفوظ رکھی ہے (کہ فانتهی الناس الخ امام زہری کا مدرج ہے، مگر شومی قسمت کہ) الا انه لم يحفظ اسنادہ۔ لیکن وہ اس کی سند محفوظ نہیں... رکھ سکے۔

(جزء القراءة ص ۲۳، کتاب القراءة ص ۶۹ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸، شرح منہب ص ۳۷۰، عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۰ وغیرہ واللفظ للبیتقی)

جواب۔ ان حضرات کا یہ کہنا کہ یہ قول امام زہری کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تابعین نے امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی تھی..... محض دفع الوقتی پر مبنی ہے اور اصول کے لحاظ سے یہ غلط ہے۔
 اولاً۔ اس لیے کہ امام بیہقی کا بیان ہے کہ جو جملہ حدیث مرفوع کے ساتھ بیان ہو وہ مرفوع ہی ہوگا۔ الایہ کہ اس کے مدرج ہونے پر قاطع دلیل قائم ہو۔ (تلخیص الحجیر ص ۱۲۶) اور کمزور سند اور محض احتمال سے اور ارجح ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ محض احتمال سے ارجح ثابت نہیں ہو سکتا۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۴۲۵) اور اس کے مدرج ہونے کی کوئی عقلی اور نقلی صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔

ثانیاً۔ امام بیہقی، علامہ حارمی، حافظ ابن حجر اور امام نووی لکھتے ہیں۔ واللفظ لہ۔
 وبتیان الصحیح بل الصواب الذی
 علیہ الفقہاء والاصولیون ومحققوا
 المحدثون انه اذا روى الحديث مرفوعاً
 وموقوفاً او موصولاً ومرسلہ حکم
 بالرفع والواصل لانهما زيادة ثقة
 وسواء كان الرفع والواصل اکثر
 اداقل فی الحفظ والعدد۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۵۷)

ہم بیان کرتے ہیں کہ صحیح بلکہ خالص حق بات یہ ہے
 جس پر فقہاء، علماء اصول اور محقق محدثین متفق ہیں
 کہ جب کوئی حدیث مرفوع اور موقوف روایت
 کی گئی ہو۔ یا موصول اور مرسل بیان ہوئی ہو تو اس
 صورت میں حدیث مرفوع اور متصل ہی سمجھی جائے گی
 چاہے رفع اور وصل کرنے والے حفظ اور عدد میں زیادہ
 ہوں یا کم حدیث بہر حال مرفوع ہوگی۔

علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی ثقہ راوی سے معاً دو مسئلوں میں اختلاف پیدا ہو کہ

لہ کتاب القراءة ص ۴۶

لہ کتاب الاعتقاد ص ۱۲

لہ تلخیص الحجیر ص ۱۲۶

لہ شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶۔ اور امام نووی نے جلد ۱ ص ۲۸۲ و جلد ۲ ص ۴۷۲ و جلد ۳ ص ۴۰ میں بھی
 اس کا ذکر کیا ہے اور جلد ۲ ص ۲۸۲ میں حضرت امام بخاری اور امام مسلم کا خاص طور پر نام ذکر کیا ہے۔

کسی وقت وہ موصول بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا کسی وقت وہ مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت موقوف۔ تو صحیح قول کی بنا پر اس کے موصول اور مرفوع ہونے کا حکم کیا جائے گا نہ کہ مرسل اور موقوف ہونے کا۔ (شرح الفیہ جلد ۱ ص ۸۳)

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ اذا کان الواصل ثقة فهو مقبول۔ (دلیل الطالب ص ۲۴)

اور نیز فرماتے ہیں کہ

اختلفت في رفع ووقف اوست قارح در حجیت نہ باشد چہ رفع زیادت است

(ایضاً ص ۱۳۳)

اور نیز لکھتے ہیں کہ قال شیخنا وبرکتنا الشوکافی وهو الحسن اذا جاءت الزیادة من طریق الثقة۔ (ایضاً ص ۴۶۱) امام زہریؒ کی ثقاہت اور عدالت بھی بالاتفاق مسلم ہے۔ اس لیے اس طے شدہ قاعدہ کے رو سے یہ جملہ بھی مرفوع ہی ہو گا۔

ثالثاً۔ امام ابو داؤدؒ، ابن ابی السرحؒ سے روایت کرتے ہیں وہ معمرؒ سے اور وہ امام زہریؒ

سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال ابو ہریرۃ فانتمی الناس۔ (ابو داؤد جلد ۱) کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا۔ لوگوں نے قرأت ترک

کر دی تھی۔

(ص ۱۲۰)

۱۔ ابن ابی السرحؒ کا نام احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن السرح تھا۔ محدث علی بن الحسن بن خلف کا بیان ہے

کہ وہ ثقہ ثبت اور صالح تھے۔ ابو زرہؒ اور ابو حاتمؒ (وہ بائیں بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن

یونسؒ ان کو فقیہ اور من الصالحین الا ثبات کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب

جلد ۱ ص ۶۳) جب یہ ثقہ اور ثبت ہیں تو امام ابو داؤدؒ کے باقی چار اساتذہ اگر اس کو نقل نہیں کرتے تو نہ

کہیں زیادت ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام کا یہ عذر رنگ بھی قابل سماعت نہیں

ہے اور اسی طرح لیث بن سعد وغیرہ کا اس جملہ کو نکال دینا اور امام زہریؒ کا سانس ٹھونسنے یا کھانسی

وغیرہ کی وجہ سے اس کو آہستہ پڑھنا بھی ہرگز نہ اور راجح کی دلیل نہیں ہے۔

۲۔ معمر بن راشدؒ کو علامہ ذہبیؒ ابو امام الحجہ احد الا علوہم اور عالم یمن لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۴۸)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۶) امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا گیا کہ امام

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس صحیح روایت سے معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے۔ نہ یہ کہ امام زہریؒ کا مدرج ہے۔ جب معمرؒ کا اثبب الناس فی الزہریؒ ہونا محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے۔ تو امام لیث بن سعد اور ابن جریرؒ کا اس جملہ کو نہ نقل کرنا اس کے مدرج ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس میں صحیح اور صواب بات معمرؒ ہی کی ہوگی خصوصاً جبکہ وہ مثبت بھی ہیں۔

رابعاً۔ گو امام اوزاعیؒ بہت بڑے محدث فقیہ اور امام تھے۔ لیکن کتب الرجال میں اس کی تصریح موجود ہے کہ امام زہریؒ سے جو روایت وہ کرتے ہیں وہ حجت نہیں ہو سکتی حافظ ابو عمر بن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کی امام زہریؒ اور یحییٰ بن ابی کثیرؒ سے جملہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔ (کتاب الانصاف ص ۲۰۱ و کتاب العلم ص ۲۰۱) امام ابن معینؒ کا بیٹا ہے کہ اوزاعیؒ فی الزہریؒ لیس بذک (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۴۱) کہ امام اوزاعیؒ زہریؒ سے روایت کرنے میں قابل اعتبار نہیں ہیں۔ امام یعقوب بن شیبہؒ کا بیان ہے کہ امام اوزاعیؒ ثقہ اور مثبت تھے۔ لیکن انکی زہریؒ سے جملہ روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ (ایضاً) یہ راوی ضعیف نسبتاً نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴۰ میں لکھا ہے۔ اور دعوہ کو دیا ہے بلکہ یہ محدثین کی تصریح کے مطابق زہریؒ کی روایت میں حقیقتہً ضعیف ہے۔ انصاف شہر ہے کہ امام معمرؒ کی روایت کو (جو اثبب الناس فی الزہریؒ ہیں) چھوڑ کر امام اوزاعیؒ کی روایت کو (جن کی زہریؒ

(بقیہ پچھلا صفحہ) زہریؒ کے تلامذہ میں سے زیادہ مثبت کون ہے؟ فرمایا معمرؒ اثبب الناس فی

الزہریؒ۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۵) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ معمرؒ اثبب الناس فی الزہریؒ۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۹) لہذا زہریؒ کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند روایت صرف معمرؒ راشد کے طریق ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس متصل حدیث کو مرسل کہنا، جیسا کہ مؤلف خیر الکلام ص ۴۳۹ میں کہا ہے بالکل باطل اور مردود ہے۔ اور قاضی مقبول احمد صاحب نے اسے معروف صحابی اور فہم صحابی کہہ کر غلطی چاہی ہے جو انتہائی جہالت ہے۔ یہ فہم صحابی نہیں یہ روایت حدیث ہے کہ جب آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو اس کے نتیجے میں لوگ ہر قسم کی قرأت سے بالکل باز آ گئے۔ یہ روایت ہے نہ کہ فہم صحابی۔ اس لیے حدیث بالکل صحیح اور قابل قبول ہے۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

کے طریق سے تمام روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔) کیونکہ ترجیح دی جاسکتی ہے؟ امام بیہقی پر
 امام اوزاعیؒ کی یہ نوازش ہوتی ہے کہ اتنا تو وہ یاد رکھ سکے ہیں کہ یہ جملہ مرفوع حدیث میں نہیں ہے۔
 مگر سند محفوظ نہیں رکھ سکے۔ امام بیہقی علیہ الرحمۃ کو کیا مصیبت درپیش ہے کہ وہ ان لایعنی اور
 بے سند باتوں اور تار عنکبوت سے معجز کی صحیح روایت کو رد کر کے اصول شکنی کرتے ہیں؟
 مگر یہ سچ ہے ایک غلطی کے درست کرنے کے لیے متعدد غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

خامساً۔ اگر یہ جملہ بالفرض حضرت ابوہریرہؓ کا نہ ہو بلکہ امام زہریؒ کا ہو۔ تب بھی کامیابی
 اور فتح جمہوری کی ہوگی۔ فریق ثانی کو بغیر صرمان نصیبی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ شیخ الاسلام ابن
 تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض فانتہی الناس الخ کو امام زہریؒ کا مدرج ہی تسلیم کر لیا جائے۔
 تب بھی یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وزنی دلیل ہوگی کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں
 ہے کیونکہ امام زہریؒ اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ اگر امام
 کے پیچھے قرأت کرنا ضروری ہوتا تو یہ مسئلہ امام زہریؒ سے کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟ جب امام
 زہریؒ یہ فرماتے ہیں کہ جمہری نمازوں میں لوگوں نے قرأت ترک کر دی تھی۔ تو یہ اس بات کی
 کھلی اور معقول دلیل ہے کہ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے اور اسی
 پر امام موصوفؒ نے ان کو عامل پایا (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۵)

سادساً۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ فریق ثانی اس جملہ کو امام زہریؒ کا مدرج تسلیم کرتا ہے۔

اگر یہ جملہ (فانتہی الناس الخ) سرے سے اس حدیث میں نہ ہو اور روایت حالی لا انازع
 القرآن پر ہی ختم ہو جائے (جیسا کہ امام لیث بن سعدؒ وغیرہ کی روایت یہیں ختم ہوتی ہے) تو بھر بھی
 یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ کیونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرنا والا
 لہ مثلاً یہ کہ صحیح اور ضعیف حدیث کا تعارض ہو تو صحیح قابل اخذ اور ضعیف متروک ہوگی۔ ثقہ کی زیادت
 مقبول ہوگی۔ واصل اور رافع کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ مثبت کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ امام معمرؒ مثبت
 الناس فی الزہری رح ہیں۔ امام اوزاعیؒ فی الزہری لیس بذک وغیرہ وغیرہ تمام
 طے شدہ قواعد کو محض ایک غلط بات کو درست کرنے کے لیے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ فوا عجبا و

صرف ایک ہی شخص تھا اور اس کو بھی آپ نے گوارا نہ فرمایا۔ پہلے آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فوراً سوال کیا۔ اور پھر اس شخص کے اقرار کرنے کے بعد مالی انازع القرآن کے جملہ سے اس کی قرأت کو ناپسند کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ فرمائی اگر فانتھی الناس کا جملہ سرے سے نہ ہو تو کیا اس تنبیہ کے بعد بھی اس کا حضرات صحابہ کرام سے احتمال ہے کہ وہ باقاعدہ امام کے پیچھے قرأت کرتے رہے؟ حاشا وکلاً۔ راقم کہتا ہے کہ اگر اس حدیث میں اور کچھ بھی نہ ہو تو صرف یہی جملہ ہوتا۔ ہل قرأ معی منکم احد تو پھر بھی یہ جہوز کی دلیل کے لیے کافی ہوتا، حالانکہ جملہ فانتھی الناس حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے، جیسا کہ بسند صحیح آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اصلی بات یہ ہے کہ امام زہریؒ کے فانتھی الناس النخ کے مضمون کے سمجھنے میں فیرت ثانی کو غلطی واقع ہے جس کے سبب انہوں نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور ایک بے بنیاد لے آپ نے ہل قرأ ارشاد فرمایا ہے۔ ہل جہوز نہیں فرمایا جس سے سورۃ فاتحہ کی قرأت ہر طرح سے ممنوع ہوگی۔ اس لیے ہل قرأ کو ہر پر حمل کرنا یا ہل قرأ کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) یقیناً باطل اور مردود ہے اور محل النصوص علی ظہور اہرہا کے خلاف ایسا مطلب مراد لینا ہرگز صحیح نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر پڑھنے والے نے آہستہ قرأت کی تھی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے علم ہوا؟ تو یہ بڑی سطحی قسم کی بات ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آپ کو نماز کی حالت میں ایک مخصوص کیفیت حاصل تھی جس سے آپ مقتدیوں کے رکوع و سجود اور خشوع کو ملاحظہ کر لیتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۸۱) ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے جس کی وجہ سے ہم پر قرآن کریم کی قرآۃ ملتبس ہو جاتی ہے (نسائی جلد ۱ ص ۱۸۱) حافظ ابن کثیرؒ اسی مضمون کی ایک اور روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسناد حسن و متن حسن۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ مقتدیوں کے وضو کے نقصان سے متاثر ہوتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز سے (صحیحہ و فساداً) وابستہ اور متعلق ہوتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۲۱) لہذا مقتدی کی آہستہ قرأت سے آپ کا متاثر ہونا بعید نہ تھا۔ اس لیے نماز کی حالت میں آپ کی طبیعت لطیف تر اور شفاف تر ہو جاتی تھی۔

۳ امام زہریؒ مرفوع حدیث بیان کر رہے تھے جس میں فانتھی الناس النخ کا جملہ بھی تھا۔ امام موصوفؒ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور پادروا بات کی درستی کے لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہیں۔

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے امام کے پیچھے صرف جہری نمازوں میں قرأت کی ممانعت آتی ہے۔ حالانکہ تم ستری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے منکر ہو۔ لہذا تمہارا دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے۔ (تحقیق الکلام وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے شاگرد بکثرت تھے۔ ایک نے یہ جملہ براہ راست امام زہریؒ سے نہ سنا تو رفیق سبق سے پوچھا کہ امام زہریؒ نے کیا فرمایا تھا۔ وہ بولے فانتھی الناس الخ کہنا تھا۔ اس سے بعض کو یہ دھوکہ ہوا کہ شاید یہ جملہ امام زہریؒ کا مدرج ہے۔ حالانکہ یہ جملہ بھی مرفوع حدیث میں موجود تھا۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۳ و اعلام السنن جلد ۲ ص ۸۸) چنانچہ روایت یوں ہے کہ

وقال عبد الله بن محمد الزهري
من بينهم قال سفیان وتكلم الزهري
بكلمة لمراسمها فقال معمراته
قال فانتھی الناس الخ
ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، کتاب القراءة ص ۹۹، سنن
الکبریٰ ۲ ص ۱۵۸

اپنے ساتھیوں میں سے عبد اللہ بن محمد نے
یہ بیان کیا کہ سفیان نے فرمایا کہ امام زہریؒ نے ایک
کلمہ بیان کیا لیکن میں خود ان سے نہ سن سکا۔ میں نے
پوچھا کہ انھوں نے کیا فرمایا ہے؟ امام معمر نے فرمایا کہ زہریؒ
نے فانتھی الناس الخ کا جملہ بیان کیا ہے۔

اور کتب احادیث میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً زہریؒ کا بیان ہے کہ ابو الزہریؒ حدیث بیان کر رہے
تھے۔ ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ وہ جملہ مجھے میرے رفیق درس یاسین زیادؒ نے بتایا۔ (طیالسی ص ۲۴۰) حضرت جابر بن
سمرہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیث ارشاد فرما رہے تھے لیکن ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے
رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتلایا (ترمذی جلد ۲ ص ۴۳، ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۲، طیالسی ص ۱۹۶) حضرت
عبد اللہ بن قرظ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی مگر ایک خفیف سا کلمہ میں نہ سن
سکا۔ میں نے پہلو میں اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتلایا (مسند رک جلد ۴ ص ۲۲۱) حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ
فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی لیکن ایک جملہ اہل مجلس کے رونے اور
شور و غل کی وجہ سے میں نہ سن سکی۔ میرے قریب جو صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا
تو انھوں نے وہ جملہ مجھے بتلایا۔ (نسائی جلد ۴ ص ۲۲۴ و مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۲۶) اور یہ تمام جملے مرفوع حدیث کے ساتھ تھے۔
یہی حال فانتھی الناس الخ کے جملہ کا ہوا ہے۔

جواب: یہ ٹھیک ہے کہ جہر اہل اسلام تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کے عدم جواز کے قائل ہیں لیکن یہ دعویٰ کس نے کیا ہے کہ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے عدم جواز قرآن کی دلیل صرف یہی ایک حدیث ہے۔ ہاں جہری نمازوں میں عدم جواز قرآن خلف الامام کی ایک دلیل یہ روایت بھی ہے باقی سری نمازوں کے لیے قرآن کریم کی آیت۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انس بن مالک کی حدیث واذا قرء فانصتوا پہلے بیان ہو چکی ہے۔ بقید دلائل اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نقد تو وصول کر لیجئے۔ اور ادھار کے منتظر رہیے۔ دنیا بامید قائم است۔

باقی امام بیہقی وغیرہ کا ابن اکیمہ کی روایت کا علاء بن عبدالرحمن کی روایت سے معارضہ کر کے علاء بن عبدالرحمن کی روایت کو ترجیح دینا سو یقیناً مردود ہے، جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز اور یہ بات بھی اپنے مقام پر انشاء اللہ تعالیٰ باحوالہ آئے گی کہ حضرت ابو ہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن نہیں کرتے تھے۔ لہذا مولف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا فتویٰ جہری نمازوں کو بھی شامل ہے بالکل بے کار ہے۔

پانچویں حدیث۔ امام عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے والد ماجد امام احمد بن حنبل نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یعقوب بن ابراہیمؓ نے بیان کیا۔ وہ محمد بن عبداللہ بن مسلم سے روایت کرتے ہیں لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الحافظ اور الحجۃ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۳) امام احمد کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۱۱ علامہ ابن معین اور علیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعد ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۳۸) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۰۴) لہ امام احمد ان کو صالح الحدیث اور لا باس بہ کہتے ہیں۔ ابن معین ایک روایت میں ان کو صالح کہتے ہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ ان کی روایتیں لکھی جاسکتی ہیں۔ امام ابو داؤد ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ مجھے ان کی کسی حدیث میں خرابی معلوم نہیں اور میں نے ان کی کوئی حدیث منکر نہیں دیکھی۔ واقفی ان کو کثیر الحدیث اور صالح کہتے ہیں۔ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں (اور یہ بالکل ایک ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کے راوی میں اگر کوئی کمزوری ہو تو قابل برداشت ہوتی ہے جبکہ مقابلہ میں قی نقد تراویح صحیح بخاری میں ان کی دو حدیثیں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱) امام ذہبیؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

وہ امام زہری سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے عبدالرحمن بن ہریر نے بیان کیا۔
وہ عبداللہ بن مجہد سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا کہ

هل قرأ احد منكم معي انفا قالوا نعم
قال اني اقول مالي انا زع القرآن فانهي
الناس عن القراءة معي قال ذلك
(مسند احمد جلد ۵ ص ۳۲۵)

کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی
ہے؟ حضرات صحابہ کرام نے عرض کیا جی حضرت قرأت
کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تب ہی تو میں (دل
میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم قرأت میں
منازعت اور کشمکش کیوں کی جا رہی ہے؟ آپ کا
یہ ارشاد جب سنا تو لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت
ترک کر دی۔

امام ابوبکر مہتممی (المتوفی ۸۸ھ) اس حدیث کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ رواہ احمد
ورجال احمد رجال الصحيح۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۰۹) یہ روایت امام احمد نے بیان کی
ہے اور امام احمد کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ اس کے آگے علامہ مہتممی نے
امام بزار کا وہ اعتراض نقل کیا ہے جو عنقریب آ رہا ہے۔ الغرض سند کے لحاظ سے یہ روایت
بھی صحیح ہے۔ اور اس میں جہری نماز کی کوئی قید بھی مذکور نہیں ہے۔ لہذا یہ روایت جہری اور
سری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ گویا اس روایت کے پیش نظر حضرات صحابہ کرام نے آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأت ترک کر دی تھی۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن
جلد ۳ ص ۵۲ بلجصاص الرانمی) اور اگر اس روایت میں جہری قید بھی ہو جیسا کہ مجمع الزوائد جلد ۲
ص ۱۱۱ امام ذہبی ان کو الحافظ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۹۱)

علامہ مجہد ان کی والدہ کا نام تھا (نومی ص ۲۱۱، طبقات ابن سعد جلد ۲، قسم دوم صفحہ ۳) والد کا نام
مالک تھا۔ (صحیح مسلم اص ۲۱) مدینہ سے تیس میل دور مقام ریم میں متوطن ہو گئے تھے (استیعاب
جلد ۱ ص ۳۵۱) اور جلیل القدر و فضلاء صحابہ میں ان کا شمار تھا۔ (اصابہ جلد ۲ ص ۱۳۱) المتوفی ۵۵ھ
یہ روایت سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸ اور کتاب القراءة ص ۹۵ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

کی ایک روایت میں ہے صلیٰ صلوة یجہر فیہا الخ تب بھی جہری نمازوں میں ترک قرآۃ خلف الامام پر سابق روایت کی طرح یہ صریح دلیل ہے۔ اس روایت پر امام بزاز اور امام بیہقی وغیرہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں محمد بن عبداللہ بن مسلم نے خطا کی ہے۔ اصل روایت عن ابن اکیم عن ابی ہریرۃ الخ تھی۔ لیکن انھوں نے عن ابن جحینہ کر دی ہے۔ اور پھر محض لفظوں کے ذریعہ لوں رعب جمانے کی سعی کی ہے کہ ہذا اخطاؤ لوشک فیہ ولا ارتیاب۔ (سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) لیکن محض ظن اور اٹکل سے ایسے زویعی اور بیکار اعتراض کون سنتا ہے؟ کیا ابن اکیم اور حضرت ابو ہریرہ کے علاوہ عبداللہ بن جحینہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ترک قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرنے کے مجاز نہیں تھے؟ اور کیا امام احمد بن حنبل اور علامہ بیہقی وغیرہ کو یہ غلطی اور خطا معلوم نہ ہو سکی؟ نہ تو اس میں اندراج کی غلطی سے انتقال سند ہے جیسا کہ مولف خیر الکلام نے ص ۱۴۴ میں کہا ہے اور نہ یہ روایت ضعیف ہے۔ وعلی سبیل التذلل اگر یہ روایت عن ابن اکیم عن ابی ہریرہ ہی ہو۔ تب بھی یہ صحیح روایت پہلی روایت کی مؤید ہوگی اور اس کا صحیح ہونا آپ معلوم ہی کر چکے ہیں۔ حالانکہ یہ روایت عبداللہ بن جحینہ ہی سے مروی ہے۔ امام مہر اور سفیان بن عیینہ کی زہری عن ابن اکیم الخ کی روایت اپنے مقام پر صحیح ہے۔ نہ تو دونوں میں تعارض ہے اور نہ اختلاف۔ رہا اس روایت میں قرآ کو جہر پر حمل کرنا یا اس میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحۃ پر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقی نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹) تو محض فرسودہ اور بے حقیقت تاویل ہے۔ اور خالص سینہ زوری پر محمول ہے۔

فما محہ اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔

کہ علامہ بیہقی وغیرہ کہتے ہیں کہ اس روایت کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔ اگر اس روایت کو ابن اکیم سے تسلیم کیا جائے تو ابن اکیم بخاری کے راوی نہیں ہیں۔ لہذا ان کا رجال رجال الصحیح کہنا ہی امام بزاز کی تردید کے لیے کافی ہے اور اپنے وقت میں اگر علامہ بیہقی کو صحت اور سقم کی پرکھ نہیں تو اور کس کو تھی؟ مولف خیر الکلام کا بیہقی پر اعتراض بے سود ہے اگرچہ سند احمد کی بعض روایتیں ضعیف و کمزور ہیں

مگر یہ سند بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔

چھٹی حدیث : امام بزارؒ فرماتے کہ ہم سے محمدؐ بن بشرؒ اور عمرو بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمّدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یونس بن ابی اسحاقؒ نے اپنے باپ سے بیان کیا۔ وہ ابو الاحوصؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا :

۱۔ صاحب منہاجہ بن عمرو بن عبدالخالقؒ (المتوفی ۲۹۲ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور علامہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۴)

۲۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو حافظ اور عجلیؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتم صدوق اور نسائی لو باسنہ کہتے ہیں۔ مسلم بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور مشہور کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ ان کو من الحفاظ والاشبات کہتے ہیں ابن حبان ثقات میں کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۶۷) عمرو بن علیؒ کو امام ابو زرعہؒ من فرسان الحدیث اور دارقطنیؒ من الحفاظ کہتے ہیں۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ مسلم بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۸۷)

۳۔ ان کا نام محمد بن عبداللہ بن الزبیر تھا۔ امام ابن زبیرؒ ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ بندار کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ محدث ابو زرعہؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام ابو حاتمؒ ان کو حافظ الحدیث کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لیس بہ بأس ابن قانع ثقہ اور ابن سعدؒ ان کو صدوق اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۲۵۵)

۴۔ امام ابن معینؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ حسن الحدیث اور نسائیؒ لو باسنہ کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو جائز الحدیث کہتے ہیں اور ابن شہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۳ ص ۳۳۳) ۵۔ ابو اسحاق السبئیؒ علامہ ابن ناصر الدینؒ ان کو بڑے حفاظ اور ائمہ دین میں شمار کرتے ہیں (شذرا الذہب جلد ۱ ص ۱۴۵) امام نوویؒ لکھتے ہیں ان کی توثیق جلالت اور شمار پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسما جلد ۲ ص ۱۶۷) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰۸) امام احمد بن معینؒ، نسائیؒ، عجلیؒ اور ابو حاتمؒ وغیرہ

سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۶۵)

۶۔ ان کا نام عوف بن مالک بن نضلہ تھا۔ امام ابن معینؒ، ابن سعدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۸ ص ۱۶۹) حضرت ابن مسعودؒ جلیل القدر صحابی تھے جن کے کچھ مناقب بائبل میں بیان ہو چکے ہیں۔

کانوا یقرءون خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال خلطتم علی القرآن - کہ لوگ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ
 علیہ وسلم فقال خلطتم علی القرآن - کہ تم نے مجھ پر قرآن مجید کی قرأت خلط ملط کر دی ہے۔
 (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۵ و طحاوی جلد ۱ ص ۱۶۴)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے پیچھے قرأت کرنے والوں کی قرأت کو گوارا نہ
 فرمایا اور مخصوص لہجہ میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی اور اس میں چونکہ جہری نماز
 کی قید نہیں۔ اس لیے سب نمازوں کو یہ روایت شامل ہوگی۔ اور آہستہ قرأت کرنے بلکہ
 مقتدیوں کے عدم تکمیل وضو سے آپ کا متاثر ہونا پہلے نقل ہو چکا ہے۔ علامہ بیہقیؒ لکھتے
 ہیں کہ یہ روایت مسند احمد، مسند ابویعلیٰ اور مسند بنزار میں مروی ہے۔ اور مسند احمد کی روایت
 کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) علامہ مار دینیؒ لکھتے ہیں
 کہ و ہذا سند جید کہ یہ عمدہ اور کھری سند ہے۔ (المجہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۲) اور قرأت
 چونکہ مطلق ہے اس لیے سورہ فاتحہ اور قرآن کریم کی جملہ سورتوں کی قرأت کو شامل ہے کیونکہ
 آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں فرمایا۔ (احکام القرآن
 جلد ۳ ص ۵۱)

اس روایت میں قرآن کو جہر پر یا قرأت کو ما زاد علی الفاتحة پر بجز مجرول کرنا جیسا کہ امام
 بیہقیؒ کی تقلید میں کرنے والوں نے (جن میں قاضی مقبول احمد صاحب بھی ہیں) کیا ہے بالکل
 غلط ہے ایسی لایعنی تاویلات کو کون مانتا ہے؟

بعض طرق میں اس کا ذکر آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ آپ کے پیچھے جہر سے قرأت کرتے تھے
 مگر فی جہر ون کے الفاظ سندا و معناً محل نظر ہیں۔ یہ روایت دارقطنی جلد ۱ ص ۳۰ میں
 ہے، لیکن پوری سند یوں ہے: عن یونس بن ابی اسحاق عن (احوص) الخ اور گو
 تعلق المنعنی میں کہا ہے: اسنادہ حسن مگر توف خیر الکلام کے اصول سے یہ صحیح نہیں ہے
 وہ لکھتے ہیں کہ

اس کی سند میں ابواسحاق سبیعیؒ ہیں حافظ ابن حجر نے ان کو تیسرے طبقہ کے مدلسین

میں شمار کیا ہے۔ طبقات المدلسین ص ۱۲۳ اور اس طبقہ کی روایات بدون تصریح سماع مقبول نہیں ہوتیں.... الخ (خیر الکلام ص ۲۶۸) بقول ان کے یہ نہ تو صحیح ہے اور نہ مقبول علاوہ انہیں امام احمد فرماتے ہیں کہ یونسؑ کی اپنے والد سے روایت ضعیف ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳۳) اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۹۰ میں لکھا کہ بعض اہل علم ابواسحاق کو ان کے اختلاط کی وجہ سے چھوڑ چکے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۹۲) لہذا متروک کی روایت کا کیا اعتبار۔ کم از کم ان کو اپنے پیش کردہ اصول کا خیال تو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

ساتویں حدیث: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالحسن علی بن احمد حامی مقرئ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن سلیمان فقیہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم بن ہشیم نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے آدمؑ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

۳۲۹
 علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ صادق دیندار، فاضل اور حسن الاعتقاد تھے۔ (بغدادی جلد ۱) مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۲۲ میں یہ کہا ہے کہ ابن ابی الفوارس کہتے ہیں ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔ میزان جلد ۲ ص ۲۱۷، اور لسان المیزان جلد ۲ ص ۱۹۲، مگر یہ ان کی جمالت ہے کیونکہ جن کی تضعیف ابن ابی الفوارس نے کی ہے وہ علی بن احمد بن ابی قیس المقرئ الرفاعی.... الخ ہیں جن کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوئی ہے۔ دیکھئے لسان جلد ۲ ص ۱۹۲ وغیرہ اور زبیر حبیب سند میں علی بن احمد بن عمر بن حفص ابوالحسن المقرئ المعروف بابن الحامی ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی (دیکھئے بغدادی جلد ۱ ص ۳۳۳) اس لیے مؤلف خیر الکلام کا ص ۲۲۲ میں یہ کہنا کہ پھر یہ حدیث بالکل منکر شاذا اور ضعیف ہے۔ انتہی بلفظہ قطعاً باطل اور مردود ہے۔

۳ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الفقیہ اور شیخ العلماء لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۶۹) امام بیہقی لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بحوالہ الجوزی النقی جلد ۱ ص ۱) دارقطنیؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۱) ابن عدیؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۲۳) خطیبؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۲) امام ابو داؤد، ابن معینؒ اور حلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور (باقی اگلے صفحہ پر)

ہم سے ابن ابی ذئب نے بیان کیا۔ وہ محمد بن عمرو سے اور وہ محمد بن عبدالرحمن بن ثوبان سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ما كان من صلوة يبهر فيها الامام
 جس نماز میں امام جہر سے قرأت کرتا ہو۔
 بالقراءة فليس لاحد ان يقرأ معه۔
 اس نماز میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ امام کے
 (کتاب القراءة ص ۹۹، ص ۱۲۷ طبع اشرف پریس) ساتھ قرأت کرے۔

یہ روایت بھی اس بات کو واضح گف کرتی ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے کسی مقتدی کو اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کرے۔ امام بیہقی نے قرأت سے جہر اور ما زاد علی الفاتحة کی قرأت مراد لی ہے۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مامور من اللہ تھے۔ اور آپ کو فاصدع بہاتوءہم کا حکم تھا۔ مطلق قرأت اور سورۃ فاتحہ کی مقید قرأت میں نیز نفس قرأت اور جہر بالقراءة میں آپ اچھی طرح فرق جانتے تھے۔ پھر نہ معلوم آپ نے اتنی رازداری اور کنایہ سے کام کیوں لیا؟ آپ نے یہ کیوں نہ فرمادیا کہ فلیس لاحد ان يبهر معه اور یہ کیوں نہ فرمادیا: فلیس لاحد ان يقرأ معه غیر سورۃ الفاتحة آپ کے الفاظ تو یہ ہیں فلیس لاحد ان يقرأ معه کسی کو یہ حق نہیں کہ امام کے ساتھ کسی قسم کی قرأت کرے۔ آپ کے مطلق حکم کو بلا دلیل مقید کر دینا (بقیہ گذشتہ صفحہ) ماہون کہتے ہیں۔ نسائی لا بائس بہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں

(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۲)

لہ ثقہ، فقیہ اور فاضل تھے۔ (تقریب ص ۳۲۹)

لہ امام ابو زرعہ، نسائی اور ابن سعد ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۳۷۴)

لہ ابن سعد، ابو زرعہ، نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم کا بیان ہے کہ وہ تابعین میں تھے اور ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۹ ص ۳۷۴) حضرت ابو ہریرہ مشہور صحابی تھے۔ غرضیکہ اس روایت کا ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے۔

اور مطلق قرأت کو مقید قرأت پر بغیر کسی حجت کے حمل کرنا سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک اور بات اس روایت کے بارے میں امام بیہقیؒ سے نکلی ہے، وہ بھی بہت ہی عجیب ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت منکر ہے۔ اگر کوئی روایت صرف امام بیہقیؒ کے منکر کہنے سے منکر ہو جایا کرتی ہے تو پھر ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن اصول حدیث کے لحاظ سے یہ روایت کسی طرح منکر نہیں ہے۔ حضرات محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں منکر وہ روایت ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہو جو فاحش غلطی اور کثرتِ خطا کا مرتکب ہوا ہو۔ یا اپنے سے زیادہ کسی ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ (دیکھیے شرح بختہ الفکر ص ۵۵ و ۵۹ وغیرہ) لیکن اس روایت کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور اس روایت میں کوئی ایسا راوی موجود نہیں جو کسی ثقہ راوی کی مخالفت کر رہا ہو۔ اگر امام بیہقیؒ کی مراد اس روایت کو علامہ ابن عبدالرحمنؒ کی روایت کے خلاف بتانا ہے۔ تو اس کی حقیقت بھی عنقریب آشکارا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز اندریں حالات اس کو منکر کہنا اصول کے خلاف ہے جو کسی طرح مسموع نہیں ہو سکتا۔ اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ یہ نقل ہو چکا ہے کہ امام بیہقیؒ کا کوئی قول بلا دلیل حجت نہیں ہو سکتا۔ مؤلف خیر الکلام (ص ۳۳۶ میں) لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے طبیعت نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ جو صحیح روایات حضرت ابو ہریرہؓ سے وارد ہیں یہ بوجہ ان کے خلاف ہونے کے شاذ ہے۔۔۔ الخ اگر امام بیہقیؒ کی طبیعت صحیح حدیث کو نہیں مانتی تو نہ مانے۔ صحیح حدیث کو ماننے والے بھی دنیا میں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں اور حضرت ابو ہریرہؓ سے جہری نازل میں کوئی روایت خلف الامام قرأت کی ثابت نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان ہو گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) لہذا خلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آٹھویں روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو بکر بن اسحاق الفقیہ اور ابو بکر بن عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ امام ابو عبد اللہؒ کا ترجمہ باب اول میں گزر چکا ہے۔ ابو بکر بن اسحاق الفقیہ اور ابو بکر بن عبد اللہؒ کی سند ڈبل ہے مگر مزید تسلی اور تسکین کے لیے (کیونکہ ابو بکر الفقیہ تو مشہور امام ہیں) ابو بکر بن عبد اللہؒ کا ترجمہ سن لیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام، الاحمد، المعجل اور محدث نیشاپور لکھتے ہیں۔ (المتوفی ۳۸۸ھ) (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲)

ہیں کہ ہم سے احمد بن نضر بن سعد المرندھی اور حسن بن سفیان نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے فضیل بن عبد الوہاب اور محمد بن خالد بن عبد اللہ الواسطی نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے خالد بن عبد اللہ الطحان نے بیان کیا۔ وہ عبد الرحمن بن اسحاق سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ سعید مقبری سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ سے وہ فرماتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لے سنڈکی یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ اور حسن بن سفیان کا ترجمہ باب اول میں امام زہری کے اثر میں نقل ہو چکا ہے کہ وہ جلیل القدر امام تھے۔

یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ امام ابن معین کہتے ہیں کہ فضیل ثقہ اور لا بأس بہ تھے۔ محدث عبد الرحمن اپنے والد سے ان کی توثیق نقل کرتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۳۹۳) ابو حاتم ان کو صدوق اور ابو بکر بن اریس بہ لا بأس کہتے ہیں، ابن جبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۷۹۳)

امام احمد بن سعد، ابو زرعہ اور نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو ثقہ اور صحیح الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذی ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ محمد بن عمار ان کو اثبوت کہتے ہیں۔ ابن جبان ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً ص ۳۰۰) امام احمد ان کو من افاضل المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۷۹۳) علامہ ذہبی ان کو حافظ اور الامام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۳۹)

امام احمد ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن معین ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن شیبہ صالح اور یعقوب بن سفیان لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم حسن الحدیث کہتے ہیں۔ ابو داؤد ثقہ کہتے ہیں۔ نسائی (جلد ۱ ص ۱۰۱) انہیں لیس بہ لا بأس کہتے ہیں۔ ابن خزیمہ بھی لیس بہ لا بأس کہتے ہیں۔ ابن عدی صالح الحدیث اور ساجی صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعد ان کی توثیق کرتے ہیں اور ابن جبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ ترمذی کہتے ہیں کہ امام بخاری نے ان کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۱۳۸) مؤلف خیر الکلام ص ۵۵ میں لکھتے ہیں کہ ابن معین نے ان کو ضعیف کہا اور امام احمد نے منکر الحدیث کہا یہ جوہر ہیں اگرچہ بہم ہیں مگر ان سے راوی مرتبہ سے گریز کرنا چاہیے (محصلہ) الجواب: امام ابن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے اور امام احمد نے ان کو صرف ابو الزناد کی روایت میں منکر کہا ہے اور یہ روایت سعید مقبری سے ہے اور لطف یہ ہے کہ خود مؤلف مذکور جوہر کو بہم کہتے ہیں اور خیر الکلام ص ۵۵ میں لکھا ہے کہ پھر اس پر جوہر میں کمی نہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کل صلوة لوقد فیہا بام الکتاب فی

خداج الاد صلوة خلف امامہ

(کتاب القراءۃ ص ۱۳۵، طبع دہلی دص ۱۷۱)

(طبع اشرف پور میں)

کہ ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو
وہ نماز ناقص ہوتی ہے، مگر ماں وہ نماز اس سے مستثنیٰ
ہے جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

اس روایت میں خلف امام اور امام الکتاب کی قید خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئے۔ اور یہ بھی کہ آپ
نے تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کو ضروری اور لازم ٹھہرایا ہے۔ مگر مقتدی کے لئے اس
کی قرأت کی مطلقاً گنجائش نہیں چھوڑی اور امام بیہقیؒ وغیرہ جہاں قرأت سے مانا دعویٰ
الفاتحہ مراد لے کر گلو خلاصی کیا کرتے ہیں۔ یہ روایت ان کی اس تاویل کو بھی باطل ٹھہراتی ہے۔
کیونکہ اس میں خاص طور پر امام الکتاب کی قید موجود ہے جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اور اس صحیح
روایت سے بھی فریق ثانی کا یہ مطالبہ آسانی سے پورا ہو جاتا ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ
پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کرو۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مفسر نہیں محدثین اور اصول فقہ والوں کے ہاں اس قسم کی جرح مقبول نہیں ہوتی اور امام
احمد کی اصطلاح منکر الحدیث کے بارے میں بالکل جدا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ان ابن حنبلؒ
یطلق علی من یغرب علی اقرا نہ فی الحدیث ای یأتی بالخرائب انہ منکر الحدیث... انتہی (ہامش)
تدریب الراوی ص ۲۳۲) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو راوی اپنے باقی ساتھیوں سے متفرد ہو کر کوئی
غریب حدیث بیان کرے تو وہ منکر الحدیث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ غریب حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے۔
کمالہ مخفی۔ یہ یاد رہے کہ اس سند میں راوی عبدالرحمن بن اسحاق المدنی ہیں جو کہ رجال مسلم میں سے ہیں نہ
کہ الواسطی جن پر امام بیہقیؒ نے امام ابن معینؒ اور امام احمدؒ کا کلام نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب القراءۃ طبع دہلی)
کیونکہ المدنی سے خالد بن عبدالقداط اللطمان الواسطیؒ کی اور المدنی کی سعید مقبریؒ سے روایت ہے۔ (ملاحظہ
ہو تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۳۷) مگر الواسطیؒ اس پوزیشن میں نہیں۔ امام بیہقیؒ غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔
(فصل الخطاب ص ۱۷۱) اور اسی عبدالرحمن بن اسحاقؒ سے فریق ثانی ابو داؤد جلد ۱۸ کی روایت فالنتہی
الناس کے مرسل ہونے پر استدلال کرتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۸۰ للعلامة الکشمیریؒ)
۷ علامہ ذہبیؒ ان کو امام، الحدیث اور ثقہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰) عرضیکہ حضرت ابو ہریرہؓ تک تمام روایت ثقہ اور
ثبت ہیں۔

اعتراض: یہی اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اصل روایت اصلاً خلف امام کا جملہ نہیں ہے جیسا کہ علامہ بن عبد الرحمن نے حضرت ابو ہریرہؓ کا موقوف اثر نقل کیا ہے اور اس میں یہ جملہ مذکور نہیں ہے اور یہ خالد الطحانؒ کی خطا ہے کہ وہ یہ جملہ زائد کر کے حدیث کا مطلب بگاڑ رہے ہیں
(کتاب القراءة ص ۱۳۵ المحصلہ)

جواب: یہ اعتراض چنداں وقعت نہیں رکھتا؛ اولاً، اس لیے کہ مرفوع حدیث کو موقوف اثر کے تابع بنا کر مطلب لینا خلاف اصول ہے۔ وثانیاً، اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ کہ اعتبار راوی کی مرفوع حدیث کا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ وثالثاً، خالد الطحانؒ بالاتفاق ثقہ اور ثبت تھے۔ اور ثقہ کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے تو پھر نہ معلوم یہ غدر اور غلطی ان کے سر کیسے تھوپی جاسکتی ہے؟ ورابعاً، الزامی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر واقعی اس حدیث کے مضمون میں غلطی واقع ہوتی ہے تو کیوں نہ ہو کہ اصلاً خلف امام کی زیادت صحیح ہو۔ اور علامہ بن عبد الرحمنؒ کی روايت میں غلطی اور خطا کی وجہ سے یہ زیادت چھوٹ چکی ہو۔ اور اس زیادت کے ترک کر دینے یا چھوٹ جانے کی وجہ سے حدیث کا مضمون بدل گیا ہو بلکہ قرین انصاف بھی یہی بات ہے کہ غلطی خالد الطحانؒ کی نہ ہو جو ثقہ اور ثبت تھے بلکہ یہ غلطی اور خطا علامہ بن عبد الرحمنؒ کی ہو۔ کیونکہ ان پر کاتب رجال میں کلام اور جرح کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البرؒ اور علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معینؒ فرماتے تھے لیس حدیث بحجة کہ علامہ بن عبد الرحمنؒ کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی، ابن عدیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کی بعض حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔ ابو زرہؒ کا بیان ہے کہ وہ کوئی زیادہ قوی نہ تھے، امام ابو داؤدؒ کا بیان ہے کہ محدثین نے ان کی حدیثیں شعبان کی حدیث ان کے مناکیر میں شامل کی ہے، محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں۔ جن میں ان کا کوئی متابع نہیں ہے۔ (دیکھئے کتاب الانصاف ص ۱۷۱ میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۱۲۔ اور تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۸۱) اس لیے قرین قیاس اور مبنی بر انصاف صرف یہی بات ہے کہ اس زیادت کے ترک کرنے میں غلطی علامہ بن عبد الرحمنؒ کی ہے اور یہ روایت ان کی منکر روایتوں میں شمار ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا ص ۱۸۴ میں یہ کہنا کہ علامہ بن عبد الرحمنؒ پر جرح مبہم ہے، اور نور الانوار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جرح مبہم اثر نازد نہیں ہوتی۔ پس وہ ثقہ ٹھہرے۔

امام مسلم نے ان سے استشہاد کیا ہے، لہذا ان کے ہاں بھی ثقہ تھے۔ اور اُمت نے مسلم کی روایات کو جن پر تنقید نہیں ہوئی صحیح کہا ہے لہذا بالاجماع صحیح ہوئی۔ (محصلاً) محض تسکین قلب کا سامان امام ابن معین نے ان پر مفسر جرح کی ہے اور جرح مبہم سے بھی مؤلف مذکور کے نزدیک راوی گرجاتا ہے اور اس پر ابن معین وغیرہ نے تنقید کی ہے۔ لہذا یہ کسی طرح صحیح نہیں یہ ان کی غلطی ہے اور خالد الطحان کی زیادت بلاشک و شبہ صحیح ہے کیونکہ وہ ثقہ ثابت صحیح الحدیث اور ثابت ہیں۔ الغرض یہ روایت بالکل صحیح ہے نہ اس میں خالد الطحان کا وہم ہے اور نہ عبدالرحمن بن اسحاق کا، جیسا کہ امام بیہقی^۲ وغیرہ نے کہا ہے۔ امام مسلم نے مقدمہ میں یہ بتلایا ہے کہ وہ استشہاد میں متکلم فیہ راوی کو بھی لے لیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص ۴۳)۔ لہذا ان کا مسلموں آجانا جبکہ ان پر تنقید بھی ہوئی ثقاہت کا ثبوت نہیں

نویں حدیث: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسن علی بن احمد بن عبدان نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن عبد الصفار نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن غالب نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عمر نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے امام نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے زیاد الاعمش نے بیان کیا۔ وہ حسن سے روایت کرتے ہیں

۱۰ علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ ص ۲۲۹)

۱۱ علامہ ذہبی ان کو الحافظ اور الثقیہ لکھتے ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثابت تھے۔ (تذکرہ

جلد ۲ ص ۸۷)

۱۲ علامہ ذہبی ان کو الحافظ اور الامام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۱۷۲) دارقطنی ان کو ثقہ اور مامون اور

حافظ ابن حجر ان کو الحافظ کہتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ص ۳۳۷) اور ابن حبان ثقاہت میں لکھتے ہیں۔

(ایضاً ص ۳۳۸) نیز امام دارقطنی نے ان کو مکثر مجرد اور حافظ ابن حجر نے متقن کہا۔ (ایضاً)

۱۳ علامہ ذہبی ان کو الحافظ اور العلامہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۳۷۷)

۱۴ ذہبی ان کو الامام، الحجۃ اور الحافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۸)

۱۵ امام احمد، ابن معین، ابو داؤد، نسائی اور ابن سعد سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو زرہان کو شیخ کہتے

اور ابن حبان ان کو ثقاہت میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب الہذیب جلد ۲ ص ۳۷۲)

۱۶ امام حسن بصری کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

اور وہ حضرت ابو بکرؓ سے:

انہ دخل المسجد والنبي صلى الله عليه وسلم

واكع فر كع قبل ان يصل الى الصف فقال النبي

صلى الله عليه وسلم زادك الله حرصا ولا تعد

(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰)

وہ کہتے ہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو ان

حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رکوع میں چلے گئے تھے۔

چنانچہ صف میں ٹٹنے سے قبل ہی وہ (تکبیر تحریرہ ادا کر کے)

رکوع میں چلے گئے اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے صف

میں مل گئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیکی کرنے

پر اور حرص سے بچھرایا نہ کرنا۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ غیر سورۃ فاتحہ پڑھے۔ رکوع میں شامل ہو گئے تھے۔ مع ہذا ان کی اس

رکعت کو اور ان کی اس نماز کو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکمل اور صحیح سمجھا۔ اور

ان کو عادتہ نماز کا حکم نہیں دیا اور یہ دعویٰ کہ انہوں نے وہ رکعت دوبارہ پڑھی تھی بالکل بے بنیاد بات

ہے بلکہ ایک توجیہ کے لحاظ سے عدم اعادہ کا صریح حکم ارشاد فرمایا۔ اگر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعت

لہ ان کا نام نضیع بن الحارث تھا۔ جنگ طائف کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ فضلائے صحابہ میں تھے۔

بصرہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ اور وہیں ۴۹ھ میں وفات پائی۔ (مقدمہ تجرید البخاری ص ۳)

۱۰۰ھ میں روایت صحیح بخاری جلد ۱ ص ۹۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۳۹ و مسند احمد ابو داؤد و جلد ۱ ص ۹۹ و نسائی جلد ۱ ص ۱۰۰

اور الجامع الصغیر للسیوطی مع الشرح جلد ۲ ص ۳۷۶ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے جس

کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مزید تسلی کے لیے ہم نے سنن الکبریٰ کے روایت کی توثیق بھی

نقل کر دی ہے۔

۱۱۰ھ میں جملہ بین القوسین اور بریکٹ میں تھا۔ کتابت کی غلطی کی وجہ سے قوس رہ گئے تھے۔ یہ حدیث کے ترجمہ

میں داخل نہیں ہے۔ جیسا کہ الاعتصام ۲ نومبر ۱۹۴۲ء ص ۱۱۰ میں اس کو غلط ترجمہ اور اضافہ لکھ کر پھینتی اڑانے کی

جے جاسعی کی گئی ہے۔ اور چونکہ تکبیر تحریرہ جہور اہل اسلام کے نزدیک فرض ہے۔ اس لیے بین القوسین

اس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حدیث مستی الصلوٰۃ میں جو صحیح اور مشہور حدیث ہے ثوکبیر ثواقراً کی تصریح

موجود ہے اور حافظ ابن رشدؒ لکھتے ہیں کہ فہم فہوم ہذا ہوان التکبیرۃ الہی فی الفوض فقط

و جدید ایتہ المجتہد جلد ۱ ص ۱۱۸) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ فرض نہ کرے تکبیر تحریرہ ہی ہے۔

(حاشیہ نمبر ۱۲ کے صفحہ پر دیکھئے)

میں رکن اور ضروری ہے تو حضرت ابو بکرؓ کی نماز کیسے صحیح ہو گئی تھی؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کے رکوع میں شریک ہونے کو بنظر کراہت نہیں دیکھا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب نے سمجھا ہے۔ (دیکھئے الاعتصام) ۱۴ نومبر ۱۹۴۲ء ص ۵۷) بلکہ سجالت رکوع چل کر صف سے ملنے کو پسند نہیں فرمایا اور دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوا کہ مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری نہیں ہے۔ وہ ہوا المطلوب۔

مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے کہ قرأت خلف الامام کو ضروری قرار دینے والوں کے دو قول ہیں ایک یہ کہ رکوع کی حالت میں اگر امام کو پائے تو اس رکعت میں فاتحہ فرض نہیں ہوتی..... الخ (ص ۲۵) لہذا یہ حضرات تو ہمارے ہمنوا ہوئے۔ رہے دوسرے حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رکعت اس کی شمار نہ ہوگی تو اس کا جواب انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا اور اس حکم میں حضرت ابو بکرؓ کی خصوصیت بھی نہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے اور اسی حدیث سے جمہور اہل اسلام اور حضرات ائمہ (پچھلے صفحہ کا حاشیہ نمبر ۴) بعض محدثین اس کو لا تعد و تہتے ہیں۔ یعنی نماز کے لیے دو رکعت نہ چلا کر۔

بلکہ اطمینان اور وقار سے چلو اور بعض اس کو لا تعد و تہتے ہیں۔ یعنی پھر جماعت میں تاخیر اور تنہا صف کے پیچھے نماز شروع کرنے کی حرکت نہ کرنا اور بعض اس کو لا تعد و تہتے ہیں۔ یعنی تھاری نماز بالکل صحیح ہے۔ نماز کا اعادہ نہ کرو۔ امام نوویؒ نے (ہاشم مشکوٰۃ ص ۹۹ ملاحظہ کریں) اور حافظ ابن حجرؒ نے لا تعد کو بھی نقل کیا ہے۔

(دیکھئے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۱۴) قاضی شوکانی اور نواب صدیق حسن خان صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے دوبارہ نماز پڑھی اور اس کا اعادہ کیا اور انہوں نے طبرانی کی اس روایت سے استدلال کیا ہے صل ما ادرکت واقض ما سبقک (امام الکلام ص ۵۱) لیکن حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکنوٹی نے غیث المقام

از ص ۲۶ تا ص ۵۰ میں اس کا عقلاً و نقلاً خوب رد کیا ہے۔ وہ بحث وہاں ہی ملاحظہ کر لیں یہاں اتنی بات پیش نظر رکھیں کہ طبرانی کی روایت کی سند کیا ہے؟ اور اگر سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو کا روائی تم نے کی پھر ایسا نہ کرنا بلکہ جو حصہ نماز کا تمہیں جماعت کے ساتھ مل جائے اس کو جماعت کے ساتھ پڑھو اور جو چھوٹ جائے اس کو جماعت کے بعد اکیلے پڑھو۔ اس سے ثابت کرنا کہ اس نماز کے اعادہ کا حکم دیا خالص کم نہیں ہے۔

لہ امام بیہقی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ بڑی محنت اور مشقت سے رکوع میں ملنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور یہ اس کی واضح (بقیہ صفحہ پر دیکھئے)

اربعہ نے مدرک رکوع کے مدرک رکعت ہونے پر استدلال اور احتجاج کیا ہے جس کی پوری تفصیل اپنے محل میں بیان ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ علامہ ابن حزم ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی ایک

روایت سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ

فہذا آخر فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان ابوبکر رضی اللہ عنہ و انما کان اسلامہ
یوم الطائف بعد فتح مکة و بعد حنین۔
یہ فعل اور عمل آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا
آخری عمل ہے کیونکہ اس میں ابوبکرؓ موجود اور حاضر تھے۔
اور وہ فتح مکہ اور حنین کے بعد طائف کے دن مشرف باسلام
(محل جلد ۲۲ جلد ۲۲ ص ۲۷۴) ہوئے تھے۔

اس صحیح اور مرفوع حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ امام کے ساتھ رکوع میں ملنے والے کی وہ رکعت صحیح ہے۔ اگر اس پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہوتا، جیسا کہ فریق ثانی کا زعم ہے تو یقیناً اس رکعت کا اعتبار نہ ہوتا اور فریق ثانی کے دعویٰ کے مطابق کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظ جیسا کہ سخن ہائے گفتنی میں عرض کیا جا چکا ہے) یہ نماز بھی کالعدم اور باطل ہونی چاہتے تھے۔ عیاذ باللہ تعالیٰ۔

تکبیر تحریر میں احناف کے نزدیک اتنا قیام جس میں تکبیر تحریر ادا ہو سکے فرض ہے۔ جب فرض ہے تو حضرت ابوبکرؓ پر یہ فرض کیسے مخفی رہا پس لازمی امر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بحالت قیام ہی تکبیر تحریر ادا کی ہوگی، مولف خیر الکلام کا (ص ۲۵۳) میں یہ کہنا کہ ابوبکرؓ نے قیام میں تکبیر کہہ کر رکوع کیا ہوگا۔ ایک فرضی (بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) دلیل ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہے۔ ورنہ یہ اکابر اس کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتے (بمعناہ) اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوبکرؓ سے ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا۔ اس نے وہ رکعت پالی۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰) اس روایت کی سند میں یحییٰ بن ابی سلیمان ہے جو متکلم فیہ ہے لیکن امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ ان کی ایک سند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ صحیح و لم یندرجہ جرح (مستدرک جلد ۳ ص ۲۷۳) اور دوسرے مقام پر امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقافت بصرین میں تھے۔ اور علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۲۱۶) اسی مضمون کی ایک اور مرفوع حدیث بھی امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے ساتھیوں کا بھی اسی پر عمل تھا۔ (ادب المفرد ص ۱۵۳)

بات ہے۔ بالکل غلط ہے۔ یہ فرضی بات نہیں ایک واضح اور کھلی حقیقت ہے اور اس کا انکار کرنا بے سود ہے۔

دسویں حدیث : امام ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی بن محمد نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیع نے بیان کیا۔ وہ اسراہیلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابواسحاق (السبعی) سے اور وہ ارقم بن شریحیل سے اور وہ حضرت ابن عباس سے (ایک طویل حدیث میں جن کا ضروری خلاصہ یہ ہے) روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے امامت سپرد کی۔ تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھایا کریں۔ ایک مرتبہ آپ کو خیال ہوا کہ میں باجماعت نماز ادا کروں۔ پہلے آپ کو تکلیف زیادہ تھی۔ پھر جب مرض میں تخفیف ہوئی۔ تو آپ دو آدمیوں کے سہارے پر آہستہ آہستہ چل کر مسجد میں پہنچے۔ امام ابن ماجہ صاحب السنن (المتوفی ۲۴۳ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر کہتے ہیں۔ ابویعلیٰ النخعی ان کو ثقہ کبیر اور متفق علیہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸۹)

۱۱ علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ وہ الحافظ، الثبت، محدث اور عالم قرظین تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۹)
 ۱۲ وکیع، الامام، الحافظ، الثبت، محدث العراق اور احد الائمة الاعلام تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجر ان کو ثقہ حافظ اور عابد کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۸۵)
 ۱۳ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے بلاوجہ لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ (ایضاً ص ۳۲) امام احمد، علی، یعقوب بن شیبہ، ابو حاتم، ابن زبیر، ابن سعد اور نسائی سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ثقات میں کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۹۲) علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الحجۃ، صالح، خدا ترس اور علم کا ظرف تھے جن لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ ان کا قول مردود ہے۔ امام بخاری و مسلم نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹)

۱۴ ان کا ترجمہ حدیث نمبر ۹ میں نقل ہو چکا ہے۔

۱۵ محدث ابو زرعہ اور ابن سعدان کو ثقہ، اور ابن عبدالبر ان کو ثقہ اور حلیل القدر محدث کہتے ہیں۔ ابن حبان ثقات میں ثقات میں کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۸) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔

(تقریب ص ۲۵)

اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کر چکے تھے۔ اور ایک حد تک قرأت بھی کر چکے تھے۔ غرضیکہ آپ صفوں میں سے گزرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں جا پہنچے چنانچہ وہ پیچھے ہٹ آئے اور ان کی جگہ ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور بلغہ کرنا پڑھائی۔ چونکہ آپ بیماری کی وجہ سے بلند آواز سے بول نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں تک آواز پہنچانے میں بکتر کافر فیضہ انجام دیا اور جب آپ پہنچے تو واخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من القرآۃ من حیث کان بلغ ابوبکر رض۔ وہیں سے آپ نے قرأت شروع کی جہاں تک ابوبکر قرأت کر چکے تھے۔

(ابن ماجہ ص ۸۸ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۲)

اور ایک روایت میں (جو اس روایت کے لیے بطور شاہد اور تائید کے نقل کی جاتی ہے) یوں ہے: فقرا من المكان الذی بلغ ابوبکر رض آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سورت کے اس من السورۃ۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹) مقام سے قرآۃ شروع کی جہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

اور ایک روایت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

فاستفتح النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہی ابوبکر رض من القرآن۔ اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کے اس حصہ سے قرأت شروع کی جس تک حضرت (سنن الکبریٰ جلد ۳ ص ۲۳ ص ۸۱ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۲) ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے:

فاستقر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہی ابوبکر رض من القرآۃ..... الخ کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں سے قرأت پوری کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۹۷)

یہ روایت سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ اس کا ایک ایک راوی ثقہ ہے جیسا کہ آپ لے یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۵ مشکل الآثار جلد ۲ ص ۲۷، طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۳۱ فصل البیۃ جلد ۲ ص ۱۵۳ اور فتح الباری جلد ۲ ص ۱۲۵، دارقطنی ص ۱۵۳ وغیرہ میں مذکور ہے اور ازالۃ الخفا جلد ۱ ص ۱۵۳ میں ہے و اخرجه ابو یعلیٰ الموصلی فی مسندہ... الخ

ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اور مؤلف خیر الکلام کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ روایات مذکورہ بالا کے روایت ثقفہ ہیں ^{۲۲۵۶}۔۔۔۔۔ الخ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مسند احمد اور ابن ماجہ کی سند قوی ہے۔ (فتح الباری جلد ۵ ص ۶۷۹) چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بیمار تھے، جلد ہی جلدی چلنا آپ کے لیے دشوار تھا اور دو آدمیوں کے سہارے آپ مسجد میں پہنچے، حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے اور نماز آپ کے تشریف لانے سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سورۃ فاتحہ مکمل پڑھ چکے ہوں گے اور ان حالات کے پیش نظر یہی بات قرین انصاف ہے۔ اور اس میں تو ذرا برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سورۃ فاتحہ اگر مکمل نہ ہوتی ہوگی تو اس کا اکثر حصہ تو یقیناً پڑھا جا چکا ہوگا۔ اور آپ نے وہیں سے اور اُس آیت سے قرأت شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے اور جن کے نزدیک سورۃ فاتحہ مقتدی پر لازم ہے۔ وہ سب سورۃ فاتحہ کے لزوم کے قائل ہیں اور جو منکر ہیں وہ بھی۔

سبب سورۃ فاتحہ کے منکر ہیں۔ اس میں قائل بالفصل کوئی بھی نہیں الغرض

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوری سورۃ فاتحہ چھوٹ چکی تھی یا اس کا اکثر حصہ مگر باوجود اس کے آپ کی نماز ادا ہو گئی۔ اور آپ نے اس نماز کو صحیح اور درست سمجھا، نہ آپ کی نماز کا عدم ٹھہری اور نہ باطل اور بیکار (عیاً ذی اللہ تعالیٰ) اگر ہر رکعت میں امام کے

لہ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں (فتوح الباری جلد ۲ ص ۱۳۸)

لہ قاضی شوکانی کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پوری فاتحہ چھوٹ چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ کیا بعید ہے کہ جس رکعت میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو پالیا تھا۔ اس رکعت کے علاوہ باقی سب رکعتوں میں آپ نے پوری اور مکمل سورۃ فاتحہ پڑھی ہو، آگے لکھتے ہیں:

لان النزاع انما هو فی وجوب الفاتحة کیونکہ سورۃ فاتحہ کے ہر رکعت میں وجوب جھگڑا فی جملة الصلوة لا فی وجوبها فی کل رکعة۔ نہیں ہے بلکہ سورۃ فاتحہ کے جملہ نماز میں وجوب جھگڑا اور نزاع ہے۔ (نیل الاطوار جلد ۲ ص ۱۴)

علامہ عبدالرحمن جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مقتدی پر فرض ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے مگر جس صورت میں امام ساری فاتحہ یا اس کا کچھ حصہ پڑھ چکا ہو تو اس صورت میں امام اس کا متحمل ہو جاتا ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پہچھے اقتدا کر نیوالے پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا لازم اور ضروری ہوتا تو آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ نماز ہرگز صحیح نہ ہوتی؟ حالانکہ آپ کی یہ نماز بالکل صحیح تھی اور امام شافعیؒ و حافظ ابن حجر وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ بیماری کے دنوں میں آپ نے صرف یہی ایک نماز جماعت سے ادا کی تھی۔ اور اس لحاظ سے آپ کے اس آخری فعل اور عمل سے بھی یہ حکم آشکارا ہو گیا کہ

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) (فقہ المذہب الاربعہ، جلد ۱ ص ۲۲۹) اور مولف خیر الکلام نے بھی یہ حوالہ نقل کیا ہے (دیکھئے صفحہ ۳۴) اور خود مولف مذکور لکھتے ہیں کہ جو لوگ فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ہاں رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے اور ان میں سے بعض اس طرف بھی گئے ہیں کہ جہری نمازوں میں اگر مقتدی پوری فاتحہ یا آدھی فاتحہ کے بعد آئے تو اس سے ساری فاتحہ یا آدھی فاتحہ ساقط ہو جاتی ہے۔ (خیر الکلام ص ۴۵۹) قاضی صاحب اور مولف خیر الکلام نے تو اس طرح کو خلاصی کر کے وقت پاس کر لیا ہے۔ لیکن تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج اور انعامی چیلنج کرنے والے تو ہر رکعت میں قرأت فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔

۵ فتح الباری جلد ۲ ص ۱۳۵۔

۶ کتاب الامام جلد ۲ ص ۱۸۵۔

۷ روایات اور محدثین کا اس باب میں شدید اختلاف ہے کہ مرض الموت میں آپ نے مسجد میں باجماعت ایک نماز پڑھی تھی یا دو؟ یہ نماز جہری تھی یا سری؟ آپ امام تھے یا مقتدی؟ وغیرہ وغیرہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک ہی نماز تھی جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے اور یہ ظہر کی نماز تھی (بخاری جلد ۲ ص ۴۹۳) مولف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ظہر میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سری نماز ہے.... الخ (ص ۴۶۵) بالکل مردود ہے۔ سری نمازوں میں قرأت ہوتی ہے جہر نہیں ہوتا ایک آدھ آیت کو قدرے آواز سے پڑھ لینا سر کے خلاف نہیں۔ مولف خیر الکلام نے محض اپنی گاڑی چلانے کے لیے قرآن کو نماز پر چل کیا ہے جو بالکل بے دلیل ہے اور ان بالا دلائل سے آنکھیں بند کر کے وہ یہ لکھتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابتدا ہی سے امام تھے جو بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح روایت صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہم الذی توفی فیہ خلف ابی بکر رضی فاعداً اجواو پر گزر چکی ہے بالکل اس کے خلاف ہے اور یہ بھی صحیح روایت میں موجود ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیٹھنے لگے تو آپ نے اشارہ فرمایا کہ مجھے مرت ہٹو، مگر ابتدا سے

مقتدی پر سورۃ فاتحہ لازم نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کے حوالہ سے آئے گا کہ یہ نماز ظہر کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا نہ صرف یہ کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مطابق ہے بلکہ آپ کا آخری عمل بھی یہی ہے۔ امام بخاریؒ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

انہا یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو آخری عمل صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بخاری جلد ۱ ص ۹۶) ہوگا۔ قابل عمل صرف وہی ہوگا۔

(بقیہ جاشیہ پچھلا صفحہ) امامت کا ارادہ ہوتا تو ایسا نہ فرماتے، ہاں اس کے بعد آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا ہے اور امام طحاوی وغیرہ کی بھی یہی مراد ہے کہ آپؐ بالآخر امام تھے اور ابتداء میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار کی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یوں آتا ہے: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی صرہنہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکر رضی اللہ عنہ کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۲۷، طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۷، بیہقی جلد ۳ ص ۸۶، ترمذی جلد ۱ ص ۲۸، محلی ابن جریر جلد ۳ ص ۷۷، ترمذی فرماتے ہیں حسن صحیح) اور امام بخاریؒ (جلد ۱ ص ۹۶) نے یہ باب قائم کیا ہے۔ باب من قام الی جنب الہ ماہر لعلۃ اور امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۶۹) نے باب استغلافا الہ ماہر لعلۃ اور امام نسائیؒ (جلد ۱ ص ۱۲۷) نے باب حملۃ الہ ماہر خلف رجل من رعیتہ قائم کر کے اور یہ حدیث اس باب میں نقل کر کے اس امر کو مبرہن کیا ہے۔ یہ دلائل بھی ملاحظہ ہوں اور قاضی مقبول احمد صاحب کی یہ نقل بھی دیکھیں کہ کیا مولانا سرفراز صاحب کسی حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں کہ آپؐ پہلے بطور مقتدی شامل ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں۔۔۔ الخ الاعتصام ۱۶ (نومبر ۱۹۶۲ ص ۷۷) اور پھر جب حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کی آمد کا علم ہوا تو خود پیچھے بیٹھ گئے۔ اور آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور آپؐ نے وہیں سے قرآن شروع کی۔ جہاں تک حضرت ابوبکرؓ پڑھ چکے تھے اور صدیق نے بکر کا فریضہ ادا کیا (دیکھئے نووی جلد ۱ ص ۱۶۹، فتح الباری جلد ۱ ص ۱۲۷ وغیرہ) اور یہی بات صحیح اور صواب ہے ولین وراء عبادان قریۃ حافظ ابن حجر نے الفاظ حدیث کے ظاہری تعارض کی وجہ سے تعدد واقعہ کو الصواب کہا (الدرایہ ص ۱۰۰) مگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو واقعہ صرف ایک ہی ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے تطبیق آسانی سے ہو سکتی ہے اور تعدد واقعہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

الحمد للہ تعالیٰ کہ جس طرح جمہور کا مسلک متعدد صحیح و مرفوع قولی حدیثوں سے حق ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کے آخری عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس روایت سے متعلق فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں۔

پہلا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابواسحاق السبئی واقع ہیں اور وہ مدلس تھے اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ علاوہ بریل خمر عمر میں وہ اختلاط کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی روایت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ (او کما قال تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۶۹ وغیرہ) اور یہی عذر لنگ مولف خیر الکلام نے کیا ہے کہ ابواسحاق رحمہ اللہ سے دبیجے کے مدلس ہیں جن کی روایت بدوں تصریح سماع مقبول نہیں محصلہ خیر الکلام ص ۲۶۹، ۲۷۰) مگر بخاری میں ان کی مضعن حدیثوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ تاقیامت دے سے بھی نہ سکیں گے۔

جواب: حضرت قتادہ کی تدلیس کے ضمن میں حضرات محدثین کرام کا یہ ضابطہ نقل کیا جا چکا ہے کہ تدلیس کرنے والے راویوں کا ایک گروہ وہ بھی ہے جن کی تدلیس کسی طرح مضر نہیں ہے اور مخانیوں ان کی مضعن حدیثوں کو بھی صحیح سمجھتے ہیں، جن میں خصوصیت سے ابواسحاق السبئی کا نام بھی پیش کیا گیا ہے۔ رہا ابواسحاق السبئی کی تخلیط کا سوال تو وہ بھی چنداں باعث تشویش نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ سبئی ناقد فن رجال لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ تابعین رحمہم اور اثبات میں تھے، بڑھاپے کی وجہ سے ان پر کچھ نسیان طاری ہو گیا تھا۔ ولم یختلف (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۶۳) لیکن وہ محتاط نہیں ہوئے تھے۔ اور تصریح کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ان سے صرف ابن عیینہ نے سماعت کی ہے اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

قلت ما اختلف ابواسحاق ابدا وانما یعنی
بدلك التخيير ونقص الحفظ۔ (تذکرہ ۱) ۲۱۵
میں کہتا ہوں کہ ابواسحاق تخلیط سے کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔ ہاں ان کے حفظ میں کچھ تغیر اور نقص واقع ہو چکا تھا اور فن اصول حدیث کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ معمولی و رسم تغیر لیسیر اور نسیان کی وجہ سے تقریبات لے امام عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ وہ ہم سے کون بچ سکا ہے؟ (سان الیضان جلد ۱) امام احمد فرماتے

کی روایتوں کو ہرگز رد نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال ابوالسحاق السبئی کی تدلیس اور تخیل کا بہانہ کر کے ان کی صحیح روایت کو رد کرنا سراسر باطل ہے۔

بعض محدثین (جن میں حافظ ابن حجر وغیرہ بھی ہیں) اختلاط وغیرہ کا لفظ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن صرف لغوی اور عمومی معنوں میں جس سے ان کی ثقاہت اور عدالت پر کوئی دھبہ نہیں لگ سکتا اور اسی لیے وہ ان کی روایت کی تصحیح اور تحسین کرتے ہیں۔ مگر مبارکپوری صاحب

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہیں کہ امام سبئی بن سعید پختہ کا محدث تھے اور بہت کم خطا ان سے سرزد ہوتی تھی۔ مگر باوجود اس کے چند حدیثوں میں ان سے بھی خطا ہوئی ہے آگے فرماتے ہیں: ومن يعزى من الخطاء والتصحييف (بغدادی جلد ۱۲ ص ۱۲۷) یعنی متن اور سند میں خطار سے کون محفوظ رہ سکتا (بلکہ سکا) ہے، علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ ابوالحسن القطان نے ہشام بن عروہ اور سہیل بن ابی صالحؒ پر تہ تخیل کا الزام لگایا ہے وہ باطل ہے۔ ہاں ان کے حافظ میں کچھ نقص ضرور پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن کیا وہ نسیان سے معصوم تھے؟ پھر کیا ہوا؟ کیا اس قسم کا وہیم امام مالکؒ، امام شعبہؒ اور امام وکیعؒ وغیرہ اکثر ائمہ اور ثقات کو پیش نہیں آتا رہا؟ تو کیا ان کی روایتیں رد کر دی جائیں گی؟ خبط چھوڑ دے اور ائمہ ثقات سے بدظنی نہ کر (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۵۵) محدث عقلی نے امام علی بن المدینی پر صرح کی تھی۔ علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں: فما لك عقل يا عقيل اتدرى في من يعني اے عقیل تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کس امام تکلم۔ میں کلام کر رہا ہے۔

پھر آگے جو شرح تحریر میں آکر عقلی سے ملتی جلتی عقل والوں کو الٹی میٹم کرتے ہیں۔
وانما اشتہى ان تعرفنى من هو الثقة الثبت
میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے تم کسی ایسے ثقہ
الذی ما غلط۔
کا نام تو ذرا بہت کر کے پیش کر دو جس سے غلطی سرزد نہ

(میزان جلد ۲ ص ۲۳۱) ہوئی ہو

اور مولف خیرہ الکلام کہتے ہیں کہ کبھی کبھی غلطی کا ہوجانا یہ کوئی ایسا اعتراض نہیں جس سے حدیث

ضعیف ہو جائے پس یہ حدیث صحیح ہے.... الخ ص ۳۰۶۔

اگر وہ ہم اور اختلاط کی مزید تحقیق مطلوب ہو تو درج المفیث ص ۱۳۰ وغیرہ اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔

لہ (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس قاعدہ سے فاضل اور بے خبر ہیں اور خواجہ خواہ ان کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔
 دوسرا اعتراض؛ مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اسرائیل بن یونس نے
 ابواسحاق السبئی سے روایت کی ہے اور ان سے اسرائیل کی سماعت اختلاف کے بعد
 ہوئی تھی۔ لہذا یہ روایت قابل توجہ نہیں (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۷)

جواب؛ یہ اعتراض بھی مردود ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ ابواسحاق اس اصطلاحی
 تخلیط کا تو کبھی شکار ہی نہیں ہوئے جس کے سبب ان کی روایت کمزور اور ضعیف سمجھی
 جاسکے اور ان کے معمولی وہم اور تغیرِ حفظ سے ان کی حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔
 اس لیے اگر اسرائیل کی سماعت ابواسحاق کے لغوی اختلاف یا نقصِ حفظ کے بعد بھی ہو۔
 تو اس کا اثر اور فرق کیا نکلے گا؟ ثانیاً۔ امام ترمذی لکھتے ہیں کہ ابواسحاق کے جملہ تلامذہ
 میں اسرائیل ابواسحاق کی روایتوں میں اصح الثبت اور احفظ واقع ہوئے ہیں (جلد ۱ ص ۱۹۹)
 امام ابن ہمدانی کا بیان ہے کہ اسرائیل کو اپنے دادا ابواسحاق کی جملہ روایتیں اس طرح
 یاد تھیں جیسا کہ مسلمانوں کو سورۃ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹ و نقلہ التلخیص
 جلد ۱ ص ۱۶۱) علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ اسرائیل صحیحین کے راوی ہیں۔ و ہو فی الثبت

کلاہ سطوانۃ۔ یعنی وہ حدیث کے بیان کرنے میں ایسے مضبوط تھے، جیسے ستون۔ البتہ ہاں
 امام شعبان سے زیادہ ثبت تھے لیکن ابواسحاق سے روایت کرنے میں اسرائیل امام شعبان
 سے بھی زیادہ ثبت تھے۔ (میزان جلد ۱ ص ۹۸) اور تذکرۃ الحفاظ ۱ ص ۳۵۲ میں ایک حدیث
 کے بارے میں جس میں اسرائیل عن ابی اسحاق... الخ ہے فرماتے ہیں اسناد قوی امام دارقطنی

لہ حافظ ابن حجر نے اس روایت کی ایک جگہ تصحیح (فتح الباری جلد ۵ ص ۲۶۹) اور دوسری جگہ تحمین
 کی ہے (جلد ۲ ص ۱۱۲۵) اور مبارک پوری صاحب کی بڑی ہی سعادت ہے کہ ان کو حافظ صاحب کی صرف
 تحمین ہی ملی ہے اور اس پر بھی وہ بڑے ناراض ہیں۔ اگر ان کی تصحیح بھی مل جاتی تو نہ معلوم ان پر کیا گذرتی؟
 مگر ازراہ بزرگی یہ نہ سوچا کہ ابواسحاق رم کی تدلیس مضر ہے اور نہ نقصِ حفظ اور تغیر کی وجہ سے ان کی
 حدیث ضعیف ہے بلکہ ان کی روایت اصول حدیث کے رد سے بہر حال صحیح ہے۔ لا شک فیہ۔

کا بیان ہے کہ امام عبدالرحمن بن محمدؒ نے فرمایا کہ ابواسحاقؒ کی روایتوں میں اسرائیلؑ امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ ثقہ تھے۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور تقریباً یہی مضمون حافظ ابن حجرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (درایہ صفحہ ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۲) مولانا شمس الحق صاحبؒ اسرائیلؑ عن ابی اسحاقؒ... الخ کی روایات کے بارے میں یہ فیصلہ درج کرتے ہیں کہ کلاھا صحیحۃ التعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور حافظ ابن حجرؒ اسرائیلؑ عن ابی اسحاقؒ... الخ کی سند کی تصحیح کرتے ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ، ابواسحاقؒ کے تمام تلامذہ اور اصحاب میں اسرائیلؑ کو اتقن لکھتے ہیں۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۳۳۶) اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ مبارک پوری صاحبؒ نے تحقیق الکلام اور ابوبکر المنین میں جوش جوانی میں سب اناپ شناپ لکھ مارا ہے۔ لیکن جب تحفۃ الاحوذی لکھنے کی باری آئی اور عقل اور علم میں سچگی ہو گئی اور اپنی ذمہ داری کا گہرا احساس ہوا تو اس قاعدہ کے لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ اسرائیلؑ ابواسحاقؒ سے روایت کرنے میں امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ قوی اور ثبت تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۱)

اب انصاف شرط ہے کہ ہم مبارک پوری صاحبؒ کی اس سے بڑھ کر اور کیا تسلی کر سکتے ہیں؟
 وقالنا۔ اس روایت میں اسرائیلؑ کے ایک اور ثقہ اور ثبت متابع بھی موجود ہیں جن کا نام ذکر کیا
 بن ابی زائدہؒ ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن احمدؒ اپنے والد امام احمد بن حنبلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ صحیحی
 لہ مثلاً دیکھئے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۸، جلد ۷ ص ۵۰۹، جلد ۸ ص ۵۰۹، جلد ۹ ص ۵۰۹، جلد ۱۰ ص ۵۰۹، جلد ۱۱ ص ۵۰۹،
 عن ابی اسحاقؒ... الخ کی سند ضعیف اور کمزور ہے تو ازراہ کرم بخاری (مثلاً جلد ۱ ص ۵۰۹، جلد ۲ ص ۵۰۹، جلد ۳ ص ۵۰۹،
 ۲ ص ۵۰۹، ۳ ص ۵۰۹ وغیرہ) اور مسلم کی تمام حدیثوں پر قلم پھیریں۔ کیونکہ ان میں ابواسحاقؒ کا اختلاط کارفرما ہوگا۔ قاضی فیہ
 اصحاب ان کو نسبان کا مرض لگا کر وہی قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے الاعتصام ص ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء) لہذا بخاری اور
 مسلم سے اس وہی کی سب روایتیں نکال دیں۔ ملاحظہ کیجئے کہ غیر مقلدین کے تعصب اور گروہ بندی کی وجہ سے صحیحین
 کی کتنی احادیث غیر صحیح قرار پاتی ہیں۔ نعوذ باللہ تعالیٰ من شر و انفسنا۔

لہ اس سند کے باقی راویوں کی قرین پیلے نقل کی جا چکی ہے یعنی بن ابی زکریا کو حافظ ابن کثیرؒ من الائمة الثقات لکھتے ہیں۔
 (الہدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۸۲) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، الثبت، اتقن اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۶)
 حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ (تقریب ص ۳۹۱)

بن ابی زکریا سے اور وہ زکریا بن ابی زائدہؓ سے اور وہ ابواسحاق السبئیؓ سے اور وہ ارقم بن شریبؓ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث کا وہی مضمون ہے جو پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۳۳) جب اسرائیلؑ خود اوثق اور اثبوت میں اور ان کا متالاج بھی ثقہ اور ثبت ہے تو پھر ان کی روایت کیوں صحیح نہیں ہے؟ الغرض نہ تو یہ روایت فساد ہے جیسا کہ ازہ اعتصام ۱۹ نومبر ۱۹۶۷ء ص ۶۱۹ میں اس پر بلاوجہ زور لگا تعصب کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور نہ یہ مرجح اور بخاری کی روایت راجح ہے۔ راجح اور مرجح کا سوال تعارض کے وقت ہوتا ہے۔ جب دونوں میں تعارض ہی نہیں تو راجح و مرجح کا سوال بالکل بیکار ہے دونوں صحیح ہیں۔ ایک مجمل ہے اور دوسری مفصل ہے جس میں زیادت ثقہ ہے۔ جو باتفاق جملہ محدثین کرام قابل قبول ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا شاہد:

اسد بن موسیٰ اپنی کتاب فضائل صحابہ میں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہ نے بیان کیا۔ وہ

لہ علامہ ذہبی ان کو صداقت شعار مشہور اور حافظ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۳۲۹) امام عجلئ ابو زرعہ، ابو داؤد، نسائی، یعقوب بن سفیان اور ابویکرابہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام قطان ان کو دباؤس بہ اور ابن معین صالح کہتے ہیں امام احمد ان کو ثقہ اور حلو الحدیث اور علامہ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۳۳) غرضیکہ اس سند کے بھی جلد روایت ثقہ اور ثبت ہیں۔

امام بخاری اسد بن موسیٰ کو مشہور الحدیث اور امام نسائی اور ابن یونس ثقہ کہتے ہیں۔ خلیل ان کو صالح کہتے ہیں اور ابن حبان ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶) مولانا شمس الحق صاحب کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے (التعلیق المنفی جلد ۱ ص ۵۷) امام حاکم اور علامہ ذہبی ایک سند کو جس میں اسد بن موسیٰ ہے علی شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (استدراک مع التخصیص جلد ۳ ص ۳۹۳)

سے مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے کتب اسماء الرجال میں ان کا پتہ نہیں مل سکا۔ نہ معلوم وہ کون اور کیسا؟ اگر ایسے مشہور اور ثقہ محدث کا پتہ بھی مبارک پوری صاحب کو نہیں مل سکا تو ان کو کیا ملے گا؟ ان کا نام محمد بن خازم اور لقب ضریر تھا۔ حافظ ابن کثیر ان کو احد مشائخ الحدیث الثقات المشہورین لکھتے ہیں۔ (المبداہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۳۵) علامہ ذہبی ان کو احلامۃ الاعلام الثقات (میزان جلد ۳ ص ۳۸۲) اور ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۹۹) امام عجلئ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھے)

عبدالرحمن بن ابی بکر سے اور وہ ابن ابی بکر سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کا بعینہ مضمون وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں گزر چکا ہے (حافظ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۲۷ میں نقل کیا ہے)

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے کیونکہ پیش کردہ سندوں میں عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم.... الخ ہے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) یعقوب بن سفیان اور نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خراش ان کو صدوق کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۱۳۶) حافظ ابن حجر ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۱۸) علامہ خطیب نے ان کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے (بغدادی جلد ۵ ص ۲۴۲)

۱۔ جو محدثین واقعی ان کی تضعیف کرتے ہیں مگر ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں لکھی جاسکتی ہیں۔ امام ساجی ان کو صدوق کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان میں ضعف ہے مگر قابل برداشت ہے۔ فیہ ضعف یحتمل۔

ابن حبان ان کی توثیق کی طرف مائل ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ینفرد عن الثقات ما لا یشبہ حدیث الہ ثبات یعنی وہ ثقہ راویوں سے ایسی روایات میں منفرد ہوتے ہیں جو اثبات یعنی ثقہ اور مثبت راویوں کی روایات کے مشابہ نہیں ہوتی ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۲۶) امام ابن معین نے ان کو ضعیف ابو حاتم نے یس بقوی فی الحدیث اور نسائی نے یس ثقہ اور متروک الحدیث کہا ہے لیکن مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۴ و ص ۲۸ میں الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ حرج مفسر نہیں اور عام فقہاء اور محدثین کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں۔ (محصلہ) البتہ امام بخاری اور امام احمد نے اس راوی کو منکر الحدیث کہا ہے۔ (تہذیب جلد ۶ ص ۱۳۶)

لیکن مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اگر امام بخاری کسی راوی کو منکر الحدیث کہیں تو اس سے روایت کرنا ان کے ہاں جائز نہیں۔ امام احمد ۷ اور اس قسم کے لوگ کسی کو منکر کہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۲۴۹) اور ہم نے تو ان کو صرف شاہد کے طور پر پیش کیا ہے کہ بطور احتجاج کے۔ اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام میں لکھتے ہیں کہ ان (آثار) کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۳۱۶)

۲۔ ذہبی ان کو امام فقیہ حجت فصیح اور بلند مرتبہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔ (تذکرہ جلد ۵ ص ۹۶)

اور مسند بزار کی روایت میں عن ابن عباس عن ابیہ العباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ اس لیے یہ روایت قابل احتجاج نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۷۷)

جواب: مبارکپوری صاحب کو لفظ اضطراب تو آتا ہے، مگر انوس کہ وہ حقیقتاً اضطراب سے ناواقف ہیں۔ محدثین کرام کے نزدیک اضطراب کی چند شرطیں ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ دونوں سندیں ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہوں ورنہ اضطراب نہ ہوگا۔ صحیح قابل اخذ ہوگی اور ضعیف قابل رد ہوگی۔ (دیکھیے شرح منجۃ الفکیر ص ۶۴ وغیرہ) اور ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو سندیں بیان کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ایک ایک راوی ثقہ اور ثبوت ہے اور مسند بزار کی روایت میں قیس بن ربیع واقع ہے۔ امام بخاری کا بیان ہے کہ امام وکیع ان کو ضعیف کہتے تھے۔ (ضعفاء ص ۲۶) امام نسائی ص ۵۱ (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۱) امام ابو حاتم اور امام سبئی اس کو لیس بالقوی اور ضعیف کہتے تھے۔ امام احمد اس کو کثیر الخطا اور ابن مدینی و دارقطنی اس کو ضعیف کہتے تھے (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲) اور لطف یہ ہے کہ خود

یہ روایت نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۵۱ میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹، اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۵۳

وغیرہ میں بھی آتی ہے۔

۱۵ اگر کوئی صاحب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کم سنی کا بہانہ کرتے ہوئے ان کی روایت کے مرسل ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ بھی باطل ہوگا کیونکہ اگر بالفرض حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مرسل بھی ہو تب بھی حضرات صحابہ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر بیان ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ بریں اس میں قدر سے اختلاف ہے کہ اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر دس سال تھی یا پندرہ؟ مسند احمد جلد ۱ ص ۳۳۷ میں اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۳۲ میں بسند قوی اور صحیح یہ روایت موجود ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ان کی عمر پندرہ برس کی تھی اور اس کی امام نووی (جلد ۱ ص ۱۹۶) وغیرہ نے ترجیح دی ہے اور یہ روایت مرض الموت کی ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کم سنی وغیرہ کے بہانے سے ان کی روایت کو مرسل قرار دینا مردود اور باطل ہوگا اور بخاری جلد ۲ ص ۵۳۷ کی روایت سے آپ کی وفات حضرت آیات کے وقت ان کی عمر دس سال ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مبارک پوری صاحب بھی اس کو ضعیف اور کمزور بتاتے ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱) اس لیے اس حدیث کے اضطراب کا دعویٰ قطعاً مردود اور باطل ہے۔ یہ حدیث بلاچون و چرا صحیح ہے۔ البتہ لافلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔

چوتھا اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں (اور اسی کو مؤلف خیر الکلام نے دوہرایا ہے ملاحظہ ہو ص ۴۶۴) کہ اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سورہ فاتحہ چھوٹ گئی اور مع ہذا آپ کی نماز درست ہو گئی بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ نماز پوری کیے بغیر حجرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ تو یقیناً آپ نے وہاں نماز مکمل کی ہوگی اور اس دعویٰ پر یہ حدیث نقل کی ہے:

فما قضی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ
حتیٰ ثقل فخرج یھا ذی بین الرجلین - اضافہ اور تیزی ہو گئی۔ سو آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد سے باہر تشریف لے گئے۔

اس میں حرف فار ہے جو تعقیب بلا ملہ کے لیے آتا ہے۔ لہذا اس روایت سے ترک قرأت

لہ یہ روایت مشکل الآثار جلد ۱ اور المختصر ص ۴۹ و طحاوی جلد ۲ ص ۲۳۵ وغیرہ میں مروی ہے اور سنن الکبریٰ جلد ۳ ص ۱۱۱ کے الفاظ یہ ہیں فما قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ حتیٰ ثقل جداً فخرج یھا ذی بین الرجلین وان رجلیہ لتخطان الارض فمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یوص۔ سو آپ نے نماز پوری نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ آپ پر بیماری کا غلبہ ہو گیا۔ پس آپ دو آدمیوں کے سہارے سے تشریف لے گئے اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ پس آپ کی وفات ہو گئی اور آپ نے کوئی وصیت نہ کی۔ فمات میں بھی حرف فاء ہے۔ کیا مبارک پوری صاحب کی تحقیق میں مسجد سے نکلنے کے فوراً بعد آپ کی وفات ہو گئی تھی۔ یا چار پانچ دن کے بعد وفات ہوئی تھی؟ (دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۲۲۵ وغیرہ) اگر ان کے نزدیک ہر مقام پر حرف فار تعقیب بلا ملہ کے لیے آتا ہے تو ورواداً اقمتم الی الصلوٰۃ فاعسلوا الایۃ ہیں اور اذ اقرأت القرآن فاستعذ

باللہ میں اور اذ اصلیتکم علی النبی فاخلصوا الی الدعاء میں اور تزوج فلان فولدہ وغیرہ وغیرہ مقامات میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟ اور اگر ان مقامات میں حرف فاء تفصیل کے لیے ہے یا کسی اور مناسب (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

سورہ فاتحہ کا مسئلہ اور بصورت ترک تکمیل نماز کا ادعا صحیح نہیں ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلاہ جلد ۲ ص ۱۷)

جواب: مبارک پوری صاحب کا یہ دعویٰ کہ تاکہ آپ نماز کی تکمیل کے بغیر مسجد سے باہر نکل کر تشریف لے گئے تھے نہ معلوم کس بات پر مبنی ہے؟ اس دعویٰ کا ثبوت تو کسی روایت سے نہیں مل سکتا۔ اس روایت سے تو اتنا ہی ثبوت ملتا ہے کہ نماز کی تکمیل سے قبل ہی آپ پر بیماری کا زور ہو گیا۔ اور اگر خضج میں حرف فاء کو مبارک پوری صاحب تعقیب بلا حملہ کے لیے سمجھتے ہیں اور اس پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں تو یہ ان کو سراسر مضر پڑے گا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ علاوہ بری اس کی تصریح موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ نماز ہی پوری کی، بلکہ حضرات صحابہ کرام کو نماز کے بعد خطاب بھی فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں یوں الفاظ آتے ہیں: **فصلیٰ لہم وخطبہم** آپ نے حضرات صحابہ کرام کو نماز پڑھائی اور ان سے خطاب فرمایا (بخاری ۲ ص ۸۵)

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

ثوخرج الی الناس فصلیٰ لہم وخطبہم۔ (بخاری ۲ ص ۸۹ وفتح الباری)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) معنی میں مستعمل ہوا ہے تو خضج میں حرف فاء سے کوئی ایسا مناسب اور موزوں معنی کیوں نہیں لیا جاسکتا تاکہ دوسری صحیح روایات سے تعارض پیدا نہ ہو اور اگر مبارک پوری صاحب اس پر بضطہن کہ حرف فاء تعقیب بلا حملہ کے لیے ہی ہوتا ہے تو کامیابی پھر بھی جہور کی ہوگی۔ کیونکہ قرآن کریم کی آیت **واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ... الاذیۃ اور حدیث اذا قرأ الامام فانصتوا میں بھی ان کے اصول کے تحت حرف فار تعقیب بلا حملہ کے لئے ہوگا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ امام کی قرأت شروع کرنے کے فوراً بعد مقتدیوں پر استماع اور انصات واجب ہے۔ اور سبھی جانتے ہیں کہ امام کی قرأت سورہ فاتحہ سے شروع ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ ما زاد علی الفاتحہ سے۔ لہذا مقتدیوں پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا منوع ٹھہرا۔ اور قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر عمل کرنے کی رٹ باطل ہوگئی ہے**

خوش نوا یان جن کو غیب سے مزود ملا دام میں صیاد اپنے بتلا ہونے کو ہے

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آپ نے جماعت کے ساتھ نماز کی تکمیل کی۔ اور پھر حضرات صحابہ کرام سے خطاب بھی کیا۔ اور جو روایت مبارک پوری صاحب نے پیش کی ہے۔ اس سے ان کا مدعی ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ تکمیل نماز سے قبل ہی آپ کا مرض بڑھ گیا تھا۔ اور اس کا کون منکر ہے؟ اور نماز اور خطاب سے فارغ ہونے کے بعد آپ دو آدمیوں کے سہارے سے جیسے تشریف لائے تھے۔ ویسے ہی واپس تشریف لے گئے۔ اگر مبارک پوری صاحب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بجاالت نماز مرض بڑھ نہیں سکتا یا تکمیل نماز کے بغیر ہی دو آدمیوں کے سہارے پر گھر جانا ہی متحقق ہو سکتا ہے۔ تو ہماری بلا سے مبارک پوری صاحب جانیں اور ان کی سمجھ۔ بہ صورت مسئلہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری جماعت نماز میں سورۃ فاتحہ مکمل یا اس کا اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا۔ معذرتاً آپ کی نماز صحیح ہو گئی تھی۔ وہو المطلوب۔

پانچواں اعتراض: مولوی محمد صادق صاحب سرگودھوی (غیر مقلد) لکھتے ہیں کہ اگر آپ نے امام ہونے کے باوجود سورۃ فاتحہ ترک کی تو حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ امام پر سورۃ فاتحہ واجب ہے تو حنفیہ کا اعتراض جیسا کہ اہل حدیث پر ہے۔ ویسا ہی ان حنفیوں پر بھی ہے۔ (خیر الکلام ص ۶)

جواب: یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فقہائے حنفیہ کی کتابیں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ورنہ وہ اس قسم کی سطحی بات ہرگز نہ تحریر نہ کرتے۔ علماء احناف کے نزدیک سورۃ فاتحہ کی قرآن اس امام پر ضروری ہے جو اقل سے آخر تک امامت کا فریضہ ادا کر رہا ہو۔ اگر کسی نے اس حالت میں امام کی اقتدا کی ہو۔ کہ امام سورۃ فاتحہ پڑھ چکا ہو یا رکوع کے لیے سر جھکا چکا ہو۔ اور امام کو حدیث کو لائق ہو گیا ہو تو ایسے مقتدی کو امام اپنا نائب اور خلیفہ بنا سکتا ہے اور ایسے نائب امام کی نماز بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی جائز اور صحیح ہے۔ اور رکوع کی حالت میں بھی مسبوق کو نائب اور خلیفہ بنا جاتا ہے۔ (دیکھئے ہدایہ جلد ۱ ص ۱۱۰ وغیرہ) اور حضرت ابن عباس کی حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کیونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے حضرت ابو بکر کی اقتدا کی تھی اور بعد کو آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا تھا جیسا کہ اس کی پوری تشریح

پہلے ہو چکی ہے۔ لہذا حقیقوں پر تو مطلقاً اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانہ لے اور مسکواکمبارا یتسویٰ اصحابی کی حدیث پر عامل ہونے کے مدعی اس صحیح حدیث سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور شاید کہ تا قیامت ہو بھی نہ سکیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیگر صحیح قولی احادیث کی طرح آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اس صحیح اور فعلی حدیث سے بھی یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آخری باجماعت نماز بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی درست اور صحیح ہو گئی تھی اور یہی جہور اہل اسلام کا مسلک ہے اور آپ کے آخری فعل کے حق اور درست ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے بعد نسخ کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ازراہ انصاف خدا تعالیٰ سے ڈر کر فریق ثانی کو اپنے اس فتویٰ پر نظر ثانی کرنی چاہیے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس آخری عمل کے پیش نظر یہ فتویٰ کس بے باکی اور جسارت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیاں اور لغزشیں معاف کرے۔

گیارھویں حدیث: امام احمد بن حنبلہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق ابن زریق نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوری اور شریک نے بیان کیا۔ وہ دونوں روایت

۱ علامہ ذہبی ان کو الحافظ اور الحجہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۷)

۲ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۳۲۵) علامہ ذہبی ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۹۲) حافظ ابن کثیر ان کو احد الائمة الحدیث لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ

جلد ۱ ص ۲۲۷)

۳ سفیان ثوری کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور شریک ان کے متابع ہیں۔ علامہ ذہبی ان کو الحافظ ، الصادق اور احد الائمة لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۹۶) نیز لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمة الاعلام، حسن الحدیث، امام، فقیہ اور کثیر الحدیث تھے و حدیثہ من اقسام الحسن (تذکرہ ص ۲۱۲) علامہ ابن سعد ان کو ثقہ مومن اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۳۶) یہ یاد رہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کرتے ہیں موسیٰ بن ابی عائشہ سے۔ وہ عبد اللہ بن شداد سے اور وہ حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان
لہ امام فقراءة الامام لہ قراة (بجوالہ)
آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد
فرمایا کہ جس آدمی نے امام کی اقتدا کی تو امام کی قراة
بمقتدی کو بس ہے۔ (فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹)

اس روایت میں جہری اور مسری نماز کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اپنے عموم پر ہے کیونکہ اس میں حرف من شرطیہ ہے جو عموم کے لیے ہے۔ بخلاف لا صلوة لمن لم یقرأ کے کہ وہاں حرف من موصولہ یا موصوفہ ہے جس میں عموم و خصوص دونوں آسکتے ہیں۔ اور اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے جب کسی نے اقتدا اختیار کر لی ہو تو مقتدی کو جدا اور الگ قرأت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ امام کا پڑھنا گویا مقتدی کا پڑھنا ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہم نے شریک کو صرف متابع کے طور پر پیش کیا ہے۔ استلال امام سفیان ثوری سے ہے جو ثقہ اور ثبت تھے۔ (ترجمان الحدیث ص ۲۱، ۲۲ جولائی ۱۹۶۳ء میں تصدوات کے چند نمونے کا عنوان قائم کر کے اور ہماری اس عبارت سے لفظ متابع ہضم کر کے جو اعتراض کیا ہے، علی طور پر خالص بددیانتی ہے۔ ہم نے سفیان ثوری کو ان کا متابع نہیں بتایا بلکہ ان کو سفیان ثوری کا متابع کہا ہے مگر مضمون نگار نے ص ۲۱ میں دجل کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں جبکہ سفیان ثوری اس کا متابع موجود ہے۔

۱۔ امام حمید ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ امام ابن معین اور یعقوب بن سفیان ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۲) حافظ ابن حجر ان کو ثقہ اور عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ۳۹۶) امام بخاری ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۲ ص ۴۳۳)

۲۔ یہ حضرت ام المومنین میمونہ کے بھانجے تھے (بخاری جلد ۱ ص ۲۲۷ و ۲۲۸) حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا تولد ہوا تھا۔ امام عجل، خطیب، ابو زرعہ، نسائی، ابن سعد اور واقفی سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲

۳۔ یہ روایت شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۲ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۶ روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳۸، ابی الدین ص ۱۶، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲، حاشیہ طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸، اعلیٰ السنن جلد ۲ ص ۶۳ اور بغیۃ اللمعی جلد ۲ ص ۲ وغیرہ کتابوں میں اجمالاً و تفصیلاً نقل کی گئی ہے۔

اور ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت میں فریق ثانی کا کلی اتفاق ہے کہ اس میں امام کی قرأت مقتدی کی قرأت سمجھی جائے گی اور مقتدی پر الگ قرأت لازم نہیں ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے۔ اور باقی سب راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور مبارکپوری صاحب نے اپنی افتاء و طبع کے تحت گو آئیں باتیں شانیں سے کام لینے اور گلو خلاصی کی ناکام کوشش کی ہے، لیکن اتنی بات تسلیم کیے بغیر وہ کوئی مفسر نہیں پاتے کہ بظاہر صحیح ہے کیونکہ موصول بھی ہے۔ اس کے تمام روایات بالاتفاق ثقہ بھی ہیں اور کوئی علت قاصرہ بھی بظاہر اس میں نہیں پائی جاتی۔۔۔ الخ (بمقصد تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸)

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب تمام راوی ثقہ ہیں اور سند بھی موصول ہے۔ اور بظاہر کوئی علت قاصرہ بھی اس میں پائی نہیں جاتی۔ تو مبارکپوری صاحب جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ اور یا صحیح تسلیم کرتے ہوتے۔ اس کا کوئی معقول جواب دیتے۔ مگر چونکہ اپنی رائے کو ترک نہیں کرنا۔ اس لیے ان حضرات کی طرف سے صحیح حدیث کو معقول ٹھہرانے کی کوشش اور سعی کی گئی ہے۔ مبارکپوری صاحب نے جو کچھ کہا اس کو آپ پڑھ لیں اور ساتھ ساتھ جواب بھی ملاحظہ کرتے جائیں۔

پہلا اعتراض: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں (اور یہی اعتراض خیر الکلام از ص ۴۵ تا ۴۷ میں پائی کی طرح بلویا گیا ہے) کہ یہ روایت مرفوع نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہیں: (۱) اگر یہ طریق مرفوع ہوتا۔ تو محدثین کرام، امام سفیان ثوری، شریک اور جریر کو امام ابو حنیفہ کا مخالف ہرگز نہ بتاتے۔

(۲) اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو امام طحاوی، علامہ مارون بنی، حافظ زلیعی اور محدث علی وغیرہ محل احتیاج میں ضرور اس کو پیش کرتے۔

(۳) حافظ ابن ہمام نے مسند احمد بن منیع کے جس نسخہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے عبد اللہ بن شداد کے بعد عن جابر کا جملہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اور لے نواب صدیق حسن خان صاحب مسند احمد بن منیع کے طریق سے دو سندوں کا حال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والہ اسناد

الاول صحیح علی شرط الشیخین والثانی علی شرط مسلم ۱۱ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۲)

حقیقت میں یہ روایت مرسل ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۲۸ و ابکار المنین نقل)

جواب: مبارکپوری صاحب کا یہ دعویٰ بے پندش کردہ دلائل کے از سر تا پا لغو اور بیہودہ

ہے۔ یہ روایت مرفوع ہے مرسل نہیں ہے، ترتیب وار ہر شق کا جواب ملاحظہ کیجئے:

پہلی شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ جریر، سفیان اور شریک وغیرہ امام ابو حنیفہ رحم کی

مخالفت کرتے ہوئے اس کو مرسل روایت کرتے ہیں باطل ہے، چنانچہ علامہ آلوسیؒ ان کی روایت

کو کئی سندات کے ساتھ نقل کر کے لکھتے ہیں۔ (علامہ آلوسیؒ ثقہ ناقل ہیں ان کو متناخر آدمی کہہ کر

نالہ نیا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۴۳ میں کیا ہے نرے تعصب پر مبنی ہے اور اہل علم کی شان

کے لایق نہیں ہے)

سویرامام مثلاً سفیان ثوری، شریک، جریر اور ابوالزبیر

فہو اور سفیان و شریک و جریر

(وغیرہ) صحیح اسانید کے ساتھ اس روایت کو مرفوع نقل

ابوالزبیر رفعہ بالطرق الصحیحة

کرتے ہیں جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس

قبطل عدھو فین لم یرفعہ۔

کو مرفوع روایت نہیں کیا۔ ان کا قول سراسر باطل ہے۔

(روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۲)

اور اسی طرح فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹ میں بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام بیہقیؒ دارقطنیؒ اور ابن عدیؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کہ اس روایت

کو تنہا حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی مرفوع بیان کرتے ہیں اور اس رفع میں ان کا اور کوئی ساتھی

نہیں محض باطل ہے اور امام ابو حنیفہؒ سے اس روایت کو نقل کرنے والے بھی اس کو

مرفوع ہی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں:

امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب اور تلامذہ میں سے ایک

ہذا حدیث برواہ جماعة من

بہت بڑی جماعت نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا

اصحاب ابی حنیفہ موصولاً وخالفاً

ہے لیکن امام عبداللہ بن مبارکؒ اس کو مرسل روایت

عبداللہ بن المبارکؒ از امام فرواہ

کرتے ہیں۔

عندہ مرسلاً۔ (کتاب القراءة ص ۱۰۱)

اسحق ارزق، ابویوسفؒ اور یونس بن بکرؒ وغیرہ کی روایتیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲ اور ص ۱۲۳ میں

مذکور ہیں اور محمد بن الحسنؒ، محمد بن الفضلؒ البغویؒ، سلیم بن مسلمؒ، علی بن ابی ریمہؒ، علی بن یزید الصدیقؒ

اور مردان بن شجاع کی روایتیں عقود الجواہر المنیفہ فی اولیٰ الاحکام لمنہ سب ابی حنیفہ میں مذکور ہیں۔ (کنز فی الدلیل المبین ص ۹۵ لولانا المحدث محمد حسن فیض پوری) لہذا اسحاق ارزق کی روایت کو شاذ، غلط اور ضعیف قرار دینا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۲۴۶ و ۲۴۷) محض بے بنیاد امر اور نرا باطل دعویٰ ہے۔ علاوہ ازیں مؤلف خیر الکلام خود ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرّد کوئی مضر نہیں ہوگا۔۔۔ الخ ص ۲۸۸ اور اسحاق ارزق تو چوٹی کے ثقہ اور مثبت ہیں۔ پھر تفرّد کا ناکام بہانہ کون سنتا ہے اور کون ان کی اس صحیح زیادت کو شاذ مانتا ہے؟

اور دوسرے مقام پر امام بیہقی ^۲ لکھتے ہیں:

وهكذا رواه جماعة عن ابی حنیفہ ^۲ اسی طرح امام ابو حنیفہ ^۲ سے ایک بڑی تعداد نے
موصولاً۔ (سنن الکبریٰ ج ۲ ص ۱۵۹) اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے۔

اور نو اب صدیق حسن خاں ^۲ لکھتے ہیں کہ

وبالجملة این حدیث بطرق متعددہ ارسالاً و خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مرسلہ
رفعا مروی شدہ و دروی دلالت است برانکہ اور مرفوعاً مروی ہے اور اس میں دلیل ہے کہ مقتدی
مؤتم و رئیس امام فاتحہ نخاندزیر کہ قرأت امام امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ امام کی قرأت مقتدی
قرأت مؤتم است اه (ہدایت السائل ^۲) کی قرأت ہے۔۔ الخ

پہلے اس کی تحقیق گزر چکی ہے کہ ثقہ راوی کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے۔ خواہ وہ

زیادت متن حدیث میں ہو۔ خواہ سند میں اور جب حدیث کے مرفوع اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو وہ حدیث جمہور علماء کے نزدیک مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ نیز مثبت کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ اگر بالفرض اس زیادت کو تنہا حضرت امام ابو حنیفہ ہی بیان فرماتے۔ تب بھی حضرت محدثین کرام کے طے شدہ اصول اور ضوابط کے تحت یہ روایت مرفوع اور موصول ہی ہوتی حالانکہ جریر، سفیان، شریک اور ابو الزبیر وغیرہ سب ثقہ راوی اس کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ ^۲ سے بھی ایک بڑی جماعت اس کو مرفوع اور موصول ہی روایت کرتی ہے۔ امام ابن مبارک ^۲ چونکہ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں اور دوسرے اس کو مرفوع

بیان کرتے ہیں۔ اس لیے قاعدہ کے مطابق مرفوع اور متصل ہی کو ترجیح ہے۔ نہ کہ اس کے مرسل ہونے کو علاوہ انہیں خود امام ابن مبارک کا بیان ہے کہ جب امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میرا قول بھی وہی ہوگا (تبیض الصحیفہ ص ۱) اور امام ابو حنیفہ اور امام سفیان ثوری دونوں اس روایت کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام حاکم علامہ شمس الدین ابن قدامہ، علامہ مارونینی، حافظ ابن ہمام، ملا علی القاری اور علامہ آلوسی وغیرہ اس روایت کو مرفوع ہی نقل کرتے ہیں۔ اور یہ مثبت بھی ہیں اور مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں:

فقول هؤلاء العارفين مقدمه علي من لم
سوان جانتے والوں کی بات نہ جاننے والوں کی بات سے
يعرف - (البارئ ص ۱۲۵) بہر حال مقدم ہے۔

اس لیے مبارک پوری صاحب کے اعتراض کی یہ شق قطعاً باطل اور مردود ہے اور اسی طرح متولف خیر الکلام (ص ۴۷۳) کا اس کے جواب سے عاجز ہو کر اس کو مصادرہ علی المطلوب کہ کر گلہ خلاصی کرنا بے معنی بات ہے کیونکہ دعوائے یہ ہے کہ عن جابر کا جملہ مسند احمد بن حنبل میں مذکور ہے اور دلیل یہ ہے کہ یہ مسلم ثقات اس کو اسی طرح نقل کرتے ہیں۔ اگر متولف مذکور کا یہ خانہ ساز مصادرہ مضرتے تو تمام کتب حدیث میں یہ جاری ہے کہ اس کا لا یعنی تو پھر کوئی روایت صحیح نہیں ہو سکتی بھلا ایسے ناکام بہانوں سے صحیح حدیث ضعیف قرار دی جا سکتی ہے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔

دوسری شق کا جواب: جہود اہل اسلام کے پاس قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعری، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس بن مالک وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں موجود ہیں۔ لہذا اگر امام طحاوی وغیرہ ائمہ نے حضرت جابر کی یہ روایت اپنے استدلال میں پیش نہیں کی۔ تو کیا بغیر اس روایت کے ان کی ضرورت اور حاجت پوری نہیں ہو سکتی تھی؟ اور کیا ان کے دعوے کی صرف یہی ایک حدیث دلیل رہ گئی تھی کہ بغیر اس کے بیان کرنے کے ان کا دعویٰ ناکام اور تشنہ رہتا؟ ہاں جہاں اور حدیثیں موجود ہیں۔ وہاں ان کی دلیل ایک یہ حدیث بھی ہے اور فرض کر لیجئے کہ ان حضرات کو مسند احمد بن حنبل میں صحیح کی سند سے اس روایت کا علم ہی نہ تھا تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سرف سے یہ حدیث ہی نہ ہو؟ کسی حدیث کا کسی موقع پر بیان نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل کیسے بن گئی؟

علاوہ انہیں امام ابن قدامہ، مارون بن، ابن ہمام، ملا علی قاری اور آلوسی وغیرہ باقاعدہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو مرفوع اور موصول ہی سمجھتے ہیں اور اسی طرح اس کو نقل بھی کرتے ہیں۔

مؤلف خیر الکلام ص ۲۶۳ میں (و نحوہ فی ص ۲۳۸) لکھتے ہیں کہ باقی رہا ارسال اور وصل کا اختلاف اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ راوی اسے مختلف حالات کی بنا پر کبھی متصل بیان کر دیتے ہیں اور کبھی مرسل۔ یہ اختلاف کوئی مضر نہیں۔ ثقہ کی زیادتی اس جگہ قابل قبول ہے۔ انتہی اور یہی ہم کہتے ہیں۔

تیسری شق کا جواب: اگر مسند احمد بن منیع کے نسخہ میں جو حضرات محدثین کرام کے نزدیک متداول کتاب تھی۔ کاتب نے عن جابر کے الفاظ زیادہ کر دیے تھے تو نہ معلوم بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد اور دیگر حدیث کی کتابوں میں کاتبوں نے کیا کچھ شکوے کھلائے ہوں گے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ انھوں نے حذف و اضافہ اور قطع و برید کر کے اصل مضمون کو کیا سے کیا کر دیا ہوگا؟ پھر حدیث کی کتابوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اور شاید اسی بد اعتمادی کی وجہ سے بیشتر غیر مقلد حضرات (مثلاً عبد اللہ چکڑالوی، اسلم جیراچوری، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر احمد الدین وغیرہ) انکار حدیث کے فتنہ میں گرفتار اور مبتلا ہوتے ہیں۔ اور شاید تصحیح حدیث کی یہ شرط ہو کہ اگر مبارکپوری صاحب اور ان کی جانت کسی حدیث کو صحیح قرار دیں تو صحیح ہوگی۔ ورنہ اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

محترم جب سند کے تمام راوی بالاتفاق ثقہ اور ثبت ہیں۔ اور بظاہر اس میں کوئی علت قاعدہ بھی نہیں اور موصول بھی ہے تو بلاوجہ محض ہوائے نفسانی کے لیے کاتب بیچارے پر کیوں ایسا سنگین الزام عائد کیا جاتا ہے؟ اور کیوں طے شدہ قواعد اور اصول سے انحراف کیا جاتا ہے؟ فتح الباری کے حوالہ سے

لہذا یہ کہ سند کے جملہ روایات بالاتفاق ثقہ ہیں۔ سند موصول ہے۔ بظاہر اس میں کوئی علت قاعدہ بھی نہیں پائی جاتی۔ ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ موصول اور مرسل کے جھگڑے میں حدیث مرفوع ہی سمجھی جائیگی۔ ثبوت کو نافی پر ترجیح ہوتی ہے، عدم علم عدم ثبوت کی دلیل نہیں ہوتی۔ عارف کے قول کو جاہل کے قول پر ترجیح ہوتی ہے۔ اسقاط اور اولیٰ محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ یہ تمام اصول ایسے ہیں جو خود مبارکپوری صاحب کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ مگر افسوس کہ عملی طور پر وہ سب سے گریز کرتے ہیں۔ خواہ اسفا۔

یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ادراج و اسقاط محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ادراج مجرد دعویٰ سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ (نیل الاطوار جلد ۱ ص ۳۵۱)

حضرات! یہ ہے مبارکپوری صاحب کا انصاف اور دیانت؟ اس سے بڑھ کر تعصب اور کیا ہو سکتا ہے؟

بصورت مرسل بھی یہ روایت حجت ہے؛

اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جاتے کہ یہ روایت مرسل ہے، تب بھی جہور کا احتجاج اس روایت سے صحیح ہو گا۔ مرسل کی حجیت کے بارے میں ہم پہلے کچھ بحث باحوالہ کر چکے ہیں۔ امام ترمذی لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (کتاب العلل جلد ۱ ص ۲۳۹)

امام نووی لکھتے ہیں کہ امام مالک، ابو حنیفہ، امام احمد اور اکثر فقہائے کرام کا یہ مسلک ہے کہ حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۱۷) علامہ جزائری کا بیان ہے کہ علماء سابقین میں امام شافعی، امام مالک اور امام ابو حنیفہ وغیرہ مرسل حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے۔

(توجیہ النظر ص ۲۴۵) و اعطی فی ذکر الصحاح السنۃ من انواب صاحب (اور نواب صاحب لکھتے ہیں لیکن اعلان بار سال موجب ترک اونیسیت، زیر کہ قبول مراسیل مذہب جمہ از فحول علماء اصول است۔) (دلیل الطالب ص ۳۲۵) اور ایسے مرسل کے حجت ہونے میں جس کی تائید کسی اور حدیث سے ہوتی ہو۔ گو وہ مرسل ہی کیوں نہ ہو۔ سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ امام بیہقی، امام نووی، حافظ ابن القیم اور مبارکپوری صاحب نے اس کی تصریح کی ہے۔

(کتاب القراءة ص ۱۲۳، مقدمہ نووی ص ۱۷، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۵، البکار المنہن ص ۱۳۵) اور مبارک پوری صاحب ایک مقام میں لکھتے ہیں اور مرسل معتقد کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۱) اسی قاعدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ آلوسی یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر حضرت جابر کی یہ روایت مرسل بھی ہو تب بھی مرسل حدیث اکثر ائمہ کے نزدیک حجت ہے تو ہمیں عمل کے لیے یہی کافی اور بس ہے۔ (روح المعانی جلد ۱ ص ۹۱)

یہ حکم تو عام مراسیل کا تھا۔ لیکن اگر کسی دلیل سے حضرت عبداللہ بن شداد کا صحابی ہونا ثابت ہو جائے تو ان کی روایت مراسیل صحابہ کے قسم کی ہوگی اور حضرات صحابہ کرام کے مراسیل

بالاتفاق قابل قبول ہیں۔ بعض محققین کا بیان ہے کہ عبداللہ بن شداد صحابی تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو کتابیں صرف حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات اور سوانح بیان کرنے کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کا ذکر بھی ان کتابوں میں آتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۹۷) حافظ ابو عمر بن عبدالبر الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (جلد ۱ ص ۳۹۹) میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تمہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲ اور تقریب ص ۲۰۷ میں درج ہے۔ ولد علی علیہ وسلم کہ حضرت عبداللہ بن شداد کی ولادت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے عہد اور زمانہ میں ہوئی تھی۔ اور اسی طرح اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ اور تجرید اصحاب الصحابہ میں ان کا ذکر ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں عبد اللہ بن شدادؓ من صفار الصحابہ۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۰۷) کہ عبداللہ بن شدادؓ نو عمر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ جو صحابی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں کافی عرصہ رہا ہو یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنان اسلام سے جہاد کیا ہو یا جس نے آپ کے جھنڈے کے نیچے شہادت کا رتبہ پایا ہو۔ ایسے صحابی کا مرتبہ یقیناً اس صحابی سے زیادہ ہے جس نے آپ کی خدمت اقدس میں کافی وقت نہ گزارا ہو۔ یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنان اسلام سے جنگ نہ کی ہو، یا جس کو آپ کی معیت میں شہادت نصیب نہ ہوئی ہو، یا جس نے آپ سے معمولی گفتگو کی ہو یا تھوڑی مسافت آپ کے ساتھ طے کی ہو۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

اور اسی طرح ان کا درجہ اس صحابی سے زیادہ ہوگا
 جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دور سے
 دیکھا ہو یا جس نے بچپن میں آپ کو دیکھا ہو۔ اگرچہ
 صحابی ہونے کا شرف ان سب کو حاصل ہوگا۔ ان میں
 سے جس نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
 ساعت نہیں کی۔ اس کی حدیث مرسل ہوگی لیکن شرف
 صحبت کی بنا پر ان کا شمار بھی بہ صورت حضرات صحابہ کرامؓ
 ہی میں کیا جائے گا۔

اور اہ علی بعد او حال الطفولیت وان کان
 شرف الصحبۃ حاصلہ للجمیع ومن لیس لہ
 منهم سماع منہ فدیثہ مرسل من حیث
 الروایۃ وھو مع ذلک معدودون فی الصحابۃ
 لما نالوہ من شرف الرویۃ انتہی۔

(شرح تجتہ الفکر ص ۸۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام کا دینی خدمات انجام دینے کی وجہ سے آپس میں یقیناً بہت تفاوت ہے، لیکن مع ہذا جنھوں نے عہد طفولیت اور بچپن کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے جناب رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ ان کا شمار بھی صحابہ میں ہے اور وہ صحابہ میں شامل ہیں اور چونکہ ان کی روایتیں براہ راست جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہیں ہوتیں بلکہ حضرات صحابہ کرام سے ہوتی ہیں۔ اس لیے بعض محدثین کرام نے ایسے صحابہ کو کبار تابعین میں شمار کر دیا ہے۔ وَلِکُلِّ وَجْهٍ مِّنْہُمْ لُجَاۃٌ ۚ وَ اِیْسَٰی صَفَاۃٌ ۙ کِی رَوٰی اٰتِ مَرٰسِیْلِ ہُوۡنَ کِی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۴۷۸ میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کی مرسل اگرچہ بالاتفاق حجت ہے، مگر اس جگہ صحابہ سے وہی لوگ مراد ہیں جنھوں نے سن تیز میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا.... انھیں مگر یہ محض فرار کا ایک ناکام بہانہ ہے امام نووی فرماتے ہیں کہ جہور محدثین کے نزدیک پانچ سال کا بچہ سن تیز کو پہنچ جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے۔ (جو عبد اللہ بن الزبیر کے واقع سے ظاہر ہے) کہ چار سال سے کم عمر میں بھی تیز حاصل ہو جاتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۸۱) اور حضرت عبد اللہ بن شداد جو صحابہ شمار ہوتے ہیں تین چار سال سے کیا کم ہوں گے جب کہ انھوں نے آپ کی زیارت کی ہوگی۔

مراسیل حضرات صحابہ کرام:

مراسیل صحابہ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مراسیل سے حجت صحیح نہیں ہے مگر حضرات صحابہ کرام اور سعید بن المسیب کے مراسیل حجت ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۳۴ عن الوجیز ابو بن برہان) امام بیہقی لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام کے مراسیل حجت ہیں۔ (شرح مسلم جلد ص ۲۸۳ و مقدمہ ص ۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماء کے نزدیک صحابی کا مرسل حجت ہے۔ (شرح منہب جلد ۳ ص ۳۸۳) اور علامہ سیوطی تدریب الراوی ص ۶۶ میں تصریح کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام کے مراسیل حجت ہیں اور التوضیح (نول کشور ص ۲۶۸) میں لکھا ہے فمرسل الصحابی مقبول بالاجماع کہ صحابی کا مرسل اجماعاً مقبول ہے۔ علامہ نیوی لکھتے ہیں کہ صحابی کا مرسل حجت (تعلیق احسن جلد ۲) اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں۔

(نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۴۱) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ و مر اسیل صحابہ حجت است (دلیل انطا
 ص ۳۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ مرسل صحابی محکوم بصحت است بر مذہب صحیح۔
 ایضاً ص ۸۹) اگر فریق ثانی اس قاعدہ کو تسلیم نہیں کرتا تو براہ کرم دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی مرسل
 روایات عموماً اور حضرت عائشہؓ کی بخاری شریف کی پہلی روایت (جس میں بدو الوحی کا ذکر
 ہے اور جو ان کی ولادت سے بھی تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے) خصوصاً اور نیز حضرت
 ابن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں جن میں ابتدائے اسلام کے احکام ہیں۔ کتابوں
 سے خارج کر دیں اور اگر حضرت عبداللہ بن شدادؓ کو تابعی ہی تسلیم کر لیا جیسا کہ تقریباً ص ۲۰۷ میں
 ہے کہ وہ کبار تابعینؓ اور ثقات و فقہائیں تھے۔ تب بھی کوئی ہرج نہیں ہے، چنانچہ امام بیہقیؒ
 فرماتے ہیں کہ

و كذلك مراسيل كبار التابعين اذا انضم
 اليها ما يؤكدها من عدالة رجال من
 ارسل منهم حديثه وشهرتهم واجتنبوا
 رواية الضعفاء والمجهولين۔ (کتاب المقرأة ص ۱۴۳)

اور اسی طرح (جس طرح حضرات صحابہ کے مراسیل
 حجت ہیں) کبار تابعین کے مراسیل بھی حجت ہیں جب
 کہ ان کے روایات میں عدالت اور شہرت موجود ہو
 اور کزور اور مجہول روایات کی روایت سے اجتناب
 وغیرہ کی صفات شامل ہوں۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص غور و فکر اور قلّت غفلت سے متصف ہو کر علمی
 دلائل پر نگاہ ڈالیگا تو وہ کبار تابعین کے مراسیل کے علاوہ دیگر مراسیل سے منقبض ہوگا جس کے
 دلائل ظاہر ہیں۔ (الرسالۃ ص ۶۲ جو کتاب الام کی ساتویں جلد کے آخر منضم ہے)
 الحاصل حضرت جابرؓ کی یہ روایت صحیح اور مرفوع ہے، اس کو مرسل بتلانے کی تمام دلیلیں بیگانہ
 اور لایعنی ہیں اور اگر بالفرض مرسل بھی ہو تب بھی جمہور کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ اور
 خاص طور پر کبار تابعین کے مراسیل تو امام شافعیؒ اور امام بیہقیؒ کے نزدیک بھی حضرات صحابہ کرامؓ
 کے مراسیل کی طرح حجت ہیں اور حضرت عبداللہ بن شدادؓ تو صفار صحابہ میں تھے جن کے مراسیل
 بالاتفاق حجت ہیں۔ خلاصہ امر یہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؓ کے نزدیک کسی روایت کے صحیح
 اور حجت ہونے کے لیے کوئی قاعدہ اور ضابطہ ایسا نہیں ہے جو سو فیصدی اس روایت میں

نہ پایا جانا ہو اگر باوجود اس کے یہ روایت مرفوع اور حجت نہیں ہے تو عالم اسباب میں صحت حدیث کے لیے کوئی اور معیار موجود نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ
 حدیث من کان له امام فقراً الامام له
 من کان له امام فقراً الامام له قراءة
 قراءة من حدیث جابر و له طرق عن
 جماعة من الصحابة وكلها معلولة ...
 انتہی۔ (تلخیص الجدید جلد ۱۸)

متعدد اسانید بالکل صحیح ہیں، اور یہ حدیث حضرت جابر کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرام کی ایک کافی جانت سے بھی مروی ہے، لیکن وہ سب طرق معلول ہیں۔
 مبارک پوری صاحب نے یہ عبارت تحقیق الکلام جلد ۱۸ ص ۱۵۷ اور ابکار المنہج ص ۵۷ میں نقل کی ہے اور اس پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے۔

جواب: یہ روایت متعدد اسانید کے ساتھ حضرت جابر سے مروی ہے۔ امام حاکم نے علم اصول حدیث کی مشہور کتاب معرفت علوم الحدیث میں تیسویں نوع اس موضوع پر قائم کی ہے۔
 هذا النوع من هذا العلم معرفة المشهور من الاحادیث المروية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم.... الخ پھر ان مشہور احادیث کے بعد یہ حدیث بھی بیان کی ہے ومنه من كان له امام فقراً الامام له قراءة اور دیگر متعدد احادیث بھی ذکر کی ہیں پھر فرماتے ہیں فكل هذه الاحادیث مشہورہ باسانیدها و طرقها.... الخ (معرفت علوم الحدیث طبع قاہرہ ص ۹۷) اس سے بھی ثابت ہوا کہ من کان له امام فقراً الامام له قراءة کی حدیث نہ صرف یہ کہ مرفوع اور صحیح ہے بلکہ مشہور حدیث ہے محض تعصب مذہبی میں آکر اس کا انکار کرنا کس قدر ناانصافی ہے اور ایسے ٹھوس ثبوت اور علم ہی کی وجہ سے ہم حافظ ابن حجر کی اس بات کو رد کرتے ہیں اور کم و بیش چالیس سندیں اس روایت کی تو اس ناکارہ اور کوتاہ علم کو بھی معلوم ہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور ان میں ستائیس کے قریب فی الجملہ معلول ہیں ایک صحیح اور مرفوع سند آپ سن اور پڑھ چکے ہیں اور عنتریب چند ایک دیگر صحیح اسانید بمع توثیق روایت ہم آپ سے عرض کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ باقی حافظ ابن حجر کا یہ دعویٰ نہایت مجمل اور بے دلیل ہے اور ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی تصحیح یا تضعیف

بلا دلیل کون سنا ہے؟ بعض علماء کرام نے حافظ صاحب موصوف سے انتہائی عقیدت اور
حسن ظنی کرتے ہوئے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ حافظ صاحب موصوفؒ کی عبارت میں
دو چیزیں ہیں:

(۱) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔

(۲) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے بھی متعدد طرق کے

ساتھ مروی ہے اور کلام معلولہ میں ہاکی ضمیر ان طرق کی طرف راجع ہے جو دیگر حضرات صحابہ
کرام سے مروی ہیں اور ان کی عبارت لکنئہ حدیث ضعیف عند الحافظ سے بھی یہی طرق مروی
ہیں نہ کہ حضرت جابرؓ کی حدیث اور حضرت جابرؓ کی روایت مسکوت عنہا ہے اور یہ حافظ صاحب
کی عبارت کلام معلولہ کی زد میں نہیں آتی اور گویا حافظ صاحب موصوفؒ نے ایک لطیف حیلہ
کرتے ہوئے گول مول حکم صادر کر کے حضرت جابرؓ کی روایت سے گلو خلاصی کرنے کی کوشش فرمائی
ہے، مگر ناکام۔ اگر حافظ صاحب موصوفؒ کی مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے من وعین روایت
کے ایسے ہی الفاظ مروی ہیں جو حضرت جابرؓ سے مروی ہیں اور وہ طرق سب معلول ہیں۔ تو

شاید بظاہر یہ صحیح ہو اور اس صورت میں اس عبارت کی اس سے بہتر توجیہ اور نہیں ہو سکتی
اور اگر مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے جو روایتیں مروی ہیں گویا ان کی روایت کے الفاظ تو
یہ نہیں لیکن ان کا مفہوم اور مضمون اس سے ملتا جلتا ہے اور وہ تمام طرق معلول ہیں تو یہ قطعاً
باطل ہے۔ بطور نمونہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی بعض صحیح روایتیں نقل کر کے ان کے اس دعویٰ کے
بطلان کو آشکار کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اس لیے آپ ان صحیح روایات کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے
حافظ صاحبؒ کے ادھار سے نظر پھیر لیجئے اور یہ نقد وصول کر لیجئے کہ شنیدہ کے بودماند دیدہ یاخذ
ماصفادع ماکدر۔

تیسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ

کی اس حدیث میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ایک
شخص نے ظہر یا عصر کی نماز میں سبح اسم ربك الاصلیٰ کی قرأت کی تھی تو آپ نے اس موقع پر
مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا تھا۔ (کتاب القراءة ص ۱۳۳ و تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۷)

جواب: یہ روایت حضرت جابر رضی سے مروی ہے اور ان کی روایت میں قرأت کو
 مَا زَادَ عَلَى الْفَاتِحَةِ كِي قُرْآتٍ بِرَجُلٍ كَرَأَتْهُ بِمَالٍ بِرَضِي بِهِ قَائِلَهُ كَأَنَّ كِتَابَ كَرَأَتْهُ كِيُو كَرَأَتْ كِيُو كَرَأَتْ
 جابر رضی راوی حدیث اس قرأت سے صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں
 مَنْ صَلَّى رَكْعَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأَمِّ الْقُرْآنِ فَلَمْ
 جس کسی نے نماز کی ایک رکعت بھی ایسی پڑھی جس
 یصل الآ وراء الامام وموطا امام مالك
 میں اس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ادا
 نہ ہوگی مگر ہاں امام کے پیچھے۔

ص ۲۵ و ترمذی جلد ۱ ص ۴۲

اور یہ بات باقر مبارکپوری صاحب اپنے مقام پر آئے گی کہ راوی حدیث (مخصوصاً جب کہ
 صحابی ہو) اپنی مروی حدیث کی مُراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے لہذا حضرت جابر کی اس صحیح
 روایت میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد لینا قطعاً اور یقیناً باطل ہے، یہ یاد رہے
 کہ یہ روایت حضرت جابر سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں
 کہ در حدیث جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ کہ فرمودہ من صلی رکتہ لم یقرأ فیہا بام
 القرآن فلم یصل الا وراء الامام رواه الطحاوی فی معانی الآثار بسند متصل مرفوع ورواه
 الترمذی موقوفاً وقال حسن صحیح... اھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۴) نواب صاحب نے
 جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص ۱۰۴ میں متصل اور مرفوع سند سے مروی ہے۔
 سندیوں سے بجز ابن نصر (امام ابو حاتم) فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور ثقہ تھے۔ امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ
 وہ ثقہ تھے مسلم بن قاسم فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ فاضل اور مشہور تھے۔ امانی الاحبار ج ۱ ص ۳۱، قال حدثنا
 یحییٰ بن سلو (امام بیہقی) فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم ہیں اور اس حدیث کے مرفوع بیان کرنے میں
 ان کا وہم ہے۔ (محصلاً کتاب القراءة ص ۱۱۰) بے شک ان پر بعض نے جرح کی ہے۔ امام دارقطنی ان کی
 لہ امام مالک ابو نعیم وہب بن کیسان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ
 سے سنا۔ انہوں نے یہ ارشاد فرمایا... انہ حضرت امام مالک کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور حضرت جابر جلیل القدر
 صحابی تھے۔ ابو نعیم وہب بن کیسان کا ترجمہ سن لیجئے۔ امام نسائی اور ابن معین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعد ان کو
 ثقہ اور محدث کہتے ہیں عجل ان کو ثقہ اور تابعی کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام احمد بھی ان
 کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۶) امام ترمذی لکھتے ہیں ہذا حدیث حسن صحیح (ص ۴۲)

تضعیف کرتے ہیں اور امام ابن عدنی فرماتے ہیں کہ باوجود ان کے ضعیف ہونے کے ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے امام ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں ربما اخطأ امام ابو زرعة فرماتے ہیں لا بأس به ربما یلهم امام ابو حاتم رح ان کو شیخ اور صدوق کہتے ہیں امام ابوالعرب ان کو من الحفاظ اور من خیار خلق اللہ کہتے ہیں لسان المیزان ج ۶ ص ۲۶۰ و ۲۶۱ الغرض ان کی یہ حدیث حسن و درجہ سے کسی طرح کم نہیں ہے) قال حدثنا مالک عن وهب بن کیسان عن جابر بن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم — (الحديث) لهذا مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۹ میں) یہ مطالبہ بھی پورا ہو گیا کہ حدیث قرآۃ الامام... الخ بصورت مرفوعہ زیر بحث ہے غرضیکہ یہ ارشاد مطلق اور صریح ہے اس کو محض لفظوں کی کراہت سے مقید کرنا اور محل قرار دینا جیسا کہ مؤلف مذکور نے ص ۱۵۵ میں کیا ہے بالکل باطل ہے اور اسی طرح اس کو رکوع والی رکعت سے مقید کرنا بلا دلیل ہے۔ نماز صرف وہی رکعت نہیں بلکہ تمام رکعات نماز اور صلوٰۃ ہے اور امام موفق الدین ابن قدامہ اور علامہ شمس الدین الحنفیؒ بھی اس روایت کو مرفوعہ روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ رواہ الخلال عن جابر رض ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا بام القرآن فی حداج الا وان یکن وراۃ الامام (معنی جلد ۱ ص ۶۰۶ واللفظ لہ وشرح مقنع جلد ۲ ص ۱۲) یعنی آل حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نماز بھی سورۃ فاتحہ کے بغیر پڑھی جائے تو وہ ناقص ہو جاتی ہے مگر ہاں یہ کہ امام کے پیچھے ہو۔ باقی ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص کا سبج اسم ربک الوجلے کی قرأت کرنا تو اس حدیث کا سیاق ہی بالکل الگ اور جدا ہے۔ وہاں ان بعضکم خالجنہا کے الفاظ موجود ہیں (دیکھئے مسلم جلد ۱ ص ۱۴۶) اس لیے خارجی اور بیرونی قرآن پڑھنے کی بجائے خود حضرت جابر کا بیان اور تفسیر زیادہ قابل قبول ہے اور ان کی مرضی کے خلاف اس روایت میں قرأت کو مازاد علی الفاخرہ پر حمل کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ علاوہ بریں حدیث نمبر ۲۱ میں حضرت جابر رض کی مرفوعہ حدیث میں ام القرآن کا خاص لفظ موجود ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

چوتھا اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضی کی حدیث سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح نہیں ہے۔ اور حضرت عبادہ بن الصامت کی روایت سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح ہے لہذا حضرت عبادہ کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۶۵)

جواب: حضرت عبادہ الصامت کی روایت جو صحیح اور صریح ہے وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہے۔ اس کا مقتدی سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ بیان ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور جو روایت حضرت جابر رضی کی ہے، وہ مقتدی کے حق میں ہے۔ اور حضرت جابر رضی کی اپنی صریح اور صحیح روایت میں مذکور ہے کہ قرأت سے سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد ہے، علاوہ انہیں لفظ قرآنہ مصدر ہے جو مضاف ہے اور عربی کے طے شدہ قاعدہ کے لحاظ سے یہ سورۃ فاتحہ اور غیر فاتحہ ہر قسم کی قرأت کے تحت شامل ہے۔ چنانچہ امیر سیکیاری لکھتے ہیں کہ ان لفظ قرآنہ الامام اسو جنس مضاف یعم کل ما یقرأہ الامام (سبل السلاہ جلد ۱ ص ۲۶۲) بے شک لفظ قرآنہ الامام اسم جنس ہے جو مضاف ہے اور یہ ہر اس قرأت کو عام ہے جو امام پڑھتا ہو۔ اور نواب صاحب لکھتے ہیں کہ زیرا کہ مصدر مضاف یکے از صیغ عموم باشد کما تقدروا فی الاصول وقرآنہ الامام ویرس جہا مصدر مضاف واقع شدہ پس شامل جمع قرأت امام باشد وایں عموم مخصوص است باحدیث صحیحہ مثل حدیث عبادہ رضی... الخ (دلیل الطالب ص ۲۹۳) لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ کے حوالہ سے آئے گا کہ حضرت عبادہ کی خلف الامام کی قید سے کوئی تروا صحیح نہیں لہذا تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مولف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان آثار میں فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے اور قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۱) الخ اور حضرت جابر رضی کی تروا کو سورۃ فاتحہ کے بارے میں غیر صریح کہنا ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ یہی حضرت عبادہ رضی کی خلف الامام کی قید اور مضمون سے روایت تو اپنے مقام پر پوری تفصیل آئیگی کہ ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اندر میں حالات حضرت جابر رضی کی حدیث کا حضرت عبادہ رضی کی حدیث سے تعارض قائم کر کے ثانی کو اول پر ترجیح دینا صرف تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔

پانچواں اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حدیث من کان له امامہ
فقراً الامام سے تو نفس کفایت ہی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ خلفیہ امام کے پیچھے قرأت
کی ممنوعیت اور حرمت بھی ثابت کرتے ہیں۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۴۴)

جواب: قرأت خلف الامام کی ممنوعیت اور حرمت کے صرف خلفیہ ہی قائل
نہیں، بلکہ جمہور اہل اسلام ان کے ساتھ ہیں خصوصاً جہری نمازوں میں جس کی پوری تحقیق گذر
چکی ہے اور جمہور اہل اسلام عموماً اور خلفیہ نے خصوصاً یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ ہم نفس کفایت
حرمت اور ممنوعیت وغیرہ سب کچھ اس ایک روایت ہی سے ثابت کرتے ہیں؟
نفس کفایت اس روایت سے معلوم ہو گئی اور فریق ثانی کی یہ رٹ تو باطل ہو گئی کہ جو شخص
امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیگناہ ہے
اور باطل ہے۔ باقی رہی ممنوعیت اور حرمت وغیرہ تو دیگر احادیث سے اور قرآن کریم کی
نص فاستمعوا وانصتوا اور حدیث واذا قرأ فانصتوا وغیرہ سے ثابت ہے کیونکہ صیغہ
امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ
وسلم کے امر کی مخالفت حرام بھی ہے اور ممنوع بھی جیسا کہ پہلے نواب صاحب کے حوالہ سے یہ
بات ثابت کی جا چکی ہے۔

چھٹا اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم
ہوتا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی
حالانکہ احناف کہتے ہیں کہ اگر کھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو۔ تو نماز جائز ہے۔
تو خلفیہ کا عمل بھی حدیث جابر پر نہ ہوا۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۲۱۴)

جواب: مبارک پوری صاحب نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے بعض فقہائے
کرام کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں لیکن کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں کہ جتنی حدیثیں آں حضرت صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں ہر ہر حدیث آپ کی فرمودہ نہیں ہے۔
اور نہ عملی طور پر آپ سے ثابت ہے، بلکہ ان میں بہت حدیثیں جعلی، خانہ ساز، ضعیف،
شاذ، منکر اور معلول وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نہ توفیق حنفی

کی ہر ہر چیز تالی امام ابو حنیفہ رحمہ کی فرمودہ ہے اور نہ ہر ہر چیز تالی قابل عمل ہے اور مجتہد کا مصیب اور غلطی ہونا اس پر مستزاد ہے۔ پھر بعض فقہار کی غیر معصوم آرا کو حتمی اور ضروری سمجھ کر تمام احناف کا مسلک بتانا اور پھر اس پر اعتراض کی بنیاد رکھنا محض باطل اور مردود ہے۔ اور اگر بعض نے ایسا لکھا ہے تو اس کو سہو نسیان پر حمل کرنے کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا اور احکام عمد و سہو میں فرق مخفی نہیں ہے۔ (دیکھئے بدور الابلہ ص ۷۱ وغیرہ) لیکن مسئلہ زیر بحث میں تو حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ سے یہ روایت منقول ہے کہ پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۃ فاتحہ ضروری ہے اور اسی روایت کو حافظ ابن ہمام نے پسند کیا اور ترجیح دی ہے (فصل الخطاب) اور حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن ہمامؒ اور علامہ بدر الدین عینیؒ (وغیرہ) نے ثمر افعال ذلک فی صلاتک کلاھا کی حدیث سے پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۰۰) اور نیز علامہ سندھی حنفیؒ (المتوفی ۱۱۲۰ھ) اسی حدیث سے ہر ایک رکعت میں وجوب سورۃ فاتحہ پر احتجاج کرتے ہیں (سندھی علی البخاری جلد ۱ ص ۹۵) اور اسی طرح دیگر محققین علماء احناف بھی پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۃ فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لہذا مبارکپوری صاحبؒ کا قیاس ساقط الاعتبار ہے جملہ علماء احناف پر یہ اعتراض تو ہرگز وارد نہیں ہو سکتا۔ البتہ مبارکپوری صاحبؒ کا مقدمہ کو اللہم اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ الایۃ پڑھنے کا حکم دینا (دیکھئے ابکار المنن ص ۱۱۷ وغیرہ) یقیناً حدیث (تقرأوا بشئ من القرآن کے مخالف ہے۔ سا تو اں اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث فقرۃ الامام لہ میں لہ کی ضمیر حرف من کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ یہ ضمیر الامام کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں حدیث کا معنی یہ ہو گا کہ جس شخص نے امام کی اقتدا کی۔ تو امام کی قرأت صرف امام کے لیے ہے یعنی مقتدی کو اپنی الگ اور جدا قرأت کرنا ہوگی۔ (بمعنا تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۸)

جواب: یہ اعتراض یا بزعم خود جواب محض بیہودہ اور لغو ہے: اولاً۔ اس لیے کہ سو فیصد

لہ یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۵ مسلم جلد ۱ ص ۱ اور نسائی جلد ۱ ص ۱۲ وغیرہ میں مروی ہے۔

۲۔ یہ قاعدہ ہدایت النخو ص ۱۶ کافید ص ۱ جامی ص ۶، مفصل ص ۱۵، رضی جلد ۱ ص ۹۶۔ متن متین ص ۱۶ سوال

کابلی ص ۱۲ اور سوال باسولی وغیرہ نحو کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔

نجات کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جب جملہ خبر واقع ہو تو لا بد می ہے کہ اس جملہ میں ربط پیدا کرنے والی کوئی چیز ہو مظهر ہو یا ضمیر جو مبتدا کی طرف راجع ہو، عام اس سے کہ مذکور ہو یا یا مقرر اس حدیث میں من کان له امام حرف من مبتدا ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اور جملہ فقہاء الامام له قرأۃ اس کی خبر ہے جو جزا پر مشتمل ہے۔ اگر لہ کی ضمیر حرف من کی طرف راجع نہ ہو تو مولانا مبارکپوری صاحب اور ان کے اتباع ہی یہ ارشاد فرمائیں کہ من کی طرف کوئی ضمیر راجع ہوگی یا ربط پیدا کرنے والی یہاں کیا چیز ہے؟ کیا علم نحو فریق ثانی سے اتنا مرعوب یا ان کا اتنا خیر خواہ ہے کہ اس کو یہاں اپنا عمل کرنے کی توفیق ہی نہیں اور نہ اس میں اس کی ہمت اور جرات قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیے کہ مبارکپوری صاحب (مع اپنے اتباع کے) کیسے جگر اور دل کے مالک ہیں کہ حضرات محدثین کرام کے تمام طے شدہ اصول اور ضوابط کو روندتے آئے ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اور ابھی سے

ابتدا نے عشق ہے روتا ہے کب آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کب

اور ان کی یہ ستم ظریفی بھی دیکھئے کہ وہ کس بے جگری کے ساتھ گری اور نحو کے مسلمات کو بھی پامال کرتے جا رہے ہیں جن کے تسلیم کرنے میں غیر مسلموں اور دہریوں کو بھی کبھی تا مل نہیں ہوا۔ مولف خیر الکلام ص ۴۹۵ میں لکھتے ہیں کہ بلکہ ضمیر مقرر بھی ہو سکتی ہے جیسے اَلْبُرْمَنُوَانِ بَدْرُهُو الخ الجواب: بے شک مقرر بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہاں جہاں ظاہر اور مذکور نہ ہو یہاں مقرر ماننے کا کون سا داعیہ ہے جبکہ ضمیر ظاہر موجود ہے؟ باقی علامہ ابوالحسن حنفی سندھی کے حاشیہ ابن ماجہ ص ۱۲۵ کے حوالہ سے جو عبارت مولف خیر الکلام نے ص ۴۹۲ میں اپنی تائید کے لیے نقل کی ہے۔ قَبْلَ يَحْتَمِلُ... الخ تو لفظ قبل سے علامہ موصوف نے اس کی تریض اور تضعیف کر دی ہے کیونکہ عموماً یہ لفظ تریض کے لیے آتا ہے نہ وہ اس تاویل پر راضی ہیں اور نہ یہ ان کا اپنا قول ہے جیسا کہ مولف خیر الکلام نے ص ۴۹۲ میں یہ لکھ کر علامہ ابوالحسن حنفی نے بھی ضمیر مقرر نکالی ہے راہ فرار اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صحیح بات سمجھنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔

دو ثانیاً۔ چونکہ فریق ثانی کا عامل بالحدیث ہونے کا دعویٰ ہے (اور ان کے زعم میں دوسرے لوگ جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں صرف فقہ اور اماموں کے قول سے احتجاج کیا کرتے

ہیں) اس لیے بطور نمونہ صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس خود ساختہ قاعدہ کے تحت ان کا مطلب ہمیں سمجھا دیا جائے :

(۱) من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته (بخاری وغیرہ) آپ کے اس قاعدہ کے

رُوسے اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی حاجات پوری کرتا رہتا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(۲) من فرح عن مسلم كربة فرح الله عنه (بخاری وغیرہ) آپ کے اس قاعدہ کے لحاظ

سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے مصائب دور کرتا ہے (عیاذ باللہ تعالیٰ)

(۳) من بنى لله مسجداً بنى الله له بيتاً في الجنة (متفق علیہ) آپ کے گھر پورضا بط

کے لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ) (من عادی

لی ولیا فقد بارذته بالحرب۔ (صحیحین) آپ کے خود ساختہ قانون کے لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ

تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنگ کرنے کا چیلنج کرتا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) اسی طرح من كان لله كان الله له ،

ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه اور من كنت مولاه فعلي رضاً مولاه وغیرہ وغیرہ

سینکڑوں حدیثیں ایسی ہیں جن میں اس خانہ ساز قاعدہ کو جاری کرنے کے بعد نہ توحید باقی رہ سکتی ہے۔

اور نہ اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ اور برائت ثابت ہو سکتی ہے اور اسی طرح اسلام کے دیگر اہم مسائل

کا ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس فصیح العرب والعم کی ذات گرامی کی طرف ایسے مہمل احکام

منسوب ہوتے ہیں جن کی فصاحت و بلاغت مسلم چلی آتی ہے کہ نہ تو آج تک آپ کے اس فن میں

کوئی نظیر پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔ ع

بعد از حدیث بزرگ توئی قصہ مختصر

آٹھواں اعتراض: بعض نہایت سطحی قسم کے دوست یہ کہہ یا کرتے ہیں کہ اگر امام کی قرأت

مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔ تو مقتدیوں کو رکوع، سجود اور تشہد وغیرہ امور ادا کرنے اور تسبیحات

پڑھنے کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہیے کیونکہ امام ہی سب کچھ کرتا ہے گا بلکہ لوگوں کو اپنے گھروں میں

آرام سے بیٹھا رہنا چاہیے۔ امام خود سب کچھ ادا کرتا ہے گا۔ (ایک صاحب)

جواب: امام مقتدی کی طرف سے صرف قرأت قرآن میں کفایت کرتا ہے جیسا کہ آیت واذا

قرأ القرآن... الآية۔ اور حدیث واذا قرأوا من فأنصتوا وغیرہ دلائل بسط اور تفصیل کے ساتھ

پہلے نقل کئے جا چکے ہیں اور نواب صاحب کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے کہ مقتدی کو مانعت
 صرف قرأت کی ہے اور حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی کہو۔ جب
 وہ رکوع اور سجدہ وغیرہ کرے تو تم بھی کرو۔ ہاں مگر جب امام قرأت شروع کرے۔ تم خاموش
 رہو۔ اس لیے باقی امور کو قرأت پر قیاس کرنا مع الفارق ہونے کے ساتھ نص کے مقابلہ میں ہے
 جو ہر طرح سے مردود ہے۔ بہر حال حضرت جابرؓ کی یہ مرفوع حدیث سندا و معنی بالکل صحیح
 ہے اور جمہور کی دلیل اور حجت ہے البتہ حقائق سے چشم پوشی کرنے کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔
 نواں اعتراض: مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم صرف اس قدر ہے
 کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ مولانا عبدالحیؒ لکھنوی فرماتے ہیں کہ امام کی قرأت
 کا مقتدی کے لیے حکمی قرأت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شارع نے مقتدی کو امام کی قرأت سے
 قاری کے حکم میں کیا ہے اور اس کو اس کا ثواب عطا کیا ہے (عمدة القاری جلد ۱ ص ۱۴۲) جیسا کہ
 حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھ کر نماز کا منتظر ہو وہ نماز میں ہوتا ہے پس ثابت
 ہوا کہ یہ حدیث قرأت خلف الامام کے منافی نہیں۔ (محصلة ص ۱۲۹، ص ۱۳۰)

الجواب: یہ سب کچھ قلت فہم کا نتیجہ ہے، مولانا عبدالحیؒ نے بحوالہ علامہ عینیؒ اس
 شبہ کا جواب دیا ہے کہ جیسا اور ظاہر تو امام قرأت کرتا ہے پھر اس کی قرأت کو مقتدی کی قرأت
 کیوں قرار دیا گیا ہے۔ جواب یہ دیا کہ جتنا ثواب امام کو ملے گا شریعت نے اتنا ہی ثواب مقتدی
 کے لیے بیان کیا ہے کہ اگرچہ وہ خاموش بھی رہے گا۔ (جیسا کہ ما زاد علی الفاتحہ میں وہ خاموش
 رہتا ہے) تب بھی اس کو پورا ثواب ملے گا نہ یہ کہ وہ پیچھے پڑھتا بھی رہے جیسا کہ منتظر صلوات کو
 نماز کا ثواب ملتا ہے یہ مطلب تو مرگزی نہیں کہ وہ بیٹھا بھی رہے اور ساتھ ہی وہ رکوع و سجدہ
 وغیرہ کی حرکات بھی کرتا رہے یہ تو دو متضاد چیزیں ہیں یہ بھلا کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ ہاں
 جس طرح منتظر نماز کو اپنے وقت میں حکمی نماز کا ثواب ملتا ہے اور جب وہ دوسرے موقع
 پر نماز ادا کرے گا تو اس کو حقیقی نماز کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح نمازی کو سجالت اقتدار حکمی
 قرأت کا ثواب ملتا ہے اور فراغت امام کے بعد جب بلسوق اپنی قرأت کرے گا یا وہ منفرد
 ہو کر نماز پڑھیگا تو اس کو حقیقی قرأت کا ثواب ملے گا۔ اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو حکمی نماز کے

ساتھ تشبیہ اور تنظیر درست نہیں ہے کیونکہ حقیقی اور حکمی نماز و الگ الگ حالتوں میں ہوتی ہے۔ کما
 لا یخفی۔

بارھویں حدیث !

امام احمد فرماتے ہیں کہ ہم سے اسود بن عامر نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسن بن صالح[ؒ]
 نے بیان کیا اور وہ ابو الزبیر[ؒ] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابر رضی[ؓ] سے، وہ فرماتے ہیں کہ
 آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من كان لئلا امام فقرأة الامام له قرأة
 یعنی جس آدمی نے امام اقتداء کر لی ہو تو امام کی
 قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے۔

لہ علامہ ذہبی[ؒ] ان کو حافظ اور احادیث کثرت کے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۵) امام ابن معین[ؒ] ان کو لباس بہ
 اور ابن مدینی[ؒ] ان کو ثقہ اور ابو حاتم[ؒ] ان کو صدوق اور صالح اور ابن سعد ان کو صالح فی الحدیث کہتے ہیں۔ اور
 ابن جبان[ؒ] ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۴۴) اور حافظ ابن حجر[ؒ] ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب^{۳۹})
 لہ علامہ ذہبی[ؒ] ان کو الامام اور القدوة لکھتے ہیں۔ ابو حاتم[ؒ] ان کو ثقہ حافظ اور متقن کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۱) امام
 احمد ان کو ثقہ اور ابن معین[ؒ] ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، امام ابو زرہ[ؒ] ان کو متقن فقیہ عابد اور زاہد کہتے ہیں،
 ابن جبان[ؒ] ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، ابن سعد ان کو فقیہ، حجت، صحیح الحدیث اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔
 دارقطنی[ؒ] ان کو ثقہ اور عابد کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۵) حافظ ابن حجر[ؒ] لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ
 فقیہ اور عابد تھے (تقریب ص ۸۶)

لہ ابو الزبیر کا نام محمد بن مسلم بن تدریس تھا۔ علامہ ذہبی[ؒ] ان کو حافظ اور المکثر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۹)
 امام ابن معین[ؒ]، نسائی[ؒ] اور یحییٰ القطان[ؒ] ان کو ثقہ کہتے ہیں، یعقوب بن شیبہ[ؒ] ان کو ثقہ اور صدوق اور ابن مدینی[ؒ]
 ان کو ثقہ اور ثبت اور ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدی[ؒ] ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن جبان[ؒ] ان کو ثقات
 میں لکھتے ہیں۔ محدث سابق کا بیان ہے کہ وہ احکام میں حجت تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۴) عطار[ؒ] بن
 ابی رباح کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابر[ؓ] سے احادیث کی سماعت کر کے واپس آتے اور آپس میں مذاکرہ اور تکرار
 کرتے تو ابو الزبیر[ؒ] حفظ روایات اور ان کی ادائیگی میں ہم سب سبقت لے جاتے تھے (ترمذی جلد ۲ ص ۲۴۰ و مسند دارمی[ؒ] ص ۶۹)
 لکھ یہ روایت مسند جلد ۱ ص ۳۲۹، شرح مقنع للبکیر جلد ۱ ص ۱۱، فتح الملہم جلد ۱ ص ۲۲ اور بغیۃ الالعی جلد ۲ ص ۲ وغیرہ
 کتابوں میں موجود ہے۔

اس حدیث کا مطلب اور مفہوم بھی بلکہ من وعن الفاظ بھی وہی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں اور یہ روایت سابق کی طرح اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس روایت کے جملہ روایت ثقہ اور ثبت ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس سند پر فریق ثانی کی طرف سے کوئی اعتراض راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوالزبیر مدلس تھے اور وہ اس روایت کو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوال باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جبہ اور محمد بن ابوالزبیرؒ کی معنی حدیثوں کو صحیح سمجھتے ہیں (زاد المعاد جلد ۴ ص ۶۵)

و ثانیاً۔ پیٹے توجیہ النظر کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ ابوالزبیرؒ کا شمار ان مدلسین میں ہے جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔ ایک سند یوں آتی ہے عن ابی الزبیر عن سعید بن جبیرؒ... الخ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں۔ ہذا اسناد صحیح (جلد ۱ ص ۱۳۳) امام دارقطنیؒ ان کی معنی سند کو بھی صحیح کہتے ہیں۔

و ثالثاً۔ حضرت عبداللہ بن شداد وغیرہ ان کے ثقہ متابع موجود ہیں۔ بہر حال یہ روایت متصل اور صحیح ہے، اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ شمس الدینؒ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں۔

و ہذا اسناد صحیح متصل رجالہ کلہم ثقات۔ کہ یہ سند صحیح اور متصل ہے اور اس کے تمام راوی (شرح مقع للکبیر جلد ۲ ص ۲۸۱ بر حاشیہ معنی) ثقہ ہیں۔

حافظ شمس الدینؒ کا ترجمہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے اور علامہ ذہبیؒ ان کو امام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص ۲۶۲) مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۸۱ و ص ۲۸۱ میں دارقطنیؒ اور بیہقیؒ کی روایتوں کا سہارا لے کر حسن بن صالحؒ اور ابوالزبیرؒ کے درمیان جابرجہفی کا واسطہ بتایا ہے مگر مسند احمد کی سند میں کوئی واسطہ نہیں اور یہ روایت صحیح اور متصل ہے جیسا کہ ابھی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے عرض ہو چکا ہے۔

تیسرے حدیث: امام ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے مالک بن اسماعیلؒ نے بیان کیا وہ حسنؒ لے علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، عدیم النظر، الثبت اور الخیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۸) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: باقی حاشیہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ اگلے

بن صالحؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو الزبیرؓ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کل من کان له امام فقرأتہ له قرآۃ۔

(الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹)

پہر وہ شخص جس نے امام کی اقتدار کر لی ہو تو امام کا پڑھنا اس کا پڑھنا ہے۔ اس روایت کے بھی تمام راوی ثقہ ہیں، علامہ ماروقیؒ فرماتے ہیں ہذا اسناد صحیح (الجوہر النقی) کہ یہ سند بالکل صحیح ہے۔ چودھویں حدیث: امام عبد الرحمنؓ بن حمیدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو نعیمؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسن بن صالحؓ نے بیان کیا وہ ابو الزبیرؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

من کان له امام فقرأتہ له قرآۃ

کہ جس کا امام قرأت کرتا ہو تو اس کے امام کی قرأت ہی اس مقتدی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی صحیح ہے، علامہ آلوسیؒ اس کو علی شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (روح المعانی جلد ۵ ص ۱۳۷)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ نمبر ۱۸۱) ہیں کہ وہ احد الامام ومن ائمتہ الامام تھے اور فرماتے ہیں کہ انھوں نے مصنف نامی ایک کتاب لکھی ہے نہ ان سے پہلے کسی نے ایسی کتاب لکھی ہے اور نہ بعد (البدایہ جلد ۱ ص ۳۱۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۲۱۳)

۱۵ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور ائمتہ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۶۴) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور متقن کہتے ہیں (تقریب ص ۲۲۴) امام نسائیؒ، عیسیٰ بن ابی حاتمؒ اور یعقوب بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شائبہؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق، ثابت، متقن اور امام الائمہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۰۲) باقی روایات کی توشیح گزر چکی ہے۔

۱۶ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور حافظ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کان من الامام تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰۲) ان کی وفات ۲۲۹ھ میں ہوئی ہے۔

۱۷ ان کا نام فضل بن دکیں تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور الثبت کہتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۳۳۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۰۳) باقی روایات کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

۱۸ یہ روایت ابوہریرہؓ پر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹، فتح القدير جلد ۱ ص ۲۳۹، شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳ اور روح المعانی جلد ۱ ص ۱۳۷ وغیر میں موجود ہے۔

اعراض: مبارکپوری صاحب نے لکھتے ہیں کہ مسند عبد بن حمید کے قلمی نسخہ ص ۲۲ میں (جو مولانا شمس الرحمن کے کتب خانہ میں موجود ہے) حسن بن صالح کے بعد جابر جعفی کا نام موجود ہے۔ اور جابر مذکور ضعیف تھا۔ کیونکہ بعینہ یہ روایت دارقطنی جلد ۲ ص ۲۶ اور کتاب القراءة ص ۱ میں مذکور ہے اور ان میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لہذا یہ روایت کمزور ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۱)

جواب: نہ معلوم مبارکپوری صاحب نے اتنے زود فراموش کیوں واقع ہوئے ہیں؟— ع:

تمہیں عادت ہے بھول جانے کی

اگر کاتب کا قلم سزا صحیح بن منج کے نسخہ میں عن جابر کا جملہ زیادہ لکھ سکتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ عبد بن حمید کے قلمی نسخہ میں جابر جعفی کا جملہ نہیں لکھ سکتا؟ وہ کوئی بڑا منطقی اور فلسفی قلم ہے۔ کہ بظاہر مطبوعہ نسخوں میں تو کام کر سکتا ہے لیکن زاویہ قبول میں پڑے ہوئے قلمی نسخہ میں مجبوراً چار ہو کر رہ جاتا ہے؟ وہ قلم تھا یا کسی یونیورسٹی کا ماہر پروفیسر تھا؟ کیا بعید ہے کہ وہ قلم تقدیر ہی ہو جو مبارکپوری صاحب کی بگڑھی ہوئی قسمت کو سنوارنے کے لیے پھر ایک مرتبہ چل پڑا ہو؟

حافظ شمس الدین ابن قدامہ کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ حسن بن صالح کی ابوالزبیر سے روایت کو متصل بیان کرتے ہیں اور اس کی تصریح کرتے ہیں والحسن بن صالح ادرك ابوالزبیر (جلد ۲ ص ۱۱۱) کہ حسن بن صالح نے ابوالزبیر اور ان کے زمانہ کو پایا ہے۔ اور اصول حدیث کا یہ قاعدہ ہے (جیسا کہ مسلم شریف کے مقدمہ وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے) کہ جمہور محدثین کے نزدیک اتصال سند کے لیے امکان لقار کافی ہے۔

حسن بن صالح کی ولادت ۱۰۰ھ میں ہوئی ہے اور ابوالزبیر کی وفات ۱۲۸ھ میں (دیکھئے تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۱۹ وغیرہ) اگر اٹھائیس سال کے اس طویل عرصہ کے اندر بھی امکان لقار ثابت نہیں ہو سکتا اور سند متصل نہیں ہو سکتی تو سرے سے فن روایت اور حدیث کا ہی انکار کر دیجئے اور منکرین حدیث کی طرح یہ کہتے ہوئے حدیث سے سبکدوشی اختیار کر لیجئے کہ

یہ اُمت روایات میں کھو گئی

حقیقت خرافات میں کھو گئی

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۱ میں لکھتے ہیں کہ مگر حدیث کے فن کی بنیاد ہر جگہ امکان پر نہیں ہوتی اس

میں وقوع کو بھی دیکھا جاتا ہے.... الخ

الجواب: یہی وہ غیر صحیح نظریہ ہے جس کو امام مسلم نے صحیح کے مقدمہ میں پُر زور الفاظ سے رد کیا ہے اور اتصالِ سند کے لئے غیر مدلس میں امکانِ تقار کو کافی سمجھا ہے اور یہی نظریہ جمہور محدثین کرام نے اپنا یا ہے۔ علاوہ ازیں خود مؤلف تہذیب الکلام ص ۲۲۳ میں لکھتے ہیں کہ کیونکہ صحتِ حدیث کے لیے صرف استاد اور شاگرد کی ملاقات کا ممکن ہونا کافی ہے۔ عدم ثبوتِ نفی لازم نہیں آتی۔ اھ بلقظہ اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ دوسرے کی معقول بات کو توڑ ٹوڑ دینا کہاں کا انصاف ہے؟

علاوہ ازیں امام احمد ابو بکر بن ابی شیبہ، شمس الدین بن قدامتہ حافظ مزنی، علامہ ماروینی، حافظ ابن ہمام، ملا علی قاری اور علامہ آلوسی وغیرہ یہ سند اسی طرح نقل کرتے ہیں عن حسن بن صالح عن ابی الزبیر... الخ اور اس میں جابر جعفی کا ذکر تک نہیں کرتے۔ مگر شوخی قسمت کا کیا کہنا کہ ان کو نہ تو قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے اور نہ مہربان قلم مل سکا ہے۔ ورنہ ذرا سی جنبش ان کے لیے بھی کر ہی گذرتا۔ ع:

کَلْبُ مَانِيزِ زَبَانِے وَبِیَانِے دَارِدِ

رہا دارقطنی اور بیہقی کی سند میں حسن بن صالح اور ابو الزبیر کے درمیان جابر جعفی کا واقع ہونا تو یہ اس پیش کردہ سند کے عدم اتصال کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ حسن بن صالح نے یہ روایت براہِ راست ابو الزبیر سے بھی سنی ہو۔ اور جابر جعفی سے بھی سنی ہو۔ کسی وقت وہ ابو الزبیر سے روایت بیان کرتے ہوں گے اور کسی وقت جابر جعفی سے یا یوں کہ لیجئے کہ

۱۔ باقی حضرات کے حوالے اور ان کے تراجم آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، حافظ مزنی نے اپنی کتاب اطراف میں یہ سند یوں ہی نقل کی ہے اور اس میں جابر جعفی کا ذکر نہیں ہے۔ (دیکھئے الجبر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹) علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ جمال الدین ابو النجاشی یوسف بن الزکی المزنی (المتوفی ۶۴۲ھ) العالم، الحبر، الحافظ، الادب، محدث الشام، ثقہ، حجت اور کثیر العلم تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ طبقات رجال اور معرفت روایات میں کبھی کسی آنکھ نے ان کا نظیر نہیں دیکھا ہوگا (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۱)

۲۔ علامہ ذہبی اور حافظ ابن کثیر نے کوان سے شرف تلمذ حاصل ہے: ع

این خاندہ ہمہ آفتاب است

جب صحت حدیث کا خیال ہوگا اس وقت ابو الزبیر کا طریق بیان کر دیتے ہوں گے اور جب محض روایت پیش کرنا ہی مد نظر ہوتا ہوگا اس وقت وہ جابر جعفی کی سند روایت بیان کر دیتے ہوں گے اور فن حدیث میں اسکی بجز نثر مثالیں موجود ہیں اور علماء اصول اسکا اپنی اصطلاح میں المنزید فی متصل الاسانیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں اگر بعض طرق میں روایت اور مروی حدیث کے درمیان زائد مروی آجائے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ جس طریق میں زائد مروی کا تذکرہ نہیں ہوا۔ وہ منقطع ہو یا اس سے عدم لقار ثابت ہو (دیکھئے شرح نخبہ الفکر ص ۴۵ وغیرہ) حضرت مولانا محدث محمد حسن صاحب فیض پوری لکھتے ہیں کہ ابو الزبیر سے ذیل کے حضرات روایت کرتے ہیں۔ الحسن بن صالح جیسا کہ مسند احمد وغیرہ کا حوالہ ہم نے دیا اور ایوب السخستانی نے بھی۔ (موطائما محمد و کتاب القراءۃ) اور عبداللہ بن لہیعہ بھی (کتاب القراءۃ) اور الفضل بن عطیہ (کتاب القراءۃ) اور جابر جعفی اور لیث بن ابی سلیم بھی (طحاوی جلد ۱۷ و دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶) (الدلیل المبین ص ۲۶) اگر مبارک پوری صاحب اس پر بضد ہیں کہ کاتب صاحب کی غلطی ہی تسلیم کی جائے تو تب ہی دل کو تسکین ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ تو لیجئے ہم ان کی اس ضد کو بھی مان لیتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اصل عبارت یوں ہو:

عن الحسن بن صالح و عن جابر الجعفی... الخ مطلب یہ ہوا کہ ابو نعیم نے حسن بن صالح اور جابر جعفی دونوں سے روایت کی ہو، لیکن کاتب سے قلمی نسخہ میں صرف حرف واؤ چھوٹ گیا ہو، کیونکہ واو کا کاتب میں چھوٹ جانا بہت آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی دیانت دار کاتب کا قلم عن جابر زیادہ لکھ دے۔ اگر کاتب کی غلطی کی تو جہد و تاویل ہی معتبر ہو سکتی ہے تو یوں کیوں نہ ہو جاتے؟ بلکہ ابن ماجہ ص ۱ کے بعض نسخوں میں اصل عبارت ہی اسی طرح ہے جس طرح ہم نے تحریر کی ہے۔ عن الحسن بن صالح و عن جابر... الخ اور مولف خمیر الکلام نے ص ۲۸۱ میں اس کو دینی زبان سے تسلیم کیا ہے۔

پندرہویں حدیث: امام محمد فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہ نے بیان کیا فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن ابی عائشہ نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن شداد سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابر سے، انھوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کان له امام فقراءۃ او امام لدقراءۃ (موطاء امام محمد ص ۱) کہ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کو کافی ہے اور بس، اسج

اگلی قرأت نہیں ہے۔ یہ روایت کتاب آثار لابن یوسف ص ۲۱۱ اور طحاوی جلد ۱ اور کتاب آثار لمحمد ص ۱۱ میں بھی ہے
مؤلف خیر الکلام ص ۳۸۲ میں لکھا ہے کہ محدثین کہتے ہیں اس میں نام ابو حنیفہ نے غلطی سے جاہر کا لفظ بڑھا دیا ہے۔

الجواب: امام ابو حنیفہ ثقہ اور ثبت ہیں اور دیگر ثقہ راوی بھی اس حدیث کو اس طرح بیان کرتے ہیں، اس تراویح
کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ہاں البتہ امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ سے تعصب اور عناد کا کوئی علاج نہیں
ہے اور اس متعصبانہ انداز سے امام صاحب کی جلالت اور حدیث کی صحت پر کوئی زد نہیں آتی۔

سولہویں حدیث: امام محمد فرماتے ہیں کہ ہم سے اسرائیل نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن ابی
عائشہ نے بیان کیا۔ وہ عبد اللہ بن شداد سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم في العصر... قال فقراً رجل خلفه فغمزه الذي يليه فلما
ان صلى قال لم غمزتني؟ قال كان رسول الله
صلى الله عليه وسلم قد امك فكرهت ان تقراً
خلفه فسمعه النبي صلى الله عليه وسلم فقال
من كان له امام فان قرأته له قرأة.....
(موطا امام محمد ص ۹۱)

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں
امامت کرائی اور ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی جو نمازی
اس کے ساتھ کھڑا تھا اس نے اس کا بدن فراد بادیاتا کہ
وہ قرأت سے باز آجاتے۔ جب نماز ادا ہو چکی تو اس نے
کہا تم نے مجھے کیوں ٹٹولا اور بادیاتا تھا؟ منع کرنے والے
نے کہا کہ چونکہ حضور آگے قرأت کرتے تھے میں نے مناسب
سمجھا کہ تم بھی قرأت کرو، آپ نے سنا تو ارشاد فرمایا کہ امام کا پڑھنا

مستند ہے اور صحیح ہے۔

اس روایت کے تمام روایات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور گو اس میں حضرت جاہر کا ذکر نہیں لیکن اس میں کوئی برج
نہیں ہے۔ اولاً اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن شداد خود صحابہ میں تھے۔ اور حضرت صحابہ کے مرسلین بالاتفاق
حجت ہیں۔ وثانیاً۔ ویسے بھی کیا تابعین کے مرسلین صحیح اور حجت ہیں جیسا کہ نقل کیا جا چکا ہے۔
وثالثاً۔ ہم نے یہ روایت پہلی روایت کی تائید میں پیش کی اور مرسل مقتصد کے

لہ امام محمد: مؤلف خیر الکلام ص ۳۸۲ میں لکھتے ہیں کہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام نسائی روایت کرنے والے کو حافظہ کی بنا پر
مکرور قرار دیا ہے۔ (محصلاً)

الجواب: مؤلف خیر الکلام ص ۳۸۲ میں لکھتے ہیں کہ جرح کرنے والا اگر تہمت اور تشدد ہو، تو اس کی توثیق تو معتبر ہے مگر
پھر لگے لکھتے ہیں کہ متقدمین میں ابو حاتم نسائی ابن معین ابن قسطلان کو شمار کرتے ہیں۔ بلقطہ۔ لہذا امام نسائی کی جرح
کا کوئی اعتبار نہیں اور امام محمد ثقہ ہیں جیسا کہ ابتداء کتب میں باحوالہ ان کی توثیق نقل کر دی گئی ہے۔

مستند ہے اور صحیح ہے۔

حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۹ میں لکھتے ہیں کہ محدثین کا خیال ہے کہ یہ حدیث مرسل ہونے

اور امام محمدؒ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

اجواب: ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل صحیح ہے اور

یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ امام محمدؒ ثقہ ہیں اور امام نسائی متعنت ہیں۔ ان کی جرح کا اعتبار نہیں، امام ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ

اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے وکیع سے

ولنا مارواہ الزماہر احمد عن وکیع

روایت کی ہے اور وہ سفیان سے اور وہ موسیٰ بن

عن سفیان عن موسیٰ بن ابی عائشہ عن

ابن عائشہ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن شداد سے

عبداللہ بن شداد قال قال رسول اللہ صلی

روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ

اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فان قرأہ

علیہ وسلم فربما یکبر جس کا امام ہو تو بے شک اس کے

الامام لہ قرأہ۔

امام کی قرأت اسی کی قرأت ہے۔

(مغنی ابن قدامہ جلد اہل)

یہ روایت بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ

حضرت عبداللہ بن شداد صحابی ہیں، لہذا ان کی روایت مرسل صحابی ہونے کے اعتبار سے مرفوع ہے

اور اس میں امام محمدؒ بھی نہیں ہیں جن پر فریق ثنائی ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ امام وکیع بن الجراح رح کو

علامہ ذہبی الامام، الحافظ، الثبت محدث العراق اور احمد الامام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ

جلد ۲۸۲) اور سفیان رح اس سند میں ثوری ہیں جن کا ترجمہ مقدمہ میں بیان ہو چکا ہے اور

بقیہ روایت کے تراجم بھی پہلے عرض کیے جا چکے ہیں۔

ایک شاہد: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو عمرو بن حسین بن محمد بن ہشیم نے

بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسن عبدالواحد بن حسن نیشاپوری نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں

ہیں کہ ہم سے حسین بن ہمان عسکری نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن حماد نے بیان

کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے سلیمان بن سلمہ نے بیان کیا۔ وہ محمد بن اسحاق اندلسی سے روایت

کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالک بن انس نے بیان کیا، وہ یحییٰ بن سعید انصاری سے اور

وہ سعید بن المسیب سے اور وہ حضرت نواس بن سمان سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلوة الظهر وكان عن يميني رجل من
انصار فخرأخلف النبي صلی اللہ علیہ
وسلم وعلی یساری رجل من منینة یلعب
بالحصی فلما قضی صلوة قال من قرأخلفی؟
قال انصارمی انایا رسول اللہ قال لا تفعل
من كان له امام فقرة الامام له قرأة -
(کتاب القرأة ص ۱۳۹)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی سند میں محمد بن اسحاق عکاشی ہے۔ تو وہ کذاب تھا ان کا نوالعکاشی... الخ کہتے ہیں واقعی عکاشی کذاب ہے لیکن سند میں اندلسی کا ذکر ہے اگرچہ بعض نے عکاشی اور اندلسی کو ایک کہا ہے لیکن محدث ابن عدی ان کو دو بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں ہو رجل لا یعرف یعنی وہ مجہول اور مستور ہے اور حافظ ابن حجر بھی دو ہی قرار دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ والراجح التفرقة (لسان جلد ۵ ص ۶) کہ راجح بات یہ ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص ۳۱۶) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مستور کی روایت کو متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص ۲۲۵) اور یہ تو ہم نے بھی صرف تائید اور شاہد کے لیے پیش کی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے؟ بہر حال ہمارا استدلال اس روایت سے نہیں بلکہ محض شاہد کے طور پر ہم نے اس کو نقل کیا ہے۔

ان سابق پیش کردہ روایات سے معلوم ہوا کہ ظہر اور عصر کی قید کو صرف امام ابوحنیفہ ہی نہیں بیان کرتے بلکہ دوسرے ثقہ راوی بھی اس کو بیان اور نقل کرتے ہیں۔ اس شاہد کے علاوہ تین روایتیں بسند صحیح نقل کی جا چکی ہیں۔ جن میں ظہر یا عصر کی قید موجود ہے۔ اس شاہد کو چھوڑ کر بھی امام ابوحنیفہ

کے علاوہ اسرائیل اور طلحہ (جو دونوں ثقہ اور ثبت راوی ہیں) اپنی روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ لہذا جو حضرات ظہر وغیرہ کی قید بیان کرنے میں صرف امام ابو حنیفہؒ کو متفرد کہتے ہیں۔ ان کی تحقیق صحیح نہیں ہے۔

سترہویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن سلیمان بن الاشعث نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الملک بن شعیب بن لیث بن سعد نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن وہب نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے لیث بن سعد نے بیان کیا۔ وہ طلحہ سے روایت کرتے ہیں وہ موسیٰ بن ابی عائشہ سے، وہ عبد اللہ بن شداد بن الہاد سے، وہ

امام بیہقی کا ترجمہ ص ۱۱ میں اور حافظ ابو عبد اللہ اور حافظ ابو علی کا باب اول میں مجاہد بن جبر کے اثر کے ذیل میں اور لیث بن سعد کا مقدمہ میں اور موسیٰ بن ابی عائشہ اور عبد اللہ بن شداد کا عنقریب گذر چکا ہے۔ عبد اللہ بن اشعث علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ (میزان جلد ۳ ص ۴۳) اور العلامة اور قدوة الحدیثین اور الحافظ الکبیر کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۹) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ من کبار الحفاظ اور من ائمة الاعلام تھے (لسان جلد ۲ ص ۲۹۵) محدث خلیلی کا بیان ہے کہ وہ حافظ اور امام وقتہ اور متفق علیہ تھے (ایضاً ص ۲۹) اور وہ امام ابو داؤد صاحب سنن کے فرزند ارجمند تھے۔

۱۱ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائی ثقہ کہتے ہیں، ابن جبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، صحیح مسلم میں ان کی پچاس حدیثیں ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۲۳۵)

۱۲ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الفقیہ اور احد الائمة الاعلام تھے۔ ایک لاکھ حدیث ان سے مروی ہے (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۸) خلیلی کا بیان ہے کہ وہ بالاتفاق ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۴۳)

۱۳ امام احمد ان کو لو باس بن ابی مدینی ان کو معروف ابو زرعہ ان کو ثقہ اور ابو حاتم ان کو صالح کہتے ہیں۔

۱۴ امام لیث ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابن جبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۵ ص ۱۹) حافظ ابن حجرؒ

لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۱۸) اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں تصریح ہے کہ لیث بن سعد نے

اسی طلحہ سے روایت کی ہے روای عن اللیث... الخ اور اس سند میں بھی لیث بن سعدؒ طلحہ

سے روایت کرتے ہیں، یہ تک بندی نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۸۵ میں یہ کہہ کر جان بچانے کی ناکام سعی

ابو الولید سے اور وہ حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان رجلاً صلی خلف النبی صلی اللہ علیہ
وسلم فی الظهر والعصر یعنی یقرأ فاعطی
الیہ رجل فنہاہ فابی فلما انصرف قال
استہانی ان اقرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ
وسلم فتذاکراحتی سمع النبی صلی اللہ
علیہ وسلم فقال رسول اللہ علیہ وسلم
من صلی خلف امام فان قرأۃ الہ ما ملئ
قرآۃ۔

(کتاب القرآۃ ص ۱۰۲)

کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے آن حضرت صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی۔ اثنائے نماز میں ایک
آدمی نے اشارہ سے اس کو قرأت سے منع کیا۔ لیکن
وہ قرأت سے باز نہ آیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے
تو قرأت کر نیوالے نے منع کرنے والے کو کہا کہ تم مجھے
آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت سے
کیوں روکتے ہو؟ دونوں آپس میں ٹکرا کر رہے تھے
کہ آپ نے ان کی گفتگو سن لی اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص
امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو اس کو (انگ قرأت نہیں کرنی
چاہیے بلکہ) امام کی قرأت ہی اس کو کافی اور بس ہے۔

اور اس روایت کا ذکر اپنی سند کے ساتھ امام ابن قدامہ نے بھی کیا ہے مگر اس میں ظہر یا عصر کا

ذکر نہیں اور آخر میں ہے:

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان لک
امام یقرأ فان قرأتہ لک قرآۃ۔ (معنی ج ۱ ص ۲۹)

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تیرا
امام قرآۃ کر رہا ہو تو اس کی قرأت ہی تیرے لیے کافی ہے۔

اس صحیح روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر ہے جو بالاتفاق سترہ نماز میں ہیں۔ اور آپ کے
پیچھے قرآۃ کر نیوالے ایک شخص تھا حالانکہ حضرات صحابہ کرام میں سے تھے اور جماعت کی پابندی کرتے وہ اور کس
ہو سکتی ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کی یہی دلی خواہش ہوتی تھی کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز
پڑھی جائے مگر باوجود اتنی بڑی عتق کے کثیر التعداد حضرات صحابہ میں سترہ نماز میں آپ کے پیچھے قرآۃ کر نیوالے ایک شخص ملنا
ہے اور باقی سب خاموش رہتے ہیں۔ لیکن آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم
اس ایک شخص کی قرأت کو بھی گوارا نہیں فرماتے اور اس کو امام کے پیچھے قرأت کرنے
سے منع کرتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ہوتی خصوصاً سترہ نمازوں
میں تو یقیناً آپ اس کی تائید فرماتے اور قرأت سے روکنے والے کو تنبیہ فرماتے اور اگر

امام کے پیچھے قرأت کی گنجائش ہوتی خاص کر سب سے سب سے نمازوں میں تو عین نماز کی حالت میں احسانِ صلوٰۃ سے صرف نظر کرتے ہوئے منع کرنے والے صحابی قرأت کرنے والے کو منع کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔ اور اگر سب سے سب سے نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کا استحباب یا جواز بھی ہوتا تو منع کرنے والے کو آپ فرمادیتے کہ ایک جائز اور مستحب حکم کی وجہ سے تم نے نماز میں اپنی توجہ کیوں دوسری طرف مبذول کر دی تھی؟ اور دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ بھی منع کرنے والے کو یہ نہیں کہتے کہ بھائی تم نے اثنائے نماز میں بلاوجہ اس سے الجھنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی تو اچھا کام ہی کر رہا تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو بغیر کسی خارجی قرینہ کے یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ چہری نمازوں کا تو قصہ ہی چھوڑ لیے ان میں بھلا امام کے پیچھے قرأت کی کب اجازت نکل سکتی ہے؟ سب سے سب سے نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ مستحب پھر ضروری کہاں سے ہوگا؟ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مطلق قرأت سے منع کیا ہے۔ اس لیے اس کو محض اپنی رائے سے قرأت دونوں پر حمل کرنا باطل اور مردود ہوگا۔ اور یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے، جو قرأت کا اولین اطلاق سورہ فاتحہ اور ام الکتاب میں منحصر سمجھتے ہیں۔ لہذا قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا توجیہ القول بما لا یدینی بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہوگا۔ جو محض بے بنیاد اور بیگار ہے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں لیثؓ سے اوپر کی سند میں عبد الملک بن شعیب نے غلطی کی ہے۔ ... الخ (کتاب القراءۃ ص ۱۲۸ اور اسی کا ذکر مولف خیر الکلام نے ص ۲۸۳ میں کیا ہے۔)

جواب: جب یہ راوی بالاتفاق ثقہ ہیں اور بالذات پہلے یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ثقہ کی زیادت متن اور سند دونوں میں بالاجماع حجت ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ جب حدیث کے ارسال اور اتصال اور رفع ووقف کے بارے میں ثقہ روایت کا اختلاف ہو تو بالاتفاق وہ حدیث موصول اور مرفوع ہی تصور ہوگی اور ثقہ روایت کی پختہ صحیح ہوتی ہے اس لیے امام بیہقیؒ وغیرہ کا یہ خلاف اصول اعتراض قابل التفات نہیں ہو سکتا

یہ حدیث بھی بہر حال موصول اور مرفوع ہی ہوگی۔

دوسرا اعتراض: امام بیہقی^۲ اور امام دارقطنی^۳ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابوالولید مجہول ہے تو یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ (کتاب القراءت ص ۱۳۰ و دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۳ اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۳ میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ابوالولید مجہول ہے۔ لہذا یہ قابل اعتبار نہیں)

جواب: واقعی یہ اعتراض قدرے معقول بنا ہے لیکن درحقیقت یہ بھی نہایت ہی سطحی ہے اور غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ابوالولید کوئی الگ اور جدا گانہ ہستی نہیں، بلکہ ابوالولید عبد اللہ بن شداد کی کنیت تھی۔ چنانچہ امام حاکم^۲ لکھتے ہیں:

عبد اللہ بن شداد هو بنفسه ابوالولید یعنی ابوالولید خود بعینہ عبد اللہ بن شداد
ومن تهاون بمعرفة الاسامی اورثہ تھے لیکن جن لوگوں نے روایت کے ناموں میں
مثل هذا الرهم۔ غفلت اور کوتاہی سے کام لیا ان کو ایسا وہم ہو جانا
کچھ بعید نہیں ہے۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ
عبد اللہ بن شداد اصل مدینی وکنیتہ
ابوالولید۔ ان کی کنیت تھی۔

(معرفة علوم الحدیث، طبع قاہرہ ص ۱۶۸)

سک لطیفہ: امام بیہقی^۲ لکھتے ہیں کہ بعض نے ایک طریق سے یہ روایت نقل کی ہے اور اس میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور دوسرے طریق میں عبد اللہ بن شداد کا نام اڑا دیا ہے اور یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ابوالولید عبد اللہ بن شداد کی کنیت ہے، لیکن یہ انصاف سے بعید ہے۔ کتاب القراءۃ ص ۱۳۰، امام حاکم^۲ وغیرہ نے امام بیہقی^۲ کا مغالطہ تو ایسا نکالا کہ ان کو شاید لب کشائی کی ہمت ہی نہ رہے۔ مگر خود انہوں نے سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۵۹ میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام بیہقی^۲ نے امام مسلم کی ایک عبارت میں مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے۔ فسا محہ اللہ تعالیٰ بصوم فضلہ۔

علاوہ ازیں تاریخ بغداد ص ۲۷۳، جامع المسانید جلد ۱ ص ۳۳۸، کتاب الکنی وولابی جلد ۲ ص ۱۲۲، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۱، لسان المیزان جلد ۶ ص ۲۲۵، تقریب ص ۲۰۲ اور توجیہ النظر ص ۱۹۱ وغیرہ کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ابو الولید عبداللہ بن شدادؓ کی کنیت تھی۔ گویا اس لحاظ سے سند کی اصلی عبارت یوں تھی: عن عبد اللہ بن شداد ابی الولید... الخ روایت میں سے کسی نے ابو الولید کو سابق سے الگ سمجھ کر ایک جدا ہستی اور مستقل راوی سمجھ لیا ہے اور اسی حقیقت کو امام بیہقیؒ اور دارقطنیؒ نہ پاسکے۔ عربی زبان میں کنیت نام سے پہلے بھی آتی ہے اور نام کے بعد بھی آسکتی ہے۔ مثلاً دیکھئے محمد بن عبد الرحمنؒ ابو الاسود، محمد بن مقاتلؒ ابو الحسن (صحیح بخاری جلد ۱ ص ۶۶۱ وغیرہ) اور یحییٰ بن یحییٰؒ ابو زکریا (بخاری جلد ۲ ص ۸۲ وغیرہ) وغیرہ اور جملہ ابو الولید اعادہ جار کے ساتھ عبداللہ بن شداد سے بدل بھی ہو سکتا ہے۔ (ہامش شرح نخبہ ص ۱۱)

مؤلف خیر الکلام کا صریح بہتان: جب ان ٹھوس حوالوں سے مولف مذکور کا سرچکر آیا تو انھوں نے یہ لکھ مارا کہ پھر امام حاکمؒ تو غلطی کی نسبت امام ابو حنیفہؒ کی طرف کر رہے ہیں کہ وہ ابو الولید کو الگ سمجھ کر سند میں بڑھا رہے ہیں کیونکہ ان کو روایت کے اسامی کی معرفت نہیں... الخ ص ۲۸۲، حالانکہ یہ امام حاکمؒ پر خالص بہتان ہے۔ امام حاکمؒ نے اول سے آخر تک اس عبارت میں کہیں اس کی تصریح نہیں کی کہ اس میں امام ابو حنیفہؒ نے غلطی کی ہے وہ تو ومن تھاون بمعرفۃ الامامی اورثہ مثل ہذا الوہم کے عمومی الفاظ بول رہے ہیں کیونکہ مَنْ شرطیہ عموم کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ بیان ہوگا، لیکن غیر مقلدین کے شیخ الحدیث کے نزدیک اس حرف مَنْ سے صرف امام ابو حنیفہؒ ہی مراد ہیں۔ اور ص ۳۸۶ میں مولف مذکور لکھتے ہیں کہ اسی بنا پر حاکم نے امام ابو حنیفہؒ پر اعتراض کیا ہے۔ اور آگے لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کو مورد طعن قرار دیا ہے... الخ امام حاکمؒ نے اس وہم کی نسبت قطعاً امام ابو حنیفہؒ کی طرف نہیں کی۔ وہ تو حرف من استعمال کر رہے ہیں جو غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث کے نزدیک عموم کے لیے نص قطعی ہے جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ یہ ہے ان کی دیانت۔ فوالسفا۔

اٹھا رہویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمد بکر بن محمد بن حمدان الصیرفی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الصمد بن فضل البلخی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مکی بن ابراہیم نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہ بن شاذان بن الہاد سے اور وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے۔

ان رجاء قرأ خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم في الظهر والعصر فاذا ما اليه رجل فنهاه فلما انصرف قال اتنها في (الحديث)

وہ فرماتے ہیں کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کر رہا تھا۔ نماز ہی کی حالت میں ایک شخص نے اشارہ سے اسے قرأت کرنے سے منع کیا مگر وہ باز نہ آیا۔ نماز کے بعد کہنے لگا تم مجھے قرأت سے منع کرتے ہو؟

(بحوالہ روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۲)

یہ روایت امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار ص ۲۳ میں بھی ہے اس کے آخر میں ہے کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من صلی خلف امام فان قرأه الا ما مله قرأه۔

آگے روایت کا بعینہ وہی مضمون ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ پہلی روایت میں اصل مضمون اور اس کی تشریح دیکھ لیں۔ امام حاکمؒ، مستدرک جلد ۱ ص ۴۹۶، ۲ ص ۱۲۱ وغیرہ میں ایک سند اس طرح پیش کرتے ہیں۔ اخبرنا بکر بن محمد بن حمدان الصیرفی نا عبد الصمد بن الفضل البلخی نا مکی بن ابراہیمؒ... الخ اور فرماتے ہیں۔ صحیح ہے علامہ ذہبیؒ تلخیص المستدرک میں اس کے بارے میں صحیح کہتے ہوئے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور بقیہ روایات کا ترجمہ گزر چکا ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۴۸۸ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے جملہ راوی سوائے امام ابو حنیفہؒ کے ثقہ ہیں اور جابر کے ذکر میں امام ابو حنیفہؒ کی طرف غلطی کی نسبت کی گئی ہے... الخ اور اس سے پہلے بحوالہ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح موصول بیان کی ہے اور عبد اللہ بن المبارک نے ان سے مرسل بیان کی ہے۔ جابر کا ذکر نہیں کیا اور یہی محفوظ ہے۔

الجواب: پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ثقہ اور شہرت تھے لہذا ان کی تضعیف بغیر تعصب کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور حیب امام بیہقیؒ خود فرماتے ہیں کہ روایت کی ایک

خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر ہے اور تنہا امام ابن مبارکؒ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں تو جماعت کی روایت موصول ہی کیوں نہ محفوظ ہو جب کہ حقیقتاً وہ ہے بھی صحیح محفوظ اور موصول۔

ایسویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ زکریاؒ بن الحارثؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن انیسؒ سحر مجزیؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے خلفؒ بن ربیعؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو یوسفؒ نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ مونس بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہ بن شداد ابو الولیدؒ سے اور حضرت جابرؓ سے اور وہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

من صلی خلف امام فان قرأ تلک قرأۃ۔ کہ جو آدمی امام کے پیچھے نماز پڑھے سو اس کے امام کا (معرفت علوم الحدیث ص ۱۷۸، طبع قاہرہ) پڑھنا مقدمی کا پڑھنا ہے۔ (اس کو الگ قرأت کی ضرورت

نہیں)

۱۔ علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ الامام المنزکی الفقیہ احمد مشائخ اصحاب ابی حنیفہ فی عصرہ واحد العباد تھے۔ (الجواہر جلد ۱ ص ۲۴۵)

۲۔ علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ وہ من آئمة اصحابنا الخراسانیین اور اصحاب طبقہ عالیہ میں تھے۔ (الاجزایر المضمیہ جلد ۲ ص ۳۱) اور فاضل کھنویؒ نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ (فوائد

ہمیدہ ص ۱۶۰)

۳۔ محدث ابن جانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ خلیلیؒ ان کو صدوق اور مشہور کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۲۸) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ وہ احد الفقہاء الزوہاء، صاحب علم، عامل اور بڑے خدا پرست تھے (میزان جلد ۳ ص ۳۱)

۴۔ قاضی ابو یوسفؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے اور دیگر روایت کے تراجم بھی بیان کیے گئے ہیں۔
فائدہ ۵: محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں سند کے ایک راوی کے بدلنے سے روایت بدل جاتی ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر ہم نے ان حدیثوں کا الگ الگ شمار کیا ہے۔ اس امر کو بخوبی ملحوظ رکھیں تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

یہ روایت بھی سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں انا ابو یوسف القاضی انا ابو حنیفہؒ... الخ آتا ہے لکھتے ہیں:
 هذا اسناد متصل عال (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۱) کہ یہ سند متصل اور بلند پایہ ہے اور مفہوم کا
 و مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ روایت واضح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ مولف خیر الکلام سے رہا نہیں
 گیا۔ صفحہ ۳۹۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بھی امام ابو حنیفہؒ کی ہے۔۔۔ الخ

الجواب: ہاں یہ روایت امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے جو ثقہ اور مثبت ہیں بغیر کسی

متعصب کے کون ان کی روایت کو رد کر سکتا ہے؟ جن کی علمی تحقیق سے امام سحبی القطانؒ اور ابن معینؒ

وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل نے اپنے دامن بھرے اور ان کی تقلید کو اپنے گلے کا ہار بنایا ہے۔ دیکھئے

طائفہ منصورہ اور مقام ابی حنیفہؒ وغیرہ۔ رہا مولف خیر الکلام کا ص ۳۹۰ میں حوالہ تحقیق الکلام جلد ۱

یہ لکھنا کہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ وہ اہل حدیث کے ہاں سخی الحفظ ہیں اور علی بن المدینیؒ نے

سخت ضعیف کہا ہے (محصلاً) تو یہ بے سود ہے خود مولف خیر الکلام ص ۳۹۰ الرفع والتکملہ

کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ سخی الحفظ جرح غیر مفسر ہے جو قابل اعتبار نہیں (محصلاً) اور اسی صفحہ

میں لکھتے ہیں کہ اگر تعدیل کرنے والے زیادہ ہوں تو ان کا اعتبار ہوگا۔ اور ہم مبسوط اور باحوالہ بحث عرض

کر چکے ہیں کہ اکثر امت نے امام موصوفؒ کو ثقہ کہا ہے اور مولف خیر الکلام ص ۲۱۰ میں لکھتے ہیں کہ

اور مہم جرح توشیح کے بعد مقبول نہیں ہوتی۔ اور ص ۲۲۲ میں لکھتے ہیں کہ توشیح کے بعد جرح غیر مفسر

معتبر نہیں ہوتی پس وہ قطعاً ثقہ ہے۔۔۔ الخ اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں اور ان صحیح روایات سے

بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ،

ظہرؒ اور ابوالزبیرؒ وغیرہ اس روایت کو موصول بیان کرتے ہیں اور حضرت جابرؒ کا یہ روایت میں ذکر

آتا ہے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے قاضی ابویوسفؒ کی بنیاد پر اور محمد بن الحسنؒ وغیرہ بلکہ بقول

امام بیہقیؒ محدثین کی ایک خاصی جامعیت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور ظہر یا عصر کی قیدیوں

کرنے میں بھی امام ابو حنیفہؒ متفرد نہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور ہر ایک روایت کے ایک

ایک راوی کی توشیح بھی عرض کر دی گئی ہے۔ اندر میں حالات یہ دعویٰ کرنا کہ امام ابو حنیفہؒ اس

میں متفرد ہیں یا ان کا کوئی شاگرد متفرد ہے، یا یہ روایتیں معلول ہیں۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ یہ

باحوالہ ولائل بھی دیکھیے اور مؤلف خیر الکلام کی ہوائی طفل تسلی بھی دیکھئے کہ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل ضعیف ہوتی ہے اور موصول بیان کرنے والے صرف امام ابو حنیفہؒ ہیں باقی روایات سب کے سب ضعیف یا مجہول ہیں... الخ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

بیسویں روایت: امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مخلد نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شعیب بن ایوبؒ وغیرہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے زید بن جباب نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاویہ بن صالحؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الزنادیر نے بیان کیا۔ وہ اکثر بن مرہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابوالدرداء سے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ زمان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۸۳)۔
۲۔ حافظ ابن حجر ان کو ثقہ مشہور اور اعلیٰ اہل عصمہ لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۳۶۴)
۳۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن جباب ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام حاکم ان کو ثقہ اور یاقوت لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۴۹)

۴۔ علامہ ذہبیؒ ان کو العابد الثقہ اور الصدوق لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۷۲ و تذکرہ جلد ۵ ص ۳۲۰)
۵۔ علامہ خطیب ان کو صاحب حدیث اور دانا محدث لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۴۳۳) امام ابن معین علی بن مدینیؒ، عجل، ابو جعفر بستی، احمد بن صالح، دارقطنیؒ، ابن ماکولہ اور یعقوب بن شیبہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن جباب اور ابن شاہین ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن یونس ان کو حسن الحدیث اور ابو حاتم صدوق اور صالح کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۰۳)

۶۔ ان کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباس کے اثر کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

۷۔ امام ابن معین عجل، یعقوب بن سفیان اور نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم اور دارقطنیؒ لا بائس بہ اور ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں، ابن جباب ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۲ ص ۲۱۸)

۸۔ علامہ ابن سعد اور عجل ان کو ثقہ اور ابن خراش صدوق کہتے ہیں، نسائی لا بائس بہ کہتے ہیں اور ابن جباب ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۸ ص ۴۲۹) حافظ ذہبیؒ ان کو الفقہ، امام عالم، عامل اور عالم اہل حص لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۹)

سُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
أَفِي كُلِّ صَلَاةٍ قِرَاءَةُ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ جِبِلُّ
مِنْ أُمَّ نَضَارٍ وَجِبْتٌ هَذِهِ فَقَالَ
لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَكُنْتُ أَقْرَبَ الْقَوْمِ إِلَيْهِ مَا رَأَيْتُ أَحَدًا
إِذَا مَرَّ الْقَوْمُ إِلَّا كَفَاهُمْ۔

(دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶)

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے
سوال کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قراۃ ہے؟ آپ نے
فرمایا ہاں۔ ایک انصاریؓ نے کہا پھر تو قرأت
ضروری ہوگئی؟ ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں
تمام اہل مجلس میں جناب رسول خدا صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب تھا آپ نے مجھ سے خطاب
کرتے ہوئے فرمایا تم یہی جانتا ہوں کہ امام کی قرأت
مقتدیوں کو کافی ہے۔

یروایت مسند احمد جلد ۱ ص ۴۲۲، نسائی جلد ۱ ص ۱۱۸ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۲،
طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ اور مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے، بیہوشی فرماتے ہیں۔
(اسناد حسن) اس روایت میں حضرت ابوالدرداءؓ اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ جناب
رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا۔ اور جواب بھی آپ ہی نے ارشاد فرمایا
اور حضرت ابوالدرداءؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اس لیے غیر رسول اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وآلہ وسلم میں یقیناً فرق اور تیز کرتے ہوں گے۔ اور اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ
آپ کے قریب تھا۔ اور آپ نے خطاب کرتے وقت اور جواب دیتے وقت خاص طور پر میری طرف
توجہ فرمائی تھی۔ اگر اتنے قوی اور اندرونی قرأت کے ہوتے ہوئے بھی یہ روایت مرفوع نہیں تو کونسی
روایت علم حدیث میں مرفوع ہوگی؟ چونکہ اس روایت میں سب سے زیادہ اور جہری کی کوئی قید مذکور نہیں ہے
اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے۔ مؤلف غیب الکلام کا یہ کہنا کہ وہ ما زاد یا جہر پر محمول ہے۔ (ص ۳۲۱)
بالکل مردود ہے کیونکہ بقول مؤلف مذکور قرأت سورۃ فاتحہ سے ہی شروع ہوتی ہے (کما حق)
پھر اس کو ما زاد پر کون حمل کرنے دیتا ہے؟ اور روایت میں لفظ قرأت ہے جہر نہیں قرأ کو جہر پر
حمل بالکل بے بنیاد ہے۔ اور ایسی رکیک اور دوراز کار توجیہات کون سننا ہے؟

اعتراض: امام نسائیؒ، دارقطنیؒ اور بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت حضرت ابوالدرداءؓ
پر موقوف ہے۔ زید بن جبابؓ نے اس حدیث کو مرفوع بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ (نسائی)

جلد ۱۰۷، دارقطنی جلد ۱۲۶، کتاب القراءۃ ص ۱۱۸ اور یہی باتیں مؤلف غیر الکلام نے دہرائی ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۲۹۹ و ص ۵۰۱ و ص ۵۰۱ اور یہی کچھ ترجمان الحدیث ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۲۲ تا ص ۲۴ اور ماہ جنوری ۱۹۷۲ء ص ۲۲ تا ص ۲۶ کہا گیا ہے کہ فلاں نے اس کو قوف کہا اور فلاں اور فلاں نے۔

جواب: یہ اعتراض قطعاً باطل ہے: **اَوَّلًا** — اس لیے کہ زید بن حبابؓ بالاتفاق ثقہ ہیں۔ اور ثقہ راوی کی متن رسدین مادت بالا جماع مقبول ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل گذر چکی ہے۔ **و ثانیاً** — یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حدیث کے موقوف اور مرفوع ہونے کی صورت میں تمام محدثین کے نزدیک روایت موصول اور مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔

و ثالثاً — اگر تنہا زید بن حبابؓ ہی اس کو مرفوع روایت کرتے تب بھی یہ حدیث مرفوع ہی ہوتی، کیونکہ زید بن حبابؓ ثقہ تھے۔ حالانکہ ان کے علاوہ ابوصالحؓ کا تب لیثؓ (جن کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر میں نقل کیا جا چکا ہے) بھی اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۲ وغیرہ اور اس کی سند بھی صحیح ہے) جب یہ دونوں راوی ثقہ ہیں۔ اور اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں تو یہ حدیث محدثین کے طے شدہ قاعدہ کی رو سے مرفوع ہی ہوگی اور امام بیہقیؒ وغیرہ کی بلا دلیل اصول شکنی قابل التفات نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چونکہ یہ اکابر غلطی سے پہلے یہ نظریہ قائم کر چکے ہیں کہ قرآنہ خلف الامام کی اجازت ہے، اس لیے اس کے خلاف تمام روایات کو وہ خواہ مخواہ معلول ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر خالی الذہن ہو کر پچھلے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو ملاحظہ کر لیتے تو یقیناً ایسی رکیک اور بے حد انصاف تاویلات سے ہرگز کام نہ لیتے، فاسحہم اللہ تعالیٰ اور مولانا مبارکپوری صاحب صاحب کا تو معاملہ ہی عجیب ہے وہ امام سفیانؒ بن عیینہؒ اور حضرات صحابہ کرامؓ کے صحیح آثار سے تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو مقید کرنا گوارا نہیں کرتے، مگر اس مقام پر جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مطلق حدیث کو محض اپنی ناقص عقل اور فہم نارسا کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں (دیکھئے ابکار المنہج ص ۱۶)

اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ بلا دلیل کرتے ہیں: —

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

باقی جس روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کثیر بن مرفوع سے یہ کہا تھا جیسا کہ بعض کتابوں میں آتا ہے تو وہ اپنے مقام پر صحیح ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرفوعاً بھی یہ روایت آتی ہے اور موقوفاً بھی جب مسئلہ بیان کا مقصود ہوگا تو اپنا قول بیان کر دیتے ہوں گے اور جب حدیث کا بیان کرنا ملحوظ ہوتا ہوگا تو مرفوعاً بیان کر دیتے ہوں گے کیونکہ ارسال اور رفع میں روایت کے حالات مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

احسن الکلام پر بلا وجہ محض تعصب کی وجہ سے تنقید کرنے والے بزرگ علامہ عراقی رحمہ اللہ کی ایک عبارت کا (جس کا ذکر ص ۲۷ میں ہو چکا ہے) حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اختلاف ایک راوی کے تلامذہ میں ہے تو پھر ثقہ اور اوثق کے اصول پر اس کی تنقیح کی جائے گی۔ اگر دونوں اسناد ہمہ عیوب سے صاف ہوں گی تو پھر مزید قرآن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے گا جیسا کہ اس کی تفصیل ہم عرض کر آتے ہیں۔ (ترجمان الحدیث ص ۲۷ ماہ جنوری ۱۹۷۵ء)۔

الجواب: پہلے بیان ہو چکا ہے کہ علامہ عراقی رحمہ اللہ کے حوالہ سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ ثقہ راوی جب کسی وقت روایت موصول اور کسی وقت مرسل بیان کرے یا کسی وقت مرفوع اور کسی وقت موقوف بیان کرے تو اس کے بارے میں صحیح تر فیصلہ یہ ہے کہ وہ روایت موصول اور مرفوع ہی قرار دی جائے گی نہ کہ مرسل و موقوف۔ علامہ عراقی کی اس عبارت میں راوی کے تلامذہ میں ثقہ اور اوثق کی تنقیح کا کوئی تذکرہ نہیں اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اگر بعض ثقہ اور ضابطہ راوی حدیث کو متصل اور بعض مرسل بیان کرتے ہوں یا بعض مرفوع اور بعض موقوف بیان کرتے ہوں یا ایک ہی راوی کسی وقت مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا موقوف بیان کرتا ہے تو اس کے متعلق صحیح بات جو محققین محدثین اور فقہاء اور اباب اصول نے بیان کی ہے اور اسی کو علامہ خطیب بغدادیؒ نے صحیح قرار دیا ہے یہ ہے:

ان الحكم لمن وصله اور رفعه سواء
 كان المخالف له مثله او اكثر واحفظ
 لانه زيادة ثقة وهي مقبولة اه
 (مقدمة شرح مسلم ص ۱۸)

کہ بے شک حکم اس کے موصول یا مرفوع ہونے کا دیا
 جائے گا۔ عام اس سے کہ اس کا مخالف اس جیسا
 ہو یا زیادہ ہو یا زیادہ حافظ ہو کیونکہ یہ زیادت
 ثقت ہے جو بہر حال مقبول ہے۔

اس عبارت سے تین باتیں نمایاں طور پر ثابت ہیں:

(۱) اس صورت میں موصول اور مرفوع ہونے کا فیصلہ محقق محدثین رحمہم فقہار اور ارباب اصول
 کا ہے۔

(۲) ایک ہی ثقت راوی سے یہ اختلاف ثابت ہو تب بھی یہی فیصلہ ہے یا ایک ہی راوی کے

تلاذہ جدا جدا ہوں تب بھی یہی فیصلہ ہے۔

(۳) اس میں موصول اور مرفوع بیان کرنے والے کے مقابلہ میں اکثر یا حافظ یا اوثق کا کوئی اعتبار

نہیں کیونکہ یہ زیادت ثقت ہے جو بہر حال مقبول ہے۔

اکیسویں حدیث: امام حاکم رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ سمرقندی رحمہ نے بیان کیا وہ کہتے

ہیں کہ ہم سے محمد بن نصر رحمہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن عبد الرحمن بن وہب نے بیان

کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہمارے چچا (عبداللہ بن وہب) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ایث

بن سعد نے بیان کیا۔ وہ یعقوب بن ابراہیم رحمہ (امام ابو یوسف) سے روایت کرتے ہیں اور وہ

نعمان بن ثابت (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ) سے اور وہ موسیٰ بن ابی عائشہ سے اور وہ

عبداللہ بن شداد ابو الولید سے اور وہ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی خلف امام فان قرأ الامام له

قرآۃ۔ (معرفة علوم الحدیث ص ۱۱۵)

کہ جو شخص امام کے پیچھے (اس کی اقتدا میں نماز پڑھے
 تو اس کو امام کی قرأت ہی کافی اور پس ہے۔

لہ چونکہ امام حاکم نے اسی روایت کے سلسلے میں اسی صفحہ میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا کہ ابو الولید عبداللہ بن شداد ہی

کی کنیت ہے اس لیے ہم نے عبداللہ بن شداد ابو الولید لکھا ہے جیسا کہ پہلے باحوالہ عرض کیا جا چکا ہے مولف خیر الکلام کا ص ۱۱۵

میں اس کو مخالف کہنا انصاف پر مبنی نہیں ہے کیونکہ جب ابو الولید عبداللہ بن شداد ہی کی کنیت ہے تو ایک ہی شخصیت

اس سند کے اکثر روایات کے تراجم پہلے نقل کئے جا چکے ہیں اور بعض جلیل القدر اور نامور محدث تھے البتہ احمد بن محمد بن عبد الرحمن بن وہب کا ترجمہ سن لیجئے اگرچہ ابن عدی کہتے ہیں کہ مصر کے اساتذہ اس کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں اور ابن یونس فرماتے ہیں کہ اس سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ (میزان جلد ۱ ص ۱۵۵ بحوالہ خیر الکلام ص ۱۵۵) مگر جمہور محدثین کرام ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محمد بن عبد اللہ بن الحکم ان کو ثقہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے بارے میں کوئی کلام اور جرح نہیں سنی، عبد الملک ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابو زرعة ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابو حاتم ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث عبدان ان کو مستقیم الامر کہتے ہیں۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ محدثین کے نزدیک ان کی حدیثیں قابل برداشت ہیں۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے پہلے ان میں کلام کیا تھا۔ لیکن بعد از تحقیق اس سے رجوع کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن خزیمہ متقدمین میں سے اور امام ابن قطن متاخرین میں سے ان کو ثقہ سمجھتے ہوئے ان پر کئی اعتماد کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۵۲، ۵۵، ۵۷) یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے صحیح اور مرفوع ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۵۱۱ میں اس کے جواب میں بھی وہی پرانا رونا روباہنے کہ امام ابو حنیفہ ضعیف ہیں اور متفرد ہیں (محصلاً) جواب پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرات! ہم نے متابعات اور شواہد کے علاوہ بیس حدیثیں صحیح اور مرفوع (با سند اور سند کے ایک ایک راوی کی توثیق کے ساتھ آپ سے) بحوالہ عرض کی ہیں۔ اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے ہیں۔ اب ہم آخر میں آپ کے سامنے چند اور حدیثیں بطور تائید عرض کرتے ہیں اور سند پوری نقل کر دیتے ہیں۔

بطور شاہد پہلی حدیث: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو سعید محمد بن جعفر بن خصیب ہرومی نے اپنی کتاب سے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن محمود سعدی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

اسماعیل سدیقی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالک بن انس نے بیان کیا۔ وہ وہیب بن کیسان سے اور وہ حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

کل صلوة لا یقرأ فیہا بام القرآن فی
خدا ج الا وءاء الامام۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۱۱)
ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو تو وہ نماز ناقص اور نامکمل ہوتی ہے۔ ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

یہ روایت صاف بتلاتی ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی گنجائش نہیں ہے اور اسی کو فریق ثانی ضروری سمجھتا ہے۔ ہاں البتہ امام اور منفرد کی کوئی نماز بغیر سورۃ فاتحہ کے مکمل نہیں ہو سکتی جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے۔

اعتراض: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اسماعیل سدیقی کا دوسرا شاگرد مسری بن خزیمہ اس روایت کو حضرت جابر سے موقوف روایت کرتا ہے۔ اس لیے یہ عبد اللہ بن محمود سعیدی کی غلطی ہے کہ وہ اس کو مرفوع بیان کرتے ہیں اور یہی بات مولف خیر الکلام نے دہرائی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۵۰۴ و ۵۰۵)

الجواب: عبد اللہ بن محمود سعیدی کو علامہ ذہبی، الحافظ، الثقف اور صوبہ مرو کا محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۵۷) امام حاکم ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، محدث خلیلی ان کو الحافظ اور عالم فریق حدیث کہتے ہیں (ایضاً جلد ۲ ص ۲۵۸) کیوں نہ ہو کہ حافظ اور ثقہ راوی کی زیادت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اور اصول شکنی کا ارتکاب نہ کیا جائے، کہ نہ ہینگ لگے نہ چٹکڑھی، اور یہی امر فریق قیاس اور انصاف ہے۔

مولف خیر الکلام نے ص ۵۰۵ میں لکھا ہے کہ اس کے ثقہ ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا ضروری نہیں اور یعنی محض اس لیے کہ مولف صاحب اور ان کی جماعت اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں محمد بن اسحاق جیسا کوئی ضعیف راوی ہوتا تو وہ ضرور مان لیتے اور پھر حدیث صحیح ہو جاتی، باقی امام مالک کا یہ فرمانا کہ اس کی ٹانگ پکڑو یہ اس کے مرفوع ہونے کی نفی یا انکار کی قطعی دلیل نہیں۔ طحاوی کی شرح میں جذ و ابرجلہ

کا نسخہ بھی ہے (حاشیہ طحاوی جلد ۱ ص ۱) یعنی ان کی بات مان لو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور اس کے پیش نظر خذو اب جملہ کا مطلب بھی یہ ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امام مالکؒ کی تصدیق ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دوسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ محمد سے ابو عبد اللہ حسین بن محمد ہروی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو بکر احمد بن محمد بن عمر نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عبد الرحمن محمد بن احمد نیمی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو محمد سوید بن سعید نے زبانی بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے علی بن مسہر نے بیان کیا۔ وہ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے اور وہ نافعؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور وہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: من کان لئ امام فقراة الامام لئ قرأة (کتاب القرأة ص ۱۲۵) کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے یہ حدیث بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے واضح ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے موقوف مروی ہے یہ ابو محمد سوید بن سعید کی غلطی ہے کہ اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں۔

جواب: علامہ ذہبیؒ سوید بن سعید کو صاحب حدیث اور صاحب حفظ کہتے ہیں۔ امام مسلم نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ ابو حاتم ان کو صدوق اور کثیر التذلیس (لیکن اس روایت میں وہ حدیث سے تحدیث کرتے ہیں) کہتے ہیں بغویؒ ان کا شمار حفاظ حدیث میں کرتے ہیں۔ صالح جزیرہ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۲۲۲) محدث عجلی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ مسلم بن قاسمؒ کا بیان ہے کہ وہ ڈبل ثقہ تھے۔ امام احمد ان کو صالح یا ثقہ کہتے ہیں۔ میمون بن امام احمد سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے ان میں کسی کا کلام اور جرح معلوم نہیں۔ امام ابو داؤد ان کی صدوق و لا بأس بہ سے توثیق نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۷۴) جزیریؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں اور امام مسلم نے صحیح میں ان سے احتجاج کیا ہے۔ (حسن حصین ص ۱۳) باب ما رزمزما شرب لہ، اس لیے ضابطہ کے لحاظ سے یہ زیادت بھی صحیح ہوگی اور یہ امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے حدیث ۵۰۶ میں بعض کتب رجال سے سوید بن سعید پر جرحی کلمات نقل کر کے آگے لکھا ہے، پس نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حدیث قطعاً جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن آئمہ نے ان کی توثیق کی ہے جیسے کہ اوپر باحوالہ گزر چکی ہے وہ غلط ہے؛ اور کیا امام مسلم نے صحیح مسلم میں جھوٹے راوی سے احتجاج کیا ہے؛ علاوہ انہیں علامہ خطیب بغدادی اپنی سند کے ساتھ ابی محمد بن عبدہ ناخرجة عن ایوب عن نافع عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقراءة الامام لہ قرأۃ روایت کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو تاریخ جلد ۱ ص ۳۳۳)

جس کے راوی اس مذکور سند کے متابع ہیں اور بزعم مؤلف خیر الکلام وغیرہ اگر کچھ مستقیم بھی اس میں ہے تو دوسری سند سے پورا ہو جاتا ہے۔ علاوہ انہیں اس امر سے اختلاف تو نہیں کیا جاسکتا کہ بعض محدثین نے اس پر جرح کی ہے اور جہوڑ اس کی توثیق کرتے ہیں اور مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث حسن تو ضرور ہے خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ مختلف فیہ آدمی حدیث حسن ہوتی ہے۔ (خیر الکلام ص ۳۲۵) مگر اس حدیث کو قطعاً جھوٹ کہنا خالص اور سفید جھوٹ ہے۔

تیسری حدیث؛ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو العباس بالولید بن محمد بن بالولید مرزبانی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرو بن زرارہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمعیل بن ابراہیم نے بیان کیا۔ وہ علی بن کیسان سے اور وہ ابن علیک سے اور وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں اور وہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا؛ کل صلوة لا یقدر فیہا بفاختہ الكتاب یعنی ہر وہ نماز جس میں نمازی سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اس فلا صلوة لہ الا وراء الامام۔ کی نماز ادا نہ ہوگی۔ ہاں مگر امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے بھی نماز صحیح ہے۔

(کتاب القراءۃ ص ۱۳۷)

یہ روایت بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل عیاں ہے اور حضرت ابن عباس سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقی نے اپنے استاد کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ علی بن کیسان کا نام

ہم نے صرف اسی سند میں سنا ہے۔

الجواب: حافظ ابن حجر نے علی بن کیسان کا نہایت مختصر ترجمہ یوں قائم کیا ہے وہی

علی بن سلیمان بن کیسان الکیسانی رح (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۷۵) اور محدث فیض یوپی رح فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے ان کو صالح الحدیث ما اری مجدیتہ بأسا کہا ہے (لسان ج ص ۲۳۲) لہذا ان کی حدیث حسن یا صحیح ہے (الدلیل المبین ص ۱۷۵) اور اگر بالفرض یہ مستور بھی ہو تب بھی مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ مستور بلکہ ضعیف کی روایت متابعت میں پیش کی جا سکتی ہے جیسا کہ باحوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

چوتھی حدیث: امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو حامد احمد بن محمد بن قاسم سرخسی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے احمد بن عبد الرحمن سرخسی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمعیل بن فضل نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عیسیٰ بن جعفر نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوری نے بیان کیا۔ وہ اعمش رح سے اور وہ حکم رح سے اور وہ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ رح سے اور وہ حضرت بلال رضی رض سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

امرئ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا اقرأ خلف الامام علیہ وسلم ان لا اقرأ خلف الامام۔
کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے حکم دیا کہ میں امام کے پیچھے قرأت نہ کروں۔
(کتاب القراءۃ ص ۱۳۹)

چونکہ قرأت خلف الامام کا مسئلہ اپنے ایجابی یا سلبی پہلو کے اعتبار سے کسی صحابی سے مخصوص تھا اس لیے حضرت بلال رح کو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر آپ نے خطاب کیا ہوگا۔ ورنہ حکم سب کے لیے عام ہے۔

اعتراف: امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ عیسیٰ بن جعفر توثیق اور ثبت تھے۔ اس لیے اس میں غلطی اسماعیل بن فضل رح کی ہوگی کہ اس سند میں سفیان ثوری کا ذکر ہے اور وہ اس سے بری ہیں اگر ان سے روایت ہوتی تو اس کے بارے میں اختلاف نہ ہوتا، اسمعیل بن فضل رح اگر سچا ہے تو اس کی غلطی ہے۔ جھوٹا ہے تو اس کا افتراء ہے۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۳۹ بحوالہ خیر الکلام ص ۵۱۰ محصلہ)

الجواب: حدیث کو باطل ٹھہرانے کا یہ نذر القاعدہ امام بیہقی نے تجویز فرمایا ہے۔ کیا قرأت خلف الامام کی روایت کے امام ثورمی حجاز نہیں؟ یا ان کی کسی دیگر روایت میں اختلاف نہیں ہوا؟ اسے سند اور حدیث پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسمعیل بن فضل کا حال معلوم نہیں یہ اصول کی بات ہے، مگر مؤلف خیر الکلام کے بیان کے مطابق مستور اور ضعیف کی حدیث بطور تائید و متابعت پیش ہو سکتی ہے اس میں کوئی ہرج نہیں۔ اور اصول کے لحاظ سے شاہد و متابع کا بھی کوئی فرق نہیں۔

قارئین کرام! اس مضمون کی کم و بیش ستائیس سندیں راقم الحروف کے بیاض میں ابھی اور موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں ہر ایک سند فریق ثانی کی اجازت یا وجوب قرأت سورۃ فاتحہ خلف الامام کی روایتوں سے اگر زیادہ قوی اور صحیح نہیں تو یقین کیجئے کہ ان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہمیں آپ سے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے سر دست ان پیش کردہ احادیث پر ہی ہم اکتفا کرتے ہیں اور ان سے ایک حقیقت پسندانہ سخن بخوبی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کیا بے دلیل ہیں؟ اور کیا ان کے پاس جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیثیں موجود نہیں؟ اور کیا جن کتابوں کے حوالے درج کیے گئے ہیں وہ اس دنیا میں موجود نہیں؟ اور کیا ان میں سورۃ فاتحہ اور ام القرآن و ام الکتاب کی تصریح موجود نہیں؟ اور کیا یہ روایتیں صحاح ستہ و مواضع بھا میں نہیں پائی جاتیں؟ اور کیا یہ کتابیں دنیا کے اسلامی کتب خانوں میں موجود نہیں؟ اور کیا ان حدیثوں میں کوئی حدیث صحیح اور مرفوع نہیں؟ اور کیا ان تمام دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جمہور اہل اسلام (جو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور دیگر کسی قسم کی قرأت کے قائل نہیں ہیں) نماز جیسی اہم اور بنیادی عبادت سے سبکدوش ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی نماز بھی ناقص کا اعتم بیکار اور محض باطل ہے؟ ان میں سے ایک ایک دعوے کا براہین کے ساتھ اثبات کیا جا چکا ہے اور فریق ثانی کے جملہ بے بنیاد دعوؤں کا دلائل سے بطلان ثابت کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں۔

الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن بکیرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ،

حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت عبد اللہ بن شدادؓ، حضرت نواس بن سمانؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کی اکثر روایتیں صحیح اور مرفوع ہیں اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی حدیث کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایتوں میں سورہ فاتحہ کا خاص لفظ موجود ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اور آپ یہ بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ فریق ثانی کے نزدیک بھی پیش کردہ احادیث کے تقریباً جملہ روایت کی ثقاہت، عدالت، امامت اور اتقانِ مسلم ہے، محض کسی کے تفرّد پر گرفت کی گئی ہے تو کسی کی تدلیس پر کسی کی تخیل پر اور کسی کے تغیر سیر پر اور کہیں مرفوع اور موصول روایت کو اصول شکنی کرتے ہوئے موقوف اور مرسل قرار دیا گیا ہے اور کہیں راوی حدیث کی مرضی کے خلاف بلکہ خود مرفوع حدیث کے خلاف حدیث کا مطلب لیا گیا ہے اور ان تمام خلاف قاعدہ باتوں کے علاوہ محض اپنی مرضی سے مطلق قرأت کو مقید کرنے کی ناکام سعی کی گئی ہے اور ایسی ایسی کمزور اور رکیک و ضعیف اور بعید از قیاس و انصاف تاویلات اور توجیہات اختیار کی گئی ہیں کہ فنِ اصول حدیث بھی ان سے نالاں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کے اس دعوے کی حقیقت بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ من کان لہ..... الخ کے تمام طرق معلول ہیں۔

قارئین کرام! ذرا ان راویوں کا ان راویوں سے تقابل کر لینا جن کی روایتوں سے فریق ثانی نے استدلال کیا ہے کیونکہ۔ ع: و بضعہا تتباین الا شیاء ہم دوسرے باب کو یہاں ختم کرتے ہیں اور تیسرا باب شروع کرتے ہیں۔ واللہ المستعان وهو نصر المعین۔

باب سوم

اہل اسلام سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد دینی مسائل میں جن حضرات کی طرف نگاہیں اٹھ سکتی ہیں۔ وہ شمع نبوت کے پروانے اور فیض رسالت سے مستفید حضرات صحابہ کرامؓ کی مخلص جماعت ہی ہو سکتی ہے اور ان کے بعد حضرات تابعینؓ کا دور ہے کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جو خیر القرون کے درخشندہ ستارے تھے، جن کی سعی بلیغ کی بدولت دنیا مے کفر و شرک میں روشنی پھیلی، بدعات و رسوم کا خاتمہ ہوا۔ جہالت و تاریکی دنیا سے مٹتی اور علم و عرفان کی بارش سے دلوں کی دنیا میں ایمان و بصیرت کی شادابی پیدا ہوتی۔ نیز یہ بات بھی مخفی نہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ شرف صحبت کی برکت سے سبکے سب عاقل، ثقف، متقی، خدا پرست اور پاکباز تھے۔ لیکن فہم قرآن اور تدبر حدیث میں سب برابر نہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کے آپس میں مختلف درجات اور متفاوت مراتب تھے۔ چنانچہ امام مسروقؒ (المتوفی ۶۳ھ جو والد ماجد الفقیہ اور احد ازہ علاقہ مر تھے تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۷) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرات صحابہ کرامؓ سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان سب کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ، پھر میں نے ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ پر ختم ہو گیا ہے (طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۲۵ ، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۲ و مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۶۲ مع شرح العراقي) امام حاکم نے بھی امام مسروقؓ سے یہ روایت نقل کی ہے، اس میں انھوں نے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کا نام لیا ہے (مستدرک جلد ۳ ص ۲۶۵ سکت عنہ الحاکمؒ والذہبیؒ) امام شعبیؒ (المتوفی ۱۰۳ھ) جو امام حافظ، فقیہ، متقن اور علامۃ التابعین تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰۰) کا بیان ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہؓ میں دینی مسائل میں فیصلہ کرنے والے چھ حضرات تھے۔ تین مدینہ طیبہ میں اور ان کے نام یہ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ اور تین کوفہ میں، ان کے اسماء یہ ہیں: حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ (مستدرک جلد ۳ ص ۲۶۵ و سکتا عنہ)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل کی ترویج اور اشاعت کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات تھے، پہلا طبقہ وہ ہے جس سے مسائل تواریخ ہوئے ہیں مگر کم۔ اور دوسرا طبقہ متوسط ہے اور تیسرا طبقہ وہ ہے جن سے دین کی بہت زیادہ اشاعت اور ترویج ہوئی ہے۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے دین، علم اور فقہ کی اشاعت ہوئی ہے ان میں حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ پیش پیش تھے۔ (الجنة فی الاسوة الحسنة بالسنة ص ۵)۔

الحمد للہ تعالیٰ کہ ان حضرات میں بیشتر وہ ہیں جو امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔

وفاؤں کے ہزاروں سے چکے ہیں امتحان تک

مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں عرض کی جا چکی ہیں، اسی طرح

حضرت ابوالدرداء کی صحیح اور مرفوع روایت بھی پیش کی جا چکی ہے اور اس کے موقف تسلیم کرنے میں تو فریق ثانی کو بھی کسی طرح کا کوئی تامل نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا ۵۲۵ میں یہ کہتا کہ یہ ان کا اپنا خیال تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کے مقابلہ میں خیال پر اڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا، اس لیے انھوں نے اس پہلے قول سے رجوع کیا۔ بالکل ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ کسی صحیح روایت سے ان کا رجوع ثابت نہیں۔ لفظوں کے ہوائی قلعہ سے کچھ نہیں بنتا اور اس کے خلاف جو روایت ان سے آتی ہے اس کا ذکر جلد دوم میں آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اب اس کے بعد بعض حضرات صحابہ کرام رضاً اور تابعین رضاً واتباع تابعین کی بعض روایتیں اور آثار سن لیجئے:

اثر حضرت عبداللہ بن عمر (المتوفی ۴۲ھ) امام مالک نافع سے روایت کرتے

ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے جب یہ سوال کیا جاتا تھا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی نمازی قرأت کر سکتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی آدمی امام کی اقتدار کر چکے تو اس کو امام کی قرأت ہی کافی ہے اور جب کوئی اکیلا نماز پڑھے تو اس کو قرأت کرنی چاہئے اور ابن عمر امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے

ان عبد اللہ بن عمر کان اذا سئل هل یقرأ احد خلف الامام قال اذا صلّی احد کو خلف الامام فصبہ قرأۃ الامام و اذا صلّی وحده فلیقرأ و کان ابن عمر لا یقرأ خلف الامام۔

(موطا امام کاظمی ص ۲۹ و دارقطنی ص ۱۵۱ وغیرہ)

امام مالک کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ نافع الامام اور العلم تھے۔ (تذکرہ،

جلد ۱ ص ۹۴) امام بخاری کا بیان ہے کہ اصح الاسانید یہ ہے مالک عن نافع ابن عمر (ایضاً) اس سے زیادہ قوی سند فن حدیث میں تقریباً محال ہے، حضرت عبداللہ بن عمر جلیل القدر صحابی تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور احد الاعلام فی العلم والعمل تھے۔ وہ اپنی علمی اور عملی قابلیت کی بنا پر خلافت اور حکومت کے

مستحق تھے۔ (ایضاً جلد ۱ ص ۳۵) بہر حال یہ روایت صحیح ہے اور قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ کان ابن عمر لا یقرأ خلف الامام جہر۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے اولہم جہر۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۳۶) تھے۔ امام جہر سے پڑھنا یا آہستہ (وہ خاموش پڑھتے تھے) اور میر صاحب کو بھی اقرار ہے کہ موطا کی مسند روایت صحیح ہوتی ہے۔ مولف خیر الکلام صفحہ ۵۲ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحب سے جب اس کی سند پر کلام کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکی اور چونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حدیث رفع یدین کے راوی تھے۔ اس لیے اس روایت کو اپنے حال پر چھوڑ کر آگے نکلنا بھی گوارا نہ ہو سکا۔ تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ٹھکان کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس اثر کا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اثر سے (جو دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲ وغیرہ میں ہے) تعارض ہے کہ انھوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت دی تھی اور چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما اپنے بیٹے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنت کے زیادہ بڑے عالم تھے، (کاش کہ مبارکپوری صاحب اپنے اس خود ساختہ قاعدہ پر ہی قائم رہتے تو بھی ایک بات تھی۔ صنف) اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اثر کو ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر پر ترجیح ہوگی۔ (ابکار المنن ص ۱۶۵)

جواب: اگر تعارض کا یہی مفہوم ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے لاکھوں بلکہ کروڑوں درجے آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سنت کے زیادہ عالم تھے۔ اس لیے جب آپ نے امام کے پیچھے قرأت سے منع کیا ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اثر پر آپ کے ارشاد کو بہر حال ترجیح ہوگی، حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا ایک اثر عنقریب ترک قرأت خلف الامام پر ذکر ہوگا اور جس اثر کا مبارک پوری صاحب نے حوالہ دیا ہے تو اس کی حقیقت بھی اپنے مقام پر واضح ہوگی۔ تعجب ہے کہ مبارکپوری صاحب کا وجود بھی اجتماع نقیضین سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ یہاں تو یہ لکھ کر وقت پاس کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا اپنے بیٹے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مجرد اعلم بالسنۃ ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اثر کو ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر پر ترجیح دی جاسکے۔ (ابکار المنن ص ۲۲)

شاید مولانا مبارک پوری صاحب کو جلدی سے پلینٹر ابھرنے کا خاص لطف محسوس ہوتا

ہوگا۔ اور وہ ایسی رکبک اور بعید انقیاس توجیہ کر کے دل میں خوشی مناتے ہوں گے کہ
ع: کہ مقابله تو دل ناتواں نے خوب کیا

مؤلف خیر الکلام نے اس صحیح اثر کا تقابل ان آثار سے کیا ہے جو کتاب القراءۃ ص ۶۱ اور
۶۵ میں حضرت ابن عمر رض سے اس کے خلاف آئے ہیں اور مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی
صحیح ہے اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے (ص ۵۲) اور یہ بحث انھوں نے ص ۳۲۲ میں کی ہے۔
کہتے ہیں کہ ان آثار میں سے ایک اثر کی سند میں ابو جعفر رازی عینی بن مایان جو متکلم فبیہ ہے
مگر حافظ ابن حجر نے لکھا ہے صدوق ہے اور ایک راوی سحبی بکار ہے وہ ضعیف ہے مگر ابن

سعد نے کہا ہے انشاء اللہ ثقہ ہے۔ الخ

الجواب: جب ہمارا پیش کردہ اثر آپ کے اقرار سے بھی صحیح ہے تو اس کے مقابلہ
میں ضعیف راویوں کی روایتیں لے کر تنکوں کا پل بنا کر کہاں کا انصاف ہے؟ بس صحیح لے لیں
اور ضعیف کو چھوڑ دیں یہ دونوں راوی نے متکلم فبیہ نہیں بلکہ بہت زیادہ کمزور ہیں پھر کس قدر
افسوس ہے کہ آپ ان کے اثر کو بھی صحیح کہہ رہے ہیں پھر صراحت و ابہام وغیرہ کی وجہ سے ترجیح دینا
نری شعبہ بازی ہے۔ صحیح اثر اور ضعیف کا کیا تقابل؟

اثر حضرت جابر بن عبد اللہ (المتوفی ۳۸ھ) ان کا اثر لیسند صحیح حدیث نمبر
کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کے قائل نہ تھے ،
مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے (ص ۵۱۹) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ حضرت
جابر صرف رکوع دانی رکعت کو بدون فاتحہ صحیح سمجھتے تھے اور یہ روایت اسی پر محمول ہے
اور اصول فقہ حنفیہ کی رو سے مستثنیٰ میں کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا لہذا مقتدی کے لیے
اس سے وہ کوئی حکم ثابت نہیں کر سکتے (محصلاً ص ۳۱)

الجواب: حرف من مؤلف مذکور کے نزدیک ویسے عام ہے اور ہمارے نزدیک
بھی یہاں شرط یہ ہونے کی وجہ سے عام ہے اور سکاۃ نکرہ ہے اور ساتھ موصوفہ اور خود
مؤلف مذکور کے نزدیک نکرہ موصوفہ عام ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۸۳) پھر اس تخصیص کو کون
ماتنا ہے؟ غرضیکہ حضرت جابر ہر رکعت میں اور ہر ایسے نمازی کے لیے جو مقتدی ہو یہ حکم بیان

کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہما جب حج وغیرہ کے لیے تشریف لے جاتے تو ان کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کر کے جاتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۹) اور نواب صاحب کے بیان سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ترک قرأت بعض یا چند حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اور فتویٰ نہ تھا بلکہ اس مسلک پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھاری اکثریت تھی۔ وکثیر من الصحابة۔
اعتراض: امام بیہقی رحمہ اللہ، امام نووی رحمہ اللہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ نے اس اثر کی یہ تاویل کی ہے کہ اس اثر میں قرأت سے مراد ما زاد علی الفاتحة کی قرأت ہے یا قرأت سے جہر مراد ہے (بیہقی جلد ۲ ص ۱۶۳، شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱۵ و ابکار المنین ص ۱۶۶)

جواب: یہ تاویل قطعاً باطل ہے کیونکہ اگر قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث سے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ثابت ہوتی تو تطبیق کے لیے یہ تاویل اختیار کی جاسکتی تھی۔ حالانکہ قرآن کریم اور صحیح و مرفوع حدیثوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام کے پیچھے عام قرأت تو کیا جائز ہوئی سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، باقی حضرت عبداللہ بن الصامت وغیرہ کی روایتوں کا ذکر بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر آئے گا۔ کہ خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور جو حدیثیں صحیح ہیں۔ وہ صرف امام اور منفر د کے حق میں ہیں، فریق ثانی کی یہ ستم ظریفی بھی قابلِ داد ہے کہ ایک طرف تو لا صلوة الخ کی روایتوں میں نکرہ پر لائے نفی جنس کو داخل سمجھ کر کے اتنی تعمیم مارد لی جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں کی کسی کتاب سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی اور دوسری طرف لا قرأۃ مع الامام فی شیء اور لا یقرأ خلف الامام فی شیء من الصلوة کو ایسا مقید کیا جاتا ہے کہ باوجودیکہ سورۃ فاتحہ ام القرآن اور قرآن عظیم ہے، مگر اس کی قرأت پر نہ تو لائے نفی جنس اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ لفظ شیء اور یہ عجیب تر بات ہے کہ لا صلوة الخ میں نفی کمال تو مراد نہیں لی جاسکتی مگر یہاں لا قرأۃ مع الامام فی شیء میں نفس قرأت سے جہر مراد ہو سکتی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! اور ان تینوں حضرات رض سے بیک وقت سوال ہوتا ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں (بقیہ پچھلا صفحہ) و فضیلت اور دارقطنی رحمہ اللہ معتبر کہتے ہیں اور ابن جنات ثقات میں لکھتے ہیں اور یہ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۶) اور عبد اللہ بن مقسم رحمہ اللہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب من ۲۵۳)

دیتے کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت کی جا سکے۔ اور ان میں حضرت جابرؓ بھی ہیں، جو بیابانگ ذیل قرأت سے ام القرآن کی قرأت مراد لیتے ہیں، بہر حال ان حضرات کی یہ تاویل قواعد اور اصول کے نیز صحیح احادیث کے خلاف ہوتے ہوئے۔ بعید از انصاف ہے، جو کسی طرح توجہ کی مستحق نہیں ہے اور صحیح اور مرفوع حدیثوں اور خود حضرت جابرؓ کے قول صریح کے مقابلہ میں یہ تاویل اس کی زیادہ مستحق ہے کہ — ع:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

اثر حضرت عبداللہ بن مسعود: امام ابو بکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الاحوص نے بیان کیا۔ وہ منصور سے اور وہ ابو وائل سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا:

اقرأ خلف الامام فقال ان في الصلوة شغلا
وسيكفيك قراءة الامام (الجوهري النقي
جلد ۱ ص ۱۶۰)

کیا میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں، حضرت
عبداللہ نے فرمایا کہ نماز میں امام قرأت میں
مشغول ہے اور تجھے امام کی قرأت ہی کافی ہو
جائے گی۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں چنانچہ علامہ بیہقی کہتے ہیں و رجالہ موثقون۔
(مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور مؤلف خمد الکلام ص ۵۲ میں لکھتے ہیں
کہ صحیح ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اثر مطلق ہے۔ اس میں فاسخ کا بالخصوص ذکر نہیں۔۔۔ الخ
الجواب: مطلق کی نفی سے مقید کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلہ
میں نہ تو ان کا کوئی اثر صحیح ہے اور نہ ام الکتاب کی تصریح ہے پھر کیوں اس صحیح اثر کو رد
کیا جاتا ہے؟ اس کے صحیح نہ ہونے کی بحث جلد دوم میں آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔
علاوہ انہیں اس کو مطلق (کہ فاسخ کو نہ شامل نہ ہو) کہنا بھی درست نہیں کیونکہ ایک روایت
لہ امام ابو بکر بن ابی شیبہ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱۳۱ میں اور منصور و ابو وائل کا باب اقل میں حضرت
ابن مسعود کے اثر کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ابو الاحوص کا نام سلام بن سلیم تھا۔ علامہ ذہبی
ان کو حافظ اور احادیث لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۳)

میں یوں تصریح آتی ہے جو بطور تائید پیش کی جا رہی ہے۔

ان ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا لایقراً خلف
 الامام فیما یحرفیہ و فیما یخافت
 فیہ فی الاولیین و لا فی الاخریین و
 اذا صلّی وحده قرأ فی الاولیین
 بفاحة الكتاب و سورة... الخ
 (موطا امام محمد ص ۹۶) سورت بھی۔

ان کی اس مفصل روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت میں فاتحہ خصوصیت سے شامل ہے۔
 اس کی سند یوں ہے: محمد بن ابان بن صالح القرظی (اس پر محدثین کرام نے کلام کیا ہے،
 مگر مؤلف خیر الکلام وغیرہ کی صریح عبارات عرض کی جا چکی ہیں کہ تائید اور متابعت میں ضعیف
 حدیث بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ لہذا اس کو تائید اور متابعت میں پیش کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے،
 عن حماد بن عمار عن ابراہیم بن علقمہ بن قیس بن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما... الخ
 باقی تمام راوی ثقہ ہیں اور علقمہ بن قیس کے اثر میں ان کے تراجم آرہے ہیں۔ امام بیہقی نے حضرت
 ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک اثر یوں نقل کیا ہے

لَوْنِ اعْتَصَى عَلَى جَبْرِ الْغَضَا حَتَّى الْيَمْنِ اَنْ
 اقراء خلف الامام۔
 یعنی یہ کہ میں جنت دخت کے جلتے کونوں کو منہ
 میں پکڑوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ امام
 کے پیچھے قرأت کروں اور پڑھوں۔ (ادراظاہر
 ہے کہ قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے)

دوسری سند: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ اور ابو سعید
 بن ابی عمرو نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو العباس محمد بن یعقوب نے بیان
 لے حافظ ابو عبد اللہ اور شعبہ کا ترجمہ باب اول میں حضرت مجاہد کے اثر کے ذیل اور ابن ہدیہ رضی اللہ عنہما کا
 سعید بن المسیب کے اثر کے تحت اور ثور بنی کا مقدمہ میں گزر چکا ہے۔ ابو العباس کو علامہ ذہبی الامام الثقات
 محدث مشرق لکھتے ہیں (ایضاً ص ۳۷۷)

کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارون بن سلیمان رحمہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الرحمن بن مہدی نے بیان کیا وہ سفیان (ثوری) سے اور شعبہ رحمہ سے روایت کرتے ہیں وہ دونوں منصور سے اور وہ ابو داؤد رحمہ سے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے سوال کیا :

عن القراءۃ خلف الامام فقال انصت
للقرآن فان فی الصلوۃ شغلًا وسیکیفیک
ذلک الامام۔
کہ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جاسکتی ہے؟ حضرت
عبداللہ نے فرمایا کہ قرآن کے لیے خاموش رہو۔
امام نماز کے اندر قرأت میں مشغول ہے۔ اور تجھے
(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۱۱)

حضرت ابن مسعود رحمہ کے ان صحیح آثار سے معلوم ہوا کہ وہ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے
قرأت کے قائل نہ تھے، ان کا ترجمہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ان پر
کلی اعتماد باب اول میں وضاحت اور صراحت سے گزر چکا ہے۔
اعتراض: امام بیہقی کہتے ہیں: (۱) حضرت ابن مسعود نے انصت کا حکم دیا ہے اور
انصت جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔

(۲) علقمہ کا بیان ہے کہ میں نے نماز میں حضرت ابن مسعود کو قُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا پڑھتے
سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت کے قائل تھے۔

(۳) عبداللہ بن زیاد سدھی کا بیان ہے کہ میں نے ظہر اور عصر کی نماز میں ابن مسعود سے
قرأت سنی ہے۔ (سنن الکبریٰ و کتاب القراءۃ)

جواب: امام بیہقی رحمہ کے اعتراض کی جملہ شقیں مردود ہیں علی الترتیب جواب سن لیجئے
(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم تمام سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے

اور یہ تمام حضرات فقہاء اور محدثین رحمہ کے نزدیک مشہور و معروف ہے۔ (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۳)
انصت کی پوری تحقیق باب اول میں آیت کے ذیل میں عرض کی جا چکی ہے اور فریق ثانی کا

سہ یہ امام ابوالعباس رحمہ کے جلیل القدر شیخ اور مشہور محدث تھے (دیکھئے تذکرہ جلد ۳ ص ۷۳) علامہ ذہبی رحمہ
ان کی سند کو صحیح سمجھتے ہیں (ایضاً جلد ۳ ص ۳۰۳)

شعبہ اور مغالطہ بھی نکال دیا گیا ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔
 (۲) امام بیہقی رحمہ نے اس قول کی کوئی سند نقل نہیں کی اور خود امام بیہقی رحمہ کا ارشاد
 ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ہرگز مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین، جمہول نامعبر اور
 غیر معلوم راویوں سے اخذ کریں۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۲ طبع دہلی) علاوہ بریں اس روایت
 میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ابن مسعود رحمہ نے امام کے پیچھے یہ آیت پڑھی تھی۔ اور اس کا بھی کوئی
 ذکر نہیں کہ قیام کی حالت میں پڑھی تھی۔ کیوں یہ ممکن نہیں کہ مسجد یا تشہد وغیرہ میں بطور دعا
 یہ آیت پڑھی ہو۔ اور مزید برآں اس آیت سے أم القرآن اور فاتحۃ الكتاب کے خاص لفظ
 پر استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

(۳) عبداللہ بن زیاد اسدی رحمہ کی روایت پر روایت اور درایت کلام اپنے موقع
 پر عرض کیا جائیگا۔ اشارۃ اللہ العزیز۔

تیسری سند: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تیسری سند کے ساتھ یہ الفاظ مروی ہیں:

قال انصت للقراءة فان في الصلوة شغلا و	فرمایا قرأت کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں
سيكفيك ذلك الوامر (طحاوی جلد ۱ ص ۱۸۵)	امام قرآن میں مشغول ہوتا ہے اور وہی امام تمہارے
مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۸۵، کتاب القراءۃ ص ۱۱۱	لیے کافی ہے۔ (تمہیں الگ قرأت کرنے کی ضرورت
موطا امام محمد ص ۹۱، فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱۲۵	نہیں ہے۔)
واتارلسنن جلد ۱ ص ۸۹ وغیرہ۔	

اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں: (۱) سند میں وہیب رحمہ بن خالد ہے،
 حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھا۔ لکنہ تغیر قلیلا باخرہ (تقریب ص ۳۸۸)
 آخر عمر میں تھوڑا سا تغیر ان کے حافظہ میں آچکا تھا۔

(۲) اس اثر کی سند میں نصر بن مزروق ہے اور مجھے اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔
 (۳) اس میں خصیب واقع ہے نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ (ابکار المنن ص ۱۹۵)
 جواب: یہ تمام شقیں باطل ہیں: (۱) ثقہ اور ثبت راوی کا تغیر سیرا اور قلیل مضر
 نہیں ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(۲) خصیب سے خصیب بن ناصح رحمہ فرمادیں۔ امام ابو ذر رحمہ فرماتے ہیں ما بہ
 بأس انشاء اللہ اور ابن جبان رحمہ ان کو ثقات ہیں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۳ ص ۱۲۳)

(۳) نصر بن مزروعہ کا ترجمہ اگر مبارک پوری صاحب نے لکھا تو کیا ہرج ہے۔
 علامہ بیہقی فرماتے ہیں رجالہ موثقون (مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۱۸۵) اس کے تمام راوی
 ثقہ ہیں اور علامہ نیموی لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (آثار السنن جلد ۱ ص ۸۹) اور
 باقر مبارک پوری صاحب نے جاننے والوں پر جاننے والوں کو ترجیح دیا کرتی ہے۔ قاضی شوکانی
 لکھتے ہیں ومن علم حجة علی من لا یعلم (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۳۲) کہ جاننے والا نہ جاننے
 والے پر حجت ہے، یعنی جاننے والے کی بات نہ جاننے والے کی بات پر راجح ہوگی۔ حضرت
 عبداللہ بن مسعود کی بعض صحیح روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں اور متعدد سندیں
 ان سے اور بھی مروی ہیں۔ مگر ہمارا مقصد تمام روایات و آثار کا استیعاب نہیں صرف اپنے
 دعویٰ کو روشن کرنا ہے۔

اثر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما: امام طحاوی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

امام طحاوی ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ الحنفی (المتوفی ۳۲۱ھ) علامہ ذہبی رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ
 الامام العلامة اور الحافظ تھے اور انھوں نے بہترین کتابیں لکھی ہیں، محدث ابن یونس کا بیان ہے
 کہ وہ ثقہ، ثبت، فقیہ اور بڑے عقلمند تھے۔ اور انھوں نے اپنے بعد کوئی اپنا نظیر نہیں چھوڑا۔
 (تذکرہ جلد ۳ ص ۲) مسلم بن قاسم رحمہ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ جلیل القدر، فقیہ البدین اور علماء کے مختلفاً
 کے جاننے میں بڑی مہارت رکھتے تھے (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۷۶) حافظ ابو عمر رحمہ بن عبد البر کا بیان
 ہے کہ وہ تمام فقہاء کے مذاہب پر گہری نگاہ رکھنے والے تھے۔ (الجوامع المصنوعہ جلد ۱ ص ۱۰۱) امام
 ابن ندیم رحمہ فرماتے ہیں کہ وہ کان اوحد اهل زمانہ علمنا و زهدا (الفہرست لابن ندیم ص ۳)
 کہ وہ اپنے زمانہ میں علم و زہد میں یکتا تھے اور حافظ ابن القیم لکھتے ہیں: امام الحنفیة فی وقتہ
 فی الحدیث والفقہ و معرفة اقوال السلف۔ ۱ھ (اجتماع جیوش الا سلامیۃ ص ۱۷)
 کہ وہ اپنے وقت میں حدیث فقہ اور معرفت اقوال سلف میں احاف تھے۔

ابراہیمؑ بن ابی داؤد نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو صالحؓ عبد الغفار بن داؤد الحارثی نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حماد بن سلمہؓ نے بیان کیا۔ وہ ابو حمزہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا۔

اقراء والا مامربین یہی قال لا۔ یعنی کیا امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟
(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ والجوہر النقی جلد ۱ ص ۱۲۹ و آثار اللسان جلد ۱ ص ۸۹ وغیرہ)

اس صحیح روایت میں سسری اور بھری کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مسلک تھا۔

اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں:

(۱) حماد بن سلمہ کا آخر عمر میں حافظہ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

(۲) عیزہؓ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اجازت قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرتے

ہیں اور اس کی سند بالکل بے غبار ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۶)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے: (۱) تغیر لیسیر کا محقق حکم پہلے لکھا جا چکا ہے

اور حماد بن سلمہ کا ترجمہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ امام احمدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حماد بن

سلمہ حافظ ابن حجرؒ ان کو من الحفاظ المکثرین لکھتے ہیں (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۴۵) کہ وہ حفاظ

حدیث میں شمار ہوتے ہیں جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ علامہ یاقوت حمویؒ فرماتے ہیں کہ ۲۴۶ میں

ان کی وفات ہوئی ہے اور وہ ثقہ اور حفاظ حدیث میں تھے۔ محدث ابن یونسؒ نے ان کو ثقہ اور من حفاظ

الحدیث لکھتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ نے بھی ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث لکھتے ہیں اور امام ابن عساکرؒ

بھی ان کو ثقہ من حفاظ الحدیث کی صفت سے یاد کرتے ہیں۔ (امانی الاحبار جلد ۱ ص ۱۶۶)

۳ وہ ثقہ اور فقیہ تھے۔ (تقریب ص ۲۳۳)

۴ ان کی توثیق باب اول میں سعید بن مسیبؒ کے اثر کے تحت نقل ہو چکی ہے۔

۵ ان کا نام نصر بن عمرانؒ تھا جو ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۴۳) حضرت ابن عباس رضی

جلیل القدر صحابی ہیں۔

سلمہ پر اعتراض کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کے اسلام میں متہم سمجھو۔ اصل الفاظ یہ ہیں
 فاتحہ علی الاسلام اور لواب صاحب لکھتے ہیں کہ گویم حماد بن سلمہ امام است
 تفرؤش ما دام کہ در رویش مانعی از اصول نبود مفریست» (بدور اللہ ص ۳۳)
 (۲) یہ اپنے مقام پر عرض کیا جائے گا کہ عیزارہ کی روایت میں کوئی عیار ہے یا نہیں؟
 علاوہ بریں حضرت ابن عباسؓ کی بسند صحیح دو روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں۔
 ایک اور روایت: حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رض بن عباسؓ سے
 سوال کیا گیا۔

قیل له ان ناسا یقرؤن فی الظهر والعصر
 فقال لو کان لی علیہم سبیل لقلعت
 السننہم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 قرأ فکان قرأتہ لنا قرأۃ وسکوۃ لنا
 سکوتا۔
 کہ کچھ لوگ ظہر اور عصر کی نماز میں قرأت کرتے
 ہیں کیا یہ درست ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے
 فرمایا۔ اگر میرا ان پر پس چلتا تو میں ان کی زبانیں کھینچ
 لیتا۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
 قرأت کی ہمیں بھی قرأت کرنی چاہیے اور آپ
 نے سکوت اختیار کیا، ہمیں بھی سکوت کرنا چاہیے۔
 (طحاوی جلد اول)

اس اثر میں اگرچہ خلف الامام کی قید مذکور نہیں ہے۔ لیکن بادی تا مل یہ بات بخوبی معلوم ہو سکتی
 ہے کہ امام اور منفرد کو تو بالاتفاق قرأت کرنا ضروری ہے۔ پھر نہ معلوم حضرت ابن عباسؓ جیسے
 لہ اس اثر کی سند کے راوی یہ ہیں: (۱) امام طحاوی (۲) ابن مزوق (۳) ان کا نام ابراہیم بن مزوق تھا۔ امام
 نسائی (۴) اور اباس بہ کہتے ہیں دارقطنی (۵) ان کو ثقہ خطی کہتے ہیں۔ ابن یونس کہتے ہیں کہ وہ
 ثقہ اور ثبت تھے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور
 سعید بن عثمان کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۳ محصلہ)

(۶) وہب بن جریر ثقہ تھے (تقریب ص ۲۸۸) (۷) جریر بن حازم ثقہ تھے۔ (ایضاً ص ۲۶)
 (۵) ابو یزید مثنیٰ، ابو حاتم، امام احمد اور ابوداؤد ان پر اعتماد کرتے تھے، ابن معین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔
 (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۸) حافظ ابن حجر ان کو مقبول کہتے ہیں (تقریب ص ۲۳۲) (۶) عکرمہ ثقہ تھے
 (ایضاً ص ۲۶۸) (۷) حضرت عبداللہ رض بن عباسؓ صحابی ہیں۔

ترجمان القرآن اور جبر الامتہ ان لوگوں کی زبانیں کھینچنے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئے تھے؟ اگر ان کے بس اور قدرت میں ہوتا تو ضرور اپنا ارادہ پورا کر گزرتے، ناچار یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور حضرت ابن عباسؓ نے ان کی اس مذموم حرکت سے انتہائی نفرت کی اور یہ بھی مت بھولئے کہ پڑھنے والے ظہر اور عصر کی نماز میں پڑھتے تھے جو بالاجماع سترہ نمازیں ہیں اور یہ ممکن تھا کہ قرأت مازاد علی الفاتحہ کی قرأت پر حمل کر لیا جاتا، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ امام کے پیچھے مطلقاً قرأت کے قائل نہ تھے، اور گزر چکا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت میں امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحہ الكتاب کے پڑھنے کی ممانعت آئی ہے۔ اور یہ بھی درست نہیں ہو سکتا کہ قرأت کو جہر پر حمل کر لیا جائے، اس لیے کہ قرأت کا تقابل سکوت سے کیا گیا ہے اور سکوت کے معنی آپ پہلے وضاحت کے ساتھ پڑھ چکے ہیں، بہر کیف خود اس اثر کے اندر ایسے قرائن موجود ہیں، جو اس امر کو متعین کر دیتے ہیں کہ یہ بحالت اقتدار امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے جس پر حضرت ابن عباسؓ طیش میں آکر یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ باقی اثر کے اس حصہ کا مطلب کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرأت کی اور ہمارے لیے آپ کی اقتدار ضروری ہے اور آپ نے سکوت بھی کیا۔ اور ہمارے لیے سکوت میں بھی آپ کی پیروی لازمی ہے۔ تو اس کی پوری بحث سکوت کے ذیل میں کی جا چکی ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بحالت امت قرأت کی اور بحالت اقتدار سکوت اختیار کیا۔ یا یہ مطلب ہو کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے امام تھے۔ اور آپ کی قرأت ہم سب مقتدیوں کی قرأت تھی۔ اور آپ کا کچھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد کی قرأت کو ترک کر کے اس سے سکوت اختیار کرنا ہمارے لیے کافی ہوتا تھا تو اس لحاظ سے حدیث من کان له امام فقراۃ الامام له قرأۃ کی گویا یہ اثر تفسیر اور تشریح ہو گا۔ اس حصہ کا یہ مطلب ہو یا کوئی اور ہو ہمارا استدلال واضح ہے اور اس پر موقوف نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۵۱ میں ہمارے اس مطلب کو ایک قسم کی تحریف معنوی ہے" سے تعبیر کیا ہے اور دلیل یہ بیان

کی کہ بخاری اصلاً کی روایت میں ابن عباس سے آتا ہے قرآن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیہما امر وسکت فیہما امر... الخ امام بخاری نے اس سے جہر مراد لی ہے اور اس پر باب الجہر بقراءة صلوة الصبح قائم کیا ہے اور پھر ص ۳۱۹ اور ص ۳۲۰ میں لکھتے ہیں کہ امام اسمعیلی اور حافظ ابن حجر یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن عباس کو ستری نمازوں میں قرأت کا شک تھا اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ نفی کرتے تھے مگر آخر میں قائل ہو گئے تھے لہذا اس سے مراد یا تو جہر ہے یا ان کا پہلا نظریہ ہے اور بعض حنفیہ کا مطلب قطعاً غلط ہے (مصلحہ) الجواب: مگر ہم نے استدلال بخاری کی روایت سے نہیں کیا بلکہ طحاوی کی روایت سے کیا ہے جس کے الفاظ اور ہیں اور اس میں تفصیل ہے اور ظہر اور عصر کی قید موجود ہے وہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پہلے قرأت میں شک یا انکار کرتے تھے تو بات قدسے معقول ہے مگر اس کا صحیح ثبوت درکار ہے اور در صورت صحت امام بخاری کی روایت کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے مگر ان سے ستری نمازوں میں قرأت اور ترک القراءة خلف الامام کی روایتیں بالکل صحیح ہیں اور دوسری روایتیں اس پایہ کی نہیں ہیں اس لیے ان کے آئینہ میں ان صحیح روایات کا مطلب لینا غلط ہے۔

اثر حضرت خلفاء راشدین: امام عبدالرزاق رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں:

ان ابابکر وعمر وعثمان كانوا ينهلون
عن القراءة خلف الامام
(بخار عمدة القاری جلد ۳ ص ۶۷ و اعلاار السنن جلد ۴ ص ۴۵)

کہ حضرت ابوبکر (المتوفی ۱۳ھ) اور حضرت عمر (المتوفی ۲۳ھ) اور حضرت عثمان (المتوفی ۳۵ھ) امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔

امام عبدالرزاق رحمہ اپنے مصنف میں داؤد بن قیس سے روایت کرتے ہیں اور وہ

لہ ثقہ اور حافظ تھے۔ (تقریب ص ۲۴۰)

لہ ثقہ اور فقیہ تھے (تقریب ص ۳۶۸) ثبت اور کثیر الحدیث تھے (تہذیب التہذیب ص ۳۶) حجت اور صفارتابعین میں تھے (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۱۳)

لہ امام شافعی ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں امام احمد رحمہ، ابوزرعہ رحمہ، نسائی رحمہ، ابو حاتم رحمہ (باقی اگلے صفحہ پر)

محمد بن عجلان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں؛
قال علیؑ من قرأ مع الامام فلیس علی
شخص نے امام کے ساتھ قرأت کی تو وہ فطرۃ
الفطرۃ۔

(بحوالہ الجوهر النقی جلد ۲ ص ۱۴۹) پر نہیں ہے۔

اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶ کی روایت میں ہے؛

من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرۃ۔
کہ جس نے امام کے پیچھے قرأت کی اس نے فطرۃ کو
کھو دیا۔

امام محمدؑ فرماتے ہیں کہ ہم سے داؤد بن قیس نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن عجلان نے

بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں؛

ان عمر بن الخطاب قال لیت فی فم الذی
کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا۔ کاش جو شخص
امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر

(موطا امام محمد ص ۱)

اور حافظ ابو عمرؒ بن عبد البر لکھتے ہیں کہ؛

ثبت عن علیؑ وسعد بن زید بن ثابت انه
حضرت علیؑ اور حضرت سعد بن زید اور حضرت زید بن
بن ثابت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ انھوں نے
فرمایا کہ امام کے ساتھ نہ سب سے نمازوں میں قرأت
کی جا سکتی ہے اور نہ جہری نمازوں میں۔

(بحوالہ الجوهر النقی جلد ۲ ص ۱۴۹)

حضرت علیؑ رض سے ایک دوسری روایت یوں مروی ہے، جو صرف متابعت کے طور

پر نقل کی جاتی ہے؛

من قرأ خلف الامام فلیس علی الفطرۃ۔
کہ جس شخص نے امام کے پیچھے قرأت کی وہ فطرۃ پر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ابن سعد، ابن مینی، رح اور ساجی رح سب ان کو قہر کہتے ہیں۔ ابن معین رح ان کو
صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبان ثقافت میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۹۸)
بلکہ ان کا ترجمہ باب دوم حدیث نمبر ۲ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

(ظحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ منتخب کنز العمال) ^{۱۸۴} ہیں۔

اور گو موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن عجلان کی روایتیں مرسل ہیں لیکن جبہور ائمہ کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے جس کی تحقیق پہلے گذر چکی ہے۔ یہی اعتراض مولف خیر الکلام نے ص ۵۱۴ میں کیا ہے کہ یہ دونوں اثر ضعیف ہیں کیونکہ یہ دونوں مذکور راوی صحابہ تابعین میں ہیں۔ حضرت عمرؓ سے ان کی لقائ ثابت نہیں ہے۔ (محصلاً) ہم بھی ان کو مرسل مانتے ہیں، مگر معتضد ہے جو حجت ہے اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور یہ ایک دوسرے کے اعتضاد کے لیے کافی ہیں اور دوسری حدیثیں اس پر مستزاد ہیں، حضرت علیؓ کی دوسری روایت میں ابن ابی لیلیٰ رحمہ اور مختار بن ابی لیلیٰ رحمہ کمزور اور ضعیف ہیں۔ اور اسی وجہ سے مبارکپوری صاحب نے اس پر اعتراض کیا ہے (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۰۹) مگر ہم نے اس سے استدلال نہیں کیا۔ بلکہ اس کو محض متابعت میں نقل کیا ہے، اور بقول مولف خیر الکلام ان میں بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے۔ ص ۳۱۹ حضرات خلفار راشدین رضی اللہ عنہم اور حضرت معین بن ابی وقاص، ایسے جلیل القدر اور بلند مرتبہ صحابہ کی دینی خدمات اور دیگر علمی اور عملی فضائل کا کون انکار کر سکتا ہے؟ ہاں البتہ کوڑ مغز اور خیرہ چشم کی بات ہی الگ ہے۔ یہ وہی اکابر ہیں جن کو دنیا میں حضرت محمد رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے جلتی ہونے کی بشارت اور خوشخبری مل چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مومن کا خطاب عنایت فرما کر ابدی رضا کا پروانہ لے دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (المتوفی ۵۸ھ) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (المتوفی ۵۷ھ) کا اثر؛ امام بیہقی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رحمہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو یحییٰ سمرقندی رحمہ نے بالمشافہ بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن نصر رحمہ نے بیان کیا، وہ فرماتے

لہ ان کا نام محمد بن اسحاق سمرقندی ہے، جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے۔ علامہ ذہبی نے (تذکرہ جلد ۲ میں

ص ۲۰۱) ان کا نام ذکر کیا ہے

۱۸ علامہ ذہبی رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ الامام شیخ الاسلام اور الفقیہ تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۱) حافظ ابن حجر رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور الحافظ تھے۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۳۸۹) ابن جبار ان کو احد الائمة فی الدنیا کہتے ہیں

ہیں کہ ہم سے محمد بن یحییٰ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن یوسف نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصم نے بیان کیا، وہ ابو صالح ذکوان سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

انہما کانَا یا مران بالقرآۃ و راعی الامام
 کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما
 دونوں اس بات کا حکم دیتے تھے کہ جب امام
 جہ سے قرأت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے قرأت کرنی
 چاہیے۔

دوسری سند: امام بیہقی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن محمد بن الحارث نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو محمد بن حیان نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن عبد اللہ بن رستہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شعیبان بن فروخ رحمہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے علامہ ذہبی نے ان کو امام شیخ الاسلام اور حافظ نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ ص ۲۸۱) ابو حاتم رحمہ ان کو امام اہل زمانہ اور ابو بکر بن زیاد ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے ہیں (ایضاً ص ۱۸۱) حافظ ابن حجر رحمہ ان کو امام اہل زمانہ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ص ۵۱۱)

علامہ ذہبی نے ان کو حافظ العابد اور شیخ الشام لکھتے ہیں، امام بخاری نے ان کو افضل اہل زمانہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۴۱) امام بخاری نے ان کو ثقہ لکھتے ہیں، ابو حاتم رحمہ ان کو صدوق اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ص ۵۲۶)

علامہ عاصم رحمہ بن ہمدان اگرچہ بعض محدثین نے خطا واضطراب اور وہم کی وجہ سے ان میں کلام کیا ہے لیکن جہور ان کو ثقہ لکھتے ہیں چنانچہ امام احمد، علامہ ابن سعد علی اور ابو زرعمہ ان کو ثقہ لکھتے ہیں، ابن معین ثقہ اور لا بأس بہ نسائی، لیس بہ بأس اور یعقوب بن سفیان ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتم رحمہ ان کو صداقت شعار اور صالح الحدیث لکھتے ہیں۔ بزار کا بیان ہے کہ مجھے کوئی ایسا محدث معلوم نہیں جو ان سے روایت نہ کرتا ہو۔ امام یحییٰ نے ان کو امام اعمش کا ہم پایہ لکھتے ہیں، ابن حبان اور ابن شاپور ان کو ثقہ لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۹) علامہ ذہبی نے ان کو حسن الحدیث لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۵۰) حافظ ابن کثیر عاصم بن ہمدان کی سند کو حید اور قوی لکھتے ہیں (ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۳۷) امام حاکم رحمہ اور (باقی اگلے صفحہ پر)

عکرم بن زہیر نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصم بن بہدک نے بیان کیا۔ وہ ابوصالح سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں:

انہما کانا یا امران بالقراءة خلف الامام
 فی الظہر والعصر فی الرکعتین الاولیین
 بفاتححة الکتاب وشیء من القرآن وکانت
 عائشہ تقرأ فی الاخریین بفاتححة الکتاب۔
 (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۱)

کہ وہ دونوں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے
 پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیتے تھے اور دونوں
 فرماتے تھے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں سورۃ
 فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا چاہیے
 اور حضرت عائشہؓ ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں
 صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ جہری نمازوں میں امام
 کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ صرف ظہر اور عصر کی سب سے نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأت
 کے قائل اور اس پر عامل تھے۔ اور وہ دونوں پہلی رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ وشیء
 من القرآن کی قرأت کے بھی قائل تھے۔ اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اور اس روایت
 سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے حضرت ابو ہریرہؓ قرأت
 سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ ہاں حضرت عائشہؓ صدیقہ کا اس پر عمل تھا، حضرت عائشہؓ

اور حضرت ابو ہریرہؓ کا حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اور خاص طور پر فن روایت میں جو مقام
 اور رتبہ ہے اور دین کی جتنی خدمات ان سے سرانجام ہوتی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟

مبارکپوری صاحب نے عاصم بن بہدک کی وجہ سے اس روایت پر کلام کیا ہے۔
 (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۹۸) لیکن مولانا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ان کا موازنہ ذہن محمد بن
 (بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ عاصم بن بہدک کی روایت کو صحیح کہتے ہیں۔ (مستدرک جلد ۲

صفحہ ۲۱۶)

۳ امام احمد نے ان کو ثقہ اور علامہ ذہبیؒ ان کو من اجل الناس واثقلہم کہتے ہیں (تذکرہ جلد
 ص ۸۳) اصول حدیث اور محدثین کی تصریح کے مطابق یہ حدیث حسن ہے قوی اور صحیح ہے۔

اسحاق وغیرہ سے کر دیکھیں۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۱۸ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی بظاہر صحیح ہے مگر اس میں ممانعت کا ذکر نہیں اور یہ اثر جہری نماز کی نفی میں صریح نہیں۔

الجواب: ممانعت کا نہ سہی جہری نمازوں میں ترکِ قرأت کا ذکر تو ہے اور اذالم یجھس شرط اور قید ہے اور صراحت کیا ہوتی ہے؟ اور ترکِ قرأت خلف الامام کی وجہ سے بطلان نماز کی رٹ تو باطل ہوتی۔

حضرات! قارئین کرام! ابھی حضرات صحابہ کرام کے بہت سے آثار پیش کیے

لہ امام ابن قدامہ نے کئی سندات کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو سعیدؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حذیفہؓ کی روایتیں نقل کی ہیں (معنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۵) اور حافظ ابو عمرؓ بن عبد البرؓ کے حوالے سے حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے نام نقل کیے جا چکے ہیں۔ اور امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے (جزء القراءة ص ۳) اور علامہ عینیؒ نے مانعین قرأت خلف الامام میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد الرحمنؓ بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبد اللہؓ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا ذکر بھی کیا ہے اور اس پر ایک روایت بھی وہ نقل کرتے ہیں (عمدة القاری جلد ۳ ص ۶۶) نیز علامہ عینیؒ اور ملاح علیؒ القاریؒ لکھتے ہیں کہ اسی حضرات صحابہ کرامؓ سے امام کے پیچھے قرأت کی نمانعت کا ثبوت ملتا ہے۔ (عمدة القاری جلد ۳ ص ۶۶ اور شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳) بلکہ امام شعبیؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے: قال ادركت سبعين بدريا كلهم يمنعون المقتدى عن القراءة خلف الامام۔ (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵) کہ میں نے ستر عدد بدری حضرات صحابہ کرامؓ کو دیکھا ہے کہ وہ سب مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے اور صاحب ہدایہ نے جلد ۱ ص ۱۰۱ میں تو اجماع صحابہ کا دعویٰ کیا ہے، حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں (کہ آیت کا شان نزول بالا جماع خلف الامام کا مسئلہ ہے، اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرنا منکر شاذ اور مخالف اجماع ہے) (باقی اگلے صفحہ پر)

جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارا مقصد ان کا استیعاب نہیں ہے بلکہ ہم نے عمداً صرف ان حضرات صحابہ کرام کے جن پر زیادہ تر علم حدیث فقہ اور دین موقوف ہے۔ (مثلاً حضرات خلفائے راشدین، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عائشہؓ وغیرہم) صحیح آثار صرف بطور نمونہ عرض کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جمہور اہل اسلام کا دامن قرآن کریم صحیح اور مرفوع احادیث کے علاوہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کسی با عظمت عبادت وابستہ ہے اور آخر میں ہم صرف ایک ہی اثر نقل کر کے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان پیش کردہ آثار پر اکتفا کرتے ہیں۔ وفیہا کفایۃ لمن لہ ہدایۃ۔

اثر حضرت سعد رضی اللہ عنہ (المتوفی ۵۵ھ) امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ داؤد بن قیس نے ابن نجاد سے روایت کی ہے جو حضرت سعد بن ابی وقاص کی اولاد میں تھے اور وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فیہ جمرۃ (جزء القراءۃ من موطا امام محمد بن) کہیں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو، اس کے منہ میں آگ کی چنگاری ڈال دوں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) صاحب ہدایہ کا یہ دعویٰ منیٰ بر الصفا معلوم ہوتا ہے اور محض تعصب نبویؐ پر اس کو حمل کر لینا قرین قیاس نہیں ہے (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

لہٰذا یہ سخت الفاظ صرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے منقول نہیں بلکہ دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے بھی اسی طرح کے تہدید فی الفاظ مروی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں تیغ ڈالنا چاہیے (موطا امام محمد ص ۹۸ منتخب کنز ص ۱۸۷ و البحر النقی ص ۲ ص ۱۴۹، طحاوی ص ۱۴۹) اور ایک روایت میں نقتن (بدبو دار چیز) اور ایک میں سرفس (گرم تھیر) کے الفاظ آئے ہیں (جزء القراءۃ صلا وغیرہ) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت کر نیوالے کے منہ میں آگ بھردی جائے (زیلعی جلد ۲ ص ۱۶۱) اور حضرت اسود تابعیؓ کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے، اس کے منہ میں مٹی ڈالی جائے (البحر النقی جلد ۲ ص ۱۴۹) اور حضرت علقمہ تابعیؓ سے مٹی اور رصف دونوں الفاظ منقول ہیں (البحر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹) اور حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ امام (باقی اگلے صفحہ پر)

اعتراض: امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے: (۱) ابن نجاد مجہول ہے۔
(۲) آگ کی چنگاری اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور انسانوں کو ایسی سزا دینے کی صحیح حدیث میں
نہی آتی ہے (بخاری جلد ۱ ص ۲۲۳ وغیرہ)

(۳) مجاد کہتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کر نیوالے کا منہ شکر سے بھر دیا جائے۔

جواب: حضرت امام بخاری کا یہ اعتراض تمام شقوں کے ساتھ مخدوش ہے،
ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ کریں: (۱) ابن نجاد کی جہالت کا دعویٰ کر کے اس اثر
سے اغماض کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکم تحریر فرماتے ہیں:

وولد سعد بن ابی وقاص الیٰ سنۃ خمسین کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی اولاد میں
۲۵۰ھ تک بڑے بڑے فقیہ، امام ثقہ اور حافظ
ومأتین فیہم فقہاء واثمہ وثقات و

حفاظ۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۵) پیدا ہوتے رہے ہیں۔

اور امام بخاری کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی ہے۔ اس لیے ابن نجاد (جو حضرت سعد بن ابی وقاص
کی اولاد میں تھے) کی جہالت کو بہانہ بنا کر اس اثر کو رد کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکم کی عبارت
کے پیش نظر ابن نجاد ثقہ حافظ اور امام تھے۔ علامہ عینی عبد الرزاق بن بہام کے طریق سے روایت
نقل کرتے ہیں:

عن داؤد بن قیس عن محمد بن بجاؤد (بکسر الباء) کہ داؤد بن قیس محمد بن بجاؤد سے روایت کرتے
الموحدة وتخصیف الجیم) عن موسى بن سعد ہیں اور وہ موسیٰ بن سعد سے روایت کرتے ہیں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے پیچھے قرأت کر نیوالے کی ناز ہی سرے سے نہیں ہوتی (موطا امام محمد ص ۱) اگرچہ
ان میں بعض آثار کمزور ہیں، مگر کچھ صحیح بھی ہیں اور یہ سب مل ملا کر اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کی بھی
کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے، اگر نص قرآنی اور صحیح و مرفوع احادیث اور جہود ائمہ کا اس بات پر اتفاق
نہ ہوتا کہ امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے تو یہ الفاظ یقیناً غلو اور زیادتی پر محمول ہو سکتے تھے مگر سابق
ابواب کو پیش نظر رکھنے کے بعد قرآن کریم اور صحیح حدیث کی مخالفت کر نیوالے کے حق میں یہ الفاظ زیادہ
سنگین نہیں ہیں۔ ہاں البتہ ان دلائل سے جو شخص ناواقف ہو اور یہ ناواقفی بھی محض دیانت پر مبنی ہو تو اس کے
لیے مزید احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً وہ حضرات جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور جن کی نگاہوں اس طرح کی جامع
کئے ہوئے دلائل نہیں گذر سکے مگر یہ سب دلائل دیکھ کر ضد کر نیوالے کے لیے یہ الفاظ بالکل مناسب ہیں۔

بن ابی وقاص قال ذکر لی ان سعد بن وقاص
قال وددت ان الذی یقرأ خلف
الامام فی فیه حجر (عمدة القاری جلد
۶) ۷

کہ انھوں نے حضرت سعد سے روایت کی
انھوں نے فرمایا کہ میں پسند کرتا ہوں کہ جو شخص
امام کے پیچھے قرآن کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر
ڈالا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض ولد سعد سے مراد موسیٰ بن سعد ہیں۔ محدث مولانا محمد حسن
صاحب فیض پور می فرماتے ہیں کہ
رجال اسنادہ ثقات
(الدلیل المبین ص ۳۴۴)

لہذا مولف خیر الکلام کا عثمان بن عبد الرحمن وقاصی کے متروک اور جھوٹا ہونے سے اس
مذکورہ سند کے ضعف پر استدلال کرنا (ملاحظہ ہو ص ۵۲۳) باطل ہے کیونکہ یہ مذکورہ روایت
صحیح اور اس کی سند کے روایت ثقہ ہیں جن میں ابن سجاد بھی ہیں اور اغلب ہے کہ
جزء القرآن میں ابن سجاد ہی کا ابن سجاد بنا ہوا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں
کہ جس مسئلہ میں جہور صحابہ کرام کے دو یا تین قول ہوں تو ان سب پر اہل علم کے کسی نہ کسی
طائفہ نے عمل کیا ہے۔

وآیة ذلك ان نظہر فی مثل الموطاء
وجامع عبد الرزاق روایا تھو اھ
(حجة الله جلد ۱ ص ۱۸۷ مصر)

اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان کی روایتیں،
موطا اور جامع عبد الرزاق میں بیان ہوئی ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اقوال صحابہ کرام جو موطا اور جامع عبد الرزاق میں ہوں وہ مستند
اور قابل اعتبار ہیں۔

(۳) قلعوں، سواری کے جانوروں اور انسانوں کو جلانے کے بارے حضرت صحابہ کرام میں خاصا اختلاف
ہے ایک گروہ جواز کا اور دوسرا عدم جواز کا قائل ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۵۱) حافظ ابن حجر نے جلانے کی حدیثوں
کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۳۶ و ۱۵۱) لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر
نے حضرت صحابہ کرام کی موجودگی میں باغیوں کو آگ میں جلیا یا تھا اور حضرت خالد بن الولید نے بھی مرتدوں

کو جلا یا تھا اور آگے لکھا: واكثر علماء المدينة يجيزون النخ (فتح الباری ۲/۲۶۷) اس سے معلوم ہوا کہ نسخ کا مسئلہ اتفاقی نہیں اغلب ہے کہ حضرت سعدؓ بھی جواز کے قائل تھے ان حضرات کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں وددت سے بڑھ کر لفظ ہممت (کہ میں البتہ قصد اور ارادہ کر چکا ہوں) کے الفاظ آئے ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سخت ارادہ کر چکا ہوں کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔ ان کو گھروں کے اندر بند کر کے آگ میں جلا دوں (بخاری ص ۸۶ و مسلم ۲/۲۳۲) نیز آپ نے فرمایا کہ جو لوگ جمعہ کی نمازیں شریک نہیں ہوتے ہیں ان کو گھروں میں بند کر کے آگ میں جلانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ مسلم ۲/۲۳۲ و مشکوٰۃ ص ۱۲۱) اور آپ نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے، تو میں اپنا ارادہ پورا کر چکتا (مسند احمد ص ۱۰۱ و ابوداؤد طیالسی ص ۱۳۱) حضرت سعدؓ نے تو خلاف شرع کام کرنے والوں کے لیے صرف آگ کے عذاب کی آرزو کی ہے لیکن جناب رحمۃ اللہ علیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو مجرموں کو آگ میں جلانے کا قصد تک فرما چکے تھے اور اگر عورتوں اور بچوں کا سوال سامنے نہ آتا تو آپ یقیناً اپنا ارادہ پورا کر گزرتے کیا یہ روایتیں امام بخاریؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں؟ اور کیا یہ حدیثیں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے لا تعد بواجذاب اللہ کی حدیث کے خلاف ہیں؟ اگر نہیں تو امید قوی ہے کہ حضرت سعدؓ کا اثر بھی مخالف نہ ہوگا، بلکہ اس کو بطریق اولیٰ مخالف نہ ہونا چاہیے۔

ع: - "مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے وہاں"

(۳) امام بخاریؒ نے حمادؒ کے قول کی سند بیان نہیں کی تو ایسی بے سند بات کا کیا اعتبار ہے؟ علاوہ انہیں اگر حمادؒ کے قول کی سند بھی مل جائے، تب بھی قرآن کریم صحیح احادیث اور آثار صحابہ کے مقابلہ میں حمادؒ کے قول کی کیا وقعت ہے؟ خود امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ جب ایک چیز آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو جائے تو اسودرہ وغیرہ کی بات کیسے محبت ہو سکتی ہے؟ (جزء القراءة، ص ۱) بیچ ہے نگار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے آپ کی تمنا ہی سے پہلے کی ہے اس کے بعد آپ نے منع کیا قرآن کریم میں ہے: لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ... الخ ص ۵۲۳

الجواب: بے شک جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے لیکن

جن حضرات کے نزدیک آگ میں جلانا جائز ہے ان کے نزدیک اس کی تمنا بھی جائز ہے۔ باقی قرآن کریم میں تمنائے عذاب کی نہیں ہے اس میں حسد سے منع کیا گیا ہے و آل چیزے دیگر است۔

لطیفہ: اگر حضرت حماد کے اس قول کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا — (ملی فوہ سکرا) منہ شکر سے بھر دیا جاتے تو بھی اس سے حضرت امام بخاریؒ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اگر عین نماز کی حالت میں قاری کا منہ شکر سے بھرنا مراد ہے تو بیچارہ قرأت تو کیا کرے گا۔ جہر کے ساتھ آمین بھی نہیں کہہ سکیگا یک نہ شد و شد، بلکہ وہ تو آہستہ آمین کہنے سے بھی رہا اور شکر بھی حضرت حمادؒ نے تھوڑی تجویز نہیں کی بلکہ اچھی خاصی تجویز کی ہے جس سے (ملی فوہ سکرا) اس کا منہ خوب بھر سکے، کیا بعید ہے کہ حمادؒ نے امام کے پیچھے قرأت کی بندش کا یہ طریقہ ایجاد کیا ہو مگر امام بخاریؒ اس کی سطحی مٹھاس کو دیکھ کر ان کو اپنا ہمنوا سمجھ بیٹھے ہوں، مشہور ہے کہ گڑ سے مخالف کو جلدی قابو کیا جاسکتا ہے اور اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا خارج از نماز شکر سے منہ بھرنا مراد ہے تو اس نازک دور میں دوسری اشیاء خوردنی کی طرح شکر کے لیے بھی لوگ سرگرداں پھر رہے ہیں۔ فریق ثانی حضرت حماد کے اس قول کا اعلان کر دے، پھر قدرت خدا کا تماشا دیکھے کہ جماعت کی تعداد کیسے بڑھتی اور اس کو کیسے ترقی حاصل ہوتی ہے؟ بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ عوام تو کیا اچھے خاصے محدث بھی حضرت ابوسعید الخدریؓ کی مرفوع حدیث ان احق ما اخذت علیہ اجل کتاب اللہ (او کہا قال) سے اس شکر خوری پر استدلال کرتے نظر آئیں گے اور حماد کے زمانہ کی شکر سے اس ترقی یافتہ دور کی شکر بد بھرا زیادہ سفید اور عمدہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ فریق ثانی سے فرعی مسائل میں قدرے دور ہیں (مثلاً پٹھان وغیرہ) اور چائے کے اشد عادی ہیں اور کھانڈ اور شکر نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اس شکر کی اعلان کے بعد فریق ثانی کے حلقہ گوشت ہو جائیں اور بیماروں کو تو یونانی قدحوں پر قدھے پینے کے لیے شکر مل جائیگی۔ غرضیکہ اس اعلان کے بعد سورۃ فاتحہ کی برکت سے ہر کس و ناکس کو اس کا سورۃ الشفا اور سورۃ

السؤال وغيره ہونا آسانی سے سمجھ آ سکتا ہے اور اس کی برکت سے ہمیں توفیق حاصل ہے ہی، فریق ثانی کو بھی بڑی فتح اور کامرانی حاصل ہوگی۔ الغرض امام بخاری نے امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے لیے شکر تحریر فرمائی اور عین نماز کی حالت میں جیسا کہ ان ظاہری الفاظ سے متبادر ہوتا ہے مگر یہ خیال نہ کیا کہ گھر کس کا پورا پورا ہے؟ سچ ہے۔

ع۔ میری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی

حضرات! حضرات صحابہ کرام کے ان مختصر سے آثار کے بعد مشتے نمونہ از خروا کے طور پر بعض حضرات تابعین^۱ واتباع تابعین^۲ وغیرہم کے کچھ آثار آپ کے سامنے عرض کیے جاتے ہیں تاکہ آپ کو حضرات تابعین^۳ وغیرہم کا نظریہ بھی بسلسلہ قرأت خلف الامام معلوم ہو سکے اور اختصاراً نقل سند کے بعد ہم روایت کی توثیق بھی عرض کر میں گئے، اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں گے۔

اثر علقمہ بن قیس^۴ (المتوفی سنہ ۶۸ھ) امام محمد فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حماد نے بیان کیا۔ وہ ابراہیم نخعی^۵ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

لہ علامہ ذہبی ان کو امام باقر لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۱) امام نووی ان کو صاحب کمال فقیہ لکھتے ہیں (تہذیب اللسان جلد ۱ ص ۳۴۲) علامہ ابن سعد ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۶۲) ابو ظبیان کا بیان ہے کہ میں متعدد حضرات صحابہ کرام کو علقمہ سے مسائل پوچھتے اور استفسار کرتے دیکھا ہے (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۶۸) حماد بن ابی سلیمان، امام مسلم اور دیگر محدثین نے ان سے احتجاج کیا ہے (الجواہر المصنیہ جلد ۱ ص ۲۲۶) امام احمد ان کی تعریف کرتے تھے اور ان کو قابل اعتبار سمجھتے تھے۔ امام معمر کا بیان ہے کہ میں نے امام زہری، حماد اور قتادہ سے بڑھ کر دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ امام ابن معین، عجللی اور نسائی نے ان کو ثقہ لکھے ہیں، ابو حاتم ان کو صدوق اور مستقیم لکھتے ہیں۔ ابن عدی (۱۰) باس بہ لکھتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تہذیب

التہذیب جلد ۳ ص ۱۶ و ۱۷)

۱۰ ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

علقمہ بن قیسؓ نے امام کے پیچھے کبھی کسی نماز میں
 قرآنہ نہیں کی نہ جہری نمازوں میں اور نہ ستری میں
 (نہ پہلی رکعتوں میں اور نہ پچھلی رکعتوں میں، نہ
 سورۃ فاتحہ اور نہ کوئی سورت امام کے پیچھے وہ
 کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے۔

ماقرأ علقمة بن قيس قطفيما يجهر فيه
 ولا فيما لا يجهر فيه ولا الركعتين الأخيرين
 امر القرآن ولا غيرها خلف الامام -
 (بحوالہ تعلق الحسن جلد ۱ ص ۹۰)

اور یہ اثر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ حضرت علقمہؓ امام کے پیچھے کسی نماز
 میں کوئی قرآنہ نہیں کیا کرتے تھے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً۔ اگرچہ حماد ثقہ تھے مگر مدلس
 اور مختلط تھے۔ وثانیاً۔ ابراہیم نخعیؒ کی علقمہؓ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ لہذا یہ روا
 صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۹)

جواب: جب حماد ثقہ تھے اس روایت میں اختلاط سے کوئی فرق نہیں پڑیگا کیونکہ محدثین نے اس امر کی تصریح
 کی ہے کہ انکو اختلاط کا عارضہ آخر میں لاحق ہوا تھا اور ابراہیم نخعیؒ کی روایتوں میں وہ خطا نہیں کرتے تھے (تہذیب التہذیب ص ۱۸۰)
 مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ اور سفیانؒ اور ان کے طبقہ کے مدلسین کی تدلیس مضر
 نہیں ہے۔ علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمہ سے سماعت کی ہے۔

(تذکرہ جلد ۱ ص ۹۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۸۰) اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ ابراہیم
 نخعیؒ نے علقمہ سے ملاقات نہیں کی مرود ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ابراہیم نخعیؒ
 کی ملاقات علقمہ سے نہیں ہوئی تو یہ روایت مرسل ہوگی۔ اور امام دارقطنیؒ، امام طحاویؒ، حافظ
 ابن قیومؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کی مرسل روایتیں بھی حجت اور
 صحیح ہیں۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳، طحاوی جلد ۱ ص ۱۳، زاد المعاد جلد ۲ ص ۲۵۴ و درایہ حقا) اور امام
 بیہقیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مرسلات ابراہیم صحیحۃ الاحادیث تاجر البحرین۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۴۸)

لہ یاد رہے کہ یہ روایت صرف مرسل ہی نہیں بلکہ مسند اور مرفوع بھی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود فرما
 ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا کہ حضرت! میں بحرین کے علاقہ میں
 تجارت کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھو (رواہ الطبرانی فی الکبیر و رجالہ مؤثقیون صحیح الزوائد
 جلد ۲ ص ۲۸۳)

کہ تاجربحرین کے مضمون والی روایت کے علاوہ ابراہیمؒ کی تمام مرسل روایتیں صحیح ہیں، بہر حال یہ روایت فن روایت اور محدثین کے اصول کے ماتحت بالکل صحیح اور حجت ہے۔
 اثر عمر بن میمونؒ (المتوفی ۱۲۸ھ) وغیرہ ابو بکرؓ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے نیزیدؒ بن ہارونؒ نے بیان کیا، وہ اشعثؒ سے اور وہ مالک بن عمارہؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب اور تلامذہ سے جن میں خصوصیت سے عمر بن میمونؒ قابل ذکر ہیں۔ امام کے پیچھے قرآنہ کرنے سے متعلق سوال کیا۔ کلہم یقولون لویقرأ خلف الامام (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹) تو ان سب نے جواب یہ دیا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہئے، محقق نیموی نے فرمایا تھا کہ مجھے مالک بن عمارہ کا ترجمہ نہیں مل سکا، مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تو اس اثر کا پیش کرنا بے سود ہے۔ (ابار المنن ص ۱۲) مگر ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ مالک بن عامرؒ ہیں جو ثقہ اور ثبوت تھے اور یہ اثر بھی صحیح ہے، حضرت علیؒ جب کوفہ تشریف لے گئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱)

لہ ان کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ لہ وہ ثقہ متقن اور عابد تھے (تقریب ص ۱۲)

لہ اشعث بن ابی الشعثاء، امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ، ابو داؤدؒ اور بزازؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، علیؒ ان کو شیوخ کوفہ اور ثقات میں لکھتے ہیں اور ابن حبانؒ اور ابن شاپرؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔

تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص ۱۱)

لہ یہ مالک بن عمارہ نہیں بلکہ مالک بن عامرؒ ہیں جو اشعثؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب

التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵ وغیرہ) علامہ ذہبیؒ ان کو صاحب ابن مسعودؒ قدیم الموت اور ثقہ لکھتے ہیں،

(میزان جلد ۱ ص ۳) امام ابن معینؒ، ابو داؤدؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے

ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۹) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۲۹) ابو عطیہؒ ان کی

کنیت تھی بخاری ۲ ص ۶۵ اور ترمذی جلد ۱ ص ۸۸ میں ان کا ذکر ہے۔

لہ نواب صاحبؒ نے اصحاب علیؒ اور عبداللہؒ سے اشعائیس کے نام بتلائے ہیں جو جلیل القدر محدث

اور امام تھے۔ (الجنہ ص ۱)

اصحاب عبد اللہ ﷺ شرح ہذہ القریۃ (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۴) عبد اللہ
بن مسعود کے اصحاب اس شہر کے روشن چراغ ہیں اور آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اصحاب
عبد اللہ ﷺ سب کے سب امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی فتویٰ دیا کرتے
تھے۔

اشرا سوڈ بن زید (المتوفی ۵۷ھ) ابو بکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں ہم سے ابن علیہ
نے بیان کیا۔ وہ ایوب اور ابن ابی عروبہ سے روایت کرتے ہیں، وہ دونوں ابو معشر
سے وہ ابراہیم نخعی سے اور وہ سوڈ بن زید سے۔

قال لوان اعرض جمرۃ احب الی من ان اقراء
خلف الامام اعلم انه یقرأ۔

(آثار السنن جلد ۱ ص ۹)

انہوں نے فرمایا کہ میں اس بات کو زیادہ
پسند کرتا ہوں کہ اپنے منہ میں آگ کی چنگاری

ڈال لوں بجائے اس کے کہ میں امام کے پیچھے قرأت
کروں جبکہ مجھے علم ہے کہ وہ پڑھتا ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مدلول میں واضح ہے۔ مبارکپوری صاحب نے ابراہیم نخعی کی
تدلیس کا بہانہ کیا ہے۔ (ابکار وغیرہ) مگر بے سود ہے کیونکہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ

۱۔ علامہ ذہبی ان کو امام فقیہ، زاہد، عابد اور کوفہ کا امام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۴۳) امام نووی

لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۱۲) محدث

ابن حبان ان کو فقیہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۴) حافظ ابن کثیر ان کو من کبار التابعین

اور من اعیان اصحاب ابن مسعود اور من کبار اهل الکوفۃ لکھتے ہیں (الہدایہ والنہایہ

جلد ۱ ص ۱۲)

۲۔ ان کا نام اسمعیل بن ابراہیم بن مقسم تھا، جو ثقہ اور حافظ تھے۔

۳۔ ایوب کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن مسعود کے اثر کے تحت اور ابن ابی عروبہ کا باب دوم

حدیث ۱ کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

۴۔ ابو معشر کا نام زیاد بن کلیب تھا۔ محدث عجل، نسائی، ابن مدینی اور ابو جعفر سب ان کو

ثقہ کہتے ہیں، ابن حبان ان کو حفاظ متقین میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۸۳)

ابراہیم نخعیؒ اس طبقہ کے ماس تھے جن کی تدلیس مضر نہیں ہے اور ان کی جملہ روایتیں (علاوہ ایک روایت تاجہ بخرین کے) حجت ہیں، چنانچہ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: قلت استقر الیہ امر علی ان ابراہیم حجتہ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳۵) میں کہتا ہوں یہ طے شدہ بات ہے کہ ابراہیم حجت تھے۔

دوسری سند: ابو بکرؓ بن ابی شیبہؒ، ہشتمؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمعیلؒ بن ابی خالد نے بیان کیا۔ وہ وبرہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت اسود بن زیدؒ سے وہ فرماتے ہیں قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام علی فاہ ترا یا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰) کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

تیسری سند: عبدالرزاقؒ بن ہمامؒ اپنے مصنف میں سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ امام اعمشؒ سے اور وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسود بن زیدؒ سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام علی فاہ ترا یا (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹) میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

۱۰ ہشتم بن بشیر ثقہ اور ثبت لیکن کثیر التدلیس تھے (تقریب ص ۳۸۱) مگر اس روایت میں وہ تحدیث کرتے ہیں۔

۱۱ امام ابن حمدیؒ، ابن معینؒ، نسائی اور علیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن عمار موصیٰ ان کو حجت اور یعقوب بن سفیان ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ، یعقوب بن شیبہؒ، ابن حبانؒ اور ابن عیینہ ان کو ثقہ، ثبت اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۹۱)

۱۲ وبرہ بن عبدالرحمنؒ امام ابو زرہؒ، ابن معینؒ اور علیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۱ ص ۱۱۱)

۱۳ عبدالرزاق بن ہمامؒ کا ترجمہ انہر حضرت علیؒ میں اور سفیان ثوریؒ کا مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ بقیہ روایات کا ترجمہ بھی گذر چکا ہے۔ امام اعمشؒ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص ۱۶) البتہ مدلس تھے، لیکن حضرت قتادہ کی بحث ملاحظہ کر لیجئے کہ ان کی تدلیس بھر مضر نہیں ہے۔

غالباً حضرت اسود کے یہی وہ الفاظ ہیں، جن پر حضرت امام بخاریؒ بہت ناراض ہوئے ہیں (دیکھتے جزاء القراءۃ ص ۱)

اثر سوید بن غفلہ (المتوفی سلّم ۱۸۷) ابو بکر بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے فضل بن دکین نے بیان کیا۔ وہ زہیرؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ ولید بن قیسؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سوید بن غفلہ سے سوال کیا۔ اقرأ خلف الامام فی الظهر والعصر قال لا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۱۹) کیا میں ظہر اور عصر کی نمازیں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ فرمایا نہیں، اس اثر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائل کو دوسری نمازوں کے بارے میں تو یہ علم تھا کہ ان میں امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کو صرف ظہر اور عصر کی نماز میں قرآۃ خلف الامام کے بارے میں تردید تھا۔ سو حضرت سوید نے اس کا یہ مغالطہ بھی نکال دیا ہے۔

اعراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سند میں ولید بن قیسؒ صحیح ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کو مقبول لکھتے ہیں (تقریب ص ۳۸۶) اور علامہ بیہقی نے جبل المتین میں لکھا ہے کہ جس اسی کے متعلق حافظ ابن حجرؒ مقبول لکھتے ہیں وہ کمزور ہوتا ہے۔ لہذا یہ اثر کمزور ہے (ابکار المتین ص ۱۹۶) جواب: جبل المتین ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ نہ معلوم محقق

لے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ بلند مرتبہ عابد، زاہد، قانع بالیسیر اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۱) امام ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، محدث ابن قانعؒ قرآن کو صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں (تہذیب التہذیب ص ۲۷۸) حافظ ابن کثیرؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت سوید بن غفلہ نے فرمایا کہ میں آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ہم عمر ہوں کیونکہ میری ولادت بھی عام فیل میں ہوئی ہے اور امام بیہقیؒ ان سے یہ نقل کرتے ہیں کہ میں آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے صرف دو سال عمر میں چھوٹا ہوں (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۶۲)

ابو بکر بن ابی شیبہؒ اور فضل بن دکینؒ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔

ابو زہیر بن معاویہ ثقہ اور مثبت تھے (تقریب ص ۱۱)

ابو ولید بن قیسؒ سکونی امام ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام نسائیؒ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقہات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۱۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۳۸۶)

نیموئی یہ کس راوی اور کس موقع اور محل لکھا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس راوی کے متعلق لکھا ہو، جس کو دیگر محدثین مکرور بتاتے ہوں اور صرف حافظ ابن حجر ہی اس کو مقبول کہتے ہوں اور ولید بن قیس کو تو دیگر محدثین بھی ثقہ کہتے ہیں۔ علاوہ بریں مبارکپوری صاحب کو یہ مخالف ہوا ہے۔ یہ راوی ولید بن قیس تجلی نہیں جن کو حافظ ابن حجر مقبول لکھتے ہیں (اور محدث عجلی تابعی اور ثقہ لکھتے ہیں۔ اور ابن حبان ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳۶) بلکہ یہ ولید بن قیس سکونی ہیں جو زہیر سے روایت کرتے ہیں (دیکھتے تہذیب التہذیب ص ۱۳۶)

ع: "میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

اثر نافع بن جبیر (المتوفی ۳۹۵ھ) امام مالکؒ یزید بن رومان سے روایت کرتے ہیں اور وہ نافع بن جبیر سے کان یقرأ خلف العلم فیما لا یجہس فیہ الامام (موطا امام مالک ص ۲)

لے محقق نیموئی کا نام طہیر حسن ابوالخیر کنیت اور شوق تخلص تھا۔ آپ مولانا علامہ محمد عبدالرحیم لکھنوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ) کے شاگرد رشید تھے، بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے، فن اسماہ الرجال پر گہری نظر رکھتے تھے، اور خداداد ذہانت اور فطانت میں قاضی شوکانی سے بھی انکا پایہ بہت بلند تھا۔ مگر افسوس کہ ناپائیدار زندگی نے ساتھ نہ دیا اور ان کی قابلیت کے پورے جوہر بھی اچھی طرح اجاگر نہ ہوئے تھے کہ ۱۴ رمضان ۱۳۲۲ھ میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی مشہور کتاب آثار السنن (مع حاشیہ تعلیق الحسن) کو علامہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور فریق ثانی کی نگاہوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، مولانا مبارکپوری صاحب نے ابکار المعنی لکھ کر اپنی جماعت کو یہ یاد دہانے کی کوشش کی ہے کہ یہ آثار السنن کا جواب ہے، مگر وہ بری طرح اس میں ناکام رہے ہیں، فریق ثانی کے چیدہ چیدہ علماء کو بلکہ خود مبارکپوری صاحب کو بھی اس کا گہرا احساس تھا اور یہ سلیم الطبع آدمی اس ٹھوس نظریہ کا یقیناً احساس کر سکتا ہے ولین الخیر کالمعاینۃ۔

۳ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نافع بن جبیر امام اور فاضل تھے۔ ان کی توفیق اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۱۲۲) ابن خراشؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ مشہور اور امام تھے۔ وہ مدینہ طیبہ کے صاحب افتار علماء میں تھے اور ان کے فناوی معتبر سمجھے جاتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۰۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من الثقات النبلاء اور من ائمة الاجلاء لکھتے ہیں (الہدایہ والنہایہ جلد ۳ حضرت امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے) ص ۳۰۵)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ اگر ہر نماز اور ہر رکعت میں امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ ضروری ہوتی۔ تو حضرت نافع بن جبیرؓ سب نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے، مگر وہ صرف ستر نمازوں میں قرأت کرتے تھے۔ اور کیا بعید ہے کہ امام مالکؓ وغیرہ کی طرح وہ بھی استحباب کے قائل ہوں اگر وہ وجوب کے بھی قائل ہوں۔ تب بھی فریق ثانی کی جہری نمازوں میں بطلان نماز کی رٹ تو غلط ہو جائیگی۔ وعلیٰ ہذا القیاس ہم جتنے آثار نقل کریں گے، جن میں صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے ترک قرأت کا ثبوت ہوگا۔ ان سے ہمارا مدعا بھی محض یہ ہے کہ فریق ثانی کا عمومی نظریہ صحیح نہیں ہے اور بس گو ان میں ستر نمازوں کے اندر قرأت کا ثبوت بھی ہوگا، استحبابی طور پر ہو یا وجوبی طور پر بہر حال ہمارا مطلب اور مدعا واضح ہے۔

اثر سعید بن المسیبؓ (المتوفی ۹۲ھ) ابو بکرؓ بن ابی شیبہؓ فرماتے ہیں کہ ہم سے ویکعؓ نے بیان کیا۔ وہ ہشامؓ دستوائیؓ سے اور وہ حضرت سعید بن المسیبؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: انصت للامام (آثار السنن جلد احق) یعنی امام کے پیچھے بالکل خاموشی اختیار کرو، اور قرأت نہ کیا کرو۔ حضرت سعید بن المسیبؓ کا ایک اثر باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے اور یہ اثر بھی اپنے معنوی اعتبار سے واضح ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً۔ اس اثر کی سند میں قتادہ مدلس ہیں، جو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ثانیاً۔ امام بخاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیبؓ، عروہؓ، شعبیؓ، عبید اللہؓ بن عبد اللہؓ، نافع بن جبیرؓ، ابو الملیحؓ، قاسم بن محمدؓ، ابو مجلزؓ، مکحولؓ، مالک بن عوانؓ اور سعید بن ابی عروہؓ قرأت خلف الامام کے قائل تھے۔ (جزء القرآن ص ۱) لہذا یہ اثر حجت نہیں ہو سکتا (ابکار المنن وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) زین الدین رومانؒ کو امام نسائیؒ اور ابن معینؒ ثقہ لکھتے ہیں۔ علامہ ابن حبانؒ ان کو ثقہات میں لکھتے ہیں۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو عالم، کثیر الحدیث اور ثقہ لکھتے ہیں (تہذیب ۱) ۳۲۵
۱۔ ہشام دستوائیؓ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۸) حضرت سعید بن المسیبؓ کا ترجمہ باب اول میں اور قتادہ ویکعؓ اور ابو بکرؓ بن ابی شیبہؓ کا باب ثانی میں نقل ہو چکا ہے۔ وہاں ہی ملاحظہ کریں۔

جواب: حضرت قتادہ کی تدلیس کا مفصل جواب پہلے دیا جا چکا ہے اور حضرت سعید بن المسیب کے بسند صحیح و اثر ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور امام بخاری نے اپنے استدلال میں ان کے اثر کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بے سند بات حجت نہیں ہو سکتی۔ اور حضرت عروہ بن زبیر نافع بن جبیر اور قاسم بن محمد وغیرہ کو مطلقاً مجزین قرأت خلف الامام میں شمار کرنا باطل ہے بعض کے آثار اس کے خلاف نقل کیے جا چکے ہیں اور بعض کے عرض کر دیے جائیں گے۔ اور بقیہ آثار کی اسانید پر آثار خصوم میں بحث کی جائیگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

اثر سعید بن جبیر (المتوفی ۹۴ھ) ابو بکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیہتم نے بیان کیا۔ وہ ابویشر سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن جبیر سے سوال کیا۔

عن القراءة خلف الامام قال ليس خلف الامام قراءة۔
کیا امام کے پیچھے قرأت کی جاسکتی ہے؟ فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت نہیں کی جاسکتی۔ (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹)

اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اولاً۔ بیہتم مدلس تھے۔ اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں و ثانیاً۔ حضرت سعید بن جبیر سکتا امام میں قرأت کے قائل تھے (جزء القراءة ص ۵۷) اس لیے یہ اثر قابل احتجاج نہیں ہو سکتا۔ (ابکار المنن ص ۱۶۷ وغیرہ)

جواب: یہ بالکل صحیح ہے کہ بیہتم کثیر التدلیس تھے، لیکن حضرت امام بخاری اور علامہ ذہبی ان کی معنعن حدیث سے استدلال کرتے ہیں (دیکھئے صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸ و تذکرہ ص ۷ ص ۲۴۷ وغیرہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے، مزید تائید کے لیے علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ علماء اعلام میں تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۵) امام نووی کا بیان ہے کہ وہ تابعین کے ائمہ کبار میں تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عبادت اور زہد و ورع اور جملہ کمالات میں وہ کبار ائمہ اور سرگروہ تابعین میں تھے۔ (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۲۱۶)

علامہ ابویشر کا نام جعفر بن ایاس تھا اور وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۶) بیہتم کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

ایک اور روایت سن لیجئے امام ابن جریرؒ عبد اللہ بن مبارکؒ کے طریق سے روایت کرتے ہیں اور وہ بقیہ بن ولید سے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ثابت بن عجلان سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے سنا۔ انہوں نے فرمایا کہ آیت واذا قرئ القرآن... الا یہ خطبہ، جمعہ اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی نعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۳) اور سعید بن جبیرؒ کے سنا والے اثر کا جواب باب اول اعتراض ۱۱ کے جواب میں دیکھ لیں کہ نہایت کمزور اور ضعیف ہے۔

اثر عروہ بن زبیرؒ (المتوفی ۹۲ھ) امام مالکؒ ہشام بن عروہ اور وہ اپنے والد عروہ بن زبیرؒ سے روایت کرتے ہیں:

انه كان يقرأ خلف الامام اذا لم يجبه
فيه الامام بالقرأة (موطا امام مالك
ص ۱ و كتاب القرأة ص ۱)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کیا کرتے تھے جن میں اہل جہر سے قرأت نہیں کیا کرتا تھا۔

اثر ابراہیم نخعیؒ (المتوفی ۹۶ھ) ابو بکر بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو خالد نے بیان کیا وہ اعمشؒ سے اور وہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

لہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب بشمار ہیں، ان کی جلالت علوتے مرتبت اور وفور علم پر سب کا اتفاق ہے فقہ میں ان کو اتنا کمال حاصل تھا کہ مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاریں سے ایک فقیہ مانے جاتے تھے (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۳۳) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور عالم مدینہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۳) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ ثبت کثیر الحدیث فقیہ اور بلند قدر لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۳۳) ان کا علمی کمال اس قدر مسلم تھا کہ بڑے بڑے حضرات صحابہ کرامؓ مسائل ان کی طرف بجمع کرتے تھے (البدایہ والنہایہ ۹ ط ۱) اس کمال کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ کوئی مسئلہ عرض اپنی دانتے نہ بیان کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۸۳)

کہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الحجة الفقیہہ لکھتے ہیں (تذکرہ ۱ ص ۱۳۶)

اثر خالد الاثر کا ترجمہ باب دوم حدیث ۱۱ میں اور ابراہیم نخعیؒ کا مقدمہ میں اور امام اعمشؒ کا حضرت اسودؒ سے

یعنی لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت ایجاد کی ہے۔ اور وہ (یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ) امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔

اقل ما احده ثوالقراءة خان الامام
وكانوا لا يقرأون (البحر المنقى جلد ۲ ص ۱۶۹)
اور یہی مضمون بعینہ شمس الدین ابن قدامہ نے
بھی نقل کیا ہے۔ (شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۳)

امام ابن قدامہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت مختار کے زانیوں نکالی، کیونکہ وہ لوگوں کو دن کی نمازیں تو پڑھا دیا کرتا تھا۔ مگر رات کی نمازیں نہیں پڑھاتا تھا (اور حاکم ہونے کے باعث ناچار لوگوں کو اس کے پیچھے نمازیں پڑھنی پڑتی تھیں اس لیے) اس سے بظن ہو کہ لوگوں نے اس کے پیچھے قرأت شروع کر دی (مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۱۶۱) اگر یہ نقل صحیح ہے تو امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بدعت ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا ہے؟ تسلیم کرنے والے کے لیے یہ دلائل بڑے مضبوط اور ٹھوس ہیں البتہ نہ ماننے والے کا کوئی علاج نہیں۔

اشراق اسم بن محمد (المتوفی سنہ ۱۱۰۰ھ) امام مالکؒ یحییٰ بن سعیدؒ اور امام ربیعہ بن عبد الرحمنؒ

۱۰ علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ قاسم بن محمد امام القدرہ اور الفقیہ تھے (تذکرہ جلد ۹ ص ۹) علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ رفیع المنزلت و عالی مرتبت فقیہ امام اور بڑے حافظ حدیث تھے اور متورع تھے (طبقات جلد ۵ ص ۱۳۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کی جلالت و شوق اور امامت سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسما جلد ۵ ص ۵۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الفقہار المشہورین اور افضل اہل مدینہ اور اعلم اہل زمانہ تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۵) امام مالکؒ فرماتے تھے کہ قاسمؒ اس امت کے فقہار میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۳۸) ابوالزنادؒ کہتے ہیں کہ میں نے قاسمؒ سے زیادہ سنت کا عالم اور فقیہ نہیں دیکھا (تذکرہ ص ۹۱)

۱۱ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ شیخ الاسلام، عالم اور قاضی المدینہ لکھتے ہیں (ایضاً ص ۱۳۸)
۱۲ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، فقیہ اور مجتہد تھے۔ علامہ خطیبؒ کا بیان ہے کہ وہ فقیہ، عالم اور حافظ فقہ اور حدیث تھے (ایضاً جلد ۱ ص ۱۳۸)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت قاسم بن محمدؓ سے کہ وہ کان یقرأ خلف الامام فیہا لویجہرفیہ الامام بالقراءة (موطا امام مالک ص ۲۹) صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ یہ اثر بھی جہری نمازوں میں ترک القراءت خلف الامام کے بارے میں بالکل روشن اور واضح ہے۔

امام اوزاعیؒ (المتوفی ۱۵۷ھ) بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ جیسا کہ امام ابن قدامہ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل تھے لیکن صرف استحباب کے طور پر چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

اور ایک گروہ کا یہ مسلک ہے جیسے امام اوزاعیؒ
 و مذہب طائفة کالوزاعی وغیرہ
 من الشامیین یقرأھا استحبابا و هو
 اور ان کے علاوہ دوسرے شام میں رہنے والے
 اختیار جدان انتھی (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴)
 علماء کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا صرف استحباب کے
 درجے میں ہے اور اسی مسلک کے ہمارے دادا
 نے اختیار کیا۔

کیا بعید ہے کہ حضرت عبادہ بن الصامت اور حضرت مکحول وغیرہ شامی علماء اور ائمہ وغیرہ من الشامیین کی مد میں شامل ہوں اور امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کے صرف استحباب کے قائل ہوں؟ آخر شیخ الاسلام کی بات ہے اور اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ امام اوزاعیؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

امام سفیان ثوریؒ (المتوفی ۲۰۵ھ) بھی سری اور جہری کسی نماز میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے (جیسا کہ تفسیر معالم التنزیل جلد ۲ ص ۶۲۶ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے) اور امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو امام ماجتہ شیخ الاسلام اور احد الاعلام کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۷۸) مجدالدین لقب عبد السلام نام اور ابو البرکات کنیت تھی (دیکھئے الجنة ص ۳۸ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنة)

امام لیث بن سعد (المتوفی ۱۵۸ھ) کا مسلک بھی ترک القراءۃ خلف الامام تھا جیسا کہ معنی ابن قدامہ کے حوالہ سے مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ حضرت مولانا السید علامہ بحر العلوم، سید الحافظ محمد انور شاہ (المتوفی ۱۳۵۶ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ ان کا مسلک بھی امام کے پیچھے ترک قراءۃ ہی تھا جیسا کہ حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے استفادہ میں لکھا ہے اور وجوب کا مسلک تو ہرگز نہ تھا جیسا کہ شیخ الاسلام نے (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۲۲) میں لکھا ہے (فصل الخطاب ص ۸) امام ابن سبیر کا ترجمہ بھی مقدمہ میں گزر چکا ہے۔ امام عبداللہ بن المبارک (المتوفی ۱۸۱ھ) امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابو وائل حضرت ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کیا کرو، بلکہ خاموش رہا کرو۔ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنی چاہئے، کیونکہ انصاف جہری نمازوں میں ہی ہو سکتا ہے (جزء القراءۃ ص ۸) اور جہری نمازوں میں ان کا محقق مسلک امام کے پیچھے ترک القراءۃ ہی تھا (معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۶۲، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے) اور تبلیض الصحیفہ مصنفہ علاء سیوطی جو اپنے وقت کے سب سے بڑے حافظ تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۱۳) کے حوالہ سے یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ امام عبداللہ بن المبارک نے فرمایا کہ جس مسئلہ پر حضرت امام ابو حنیفہ اور امام سفیان ثوری مجتمع ہو جائیں تو وہی میرا مسلک ہوگا اور چونکہ یہ دونوں بزرگ سنی نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے یہی مذہب امام ابن مبارک کا ہوگا۔

امام عبداللہ بن وہب (المتوفی ۱۹۷ھ) حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ امام ابن وہب کا مسلک بھی امام ابن عیینہ کی طرح امام کے پیچھے ترک قراءۃ ہی ہے (فصل الخطاب) اور محدث مولانا محمد زکریا صاحب اس کی تصریح کرتے ہیں کہ امام ابن وہب اور علامہ اشہب وغیرہ مالکی علماء کا یہی مسلک تھا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہئے۔ (اجز المسالک جلد ۱ ص ۲۳۹) اور امام ابن وہب کا ترجمہ حدیث ۷۷ کے ذیل میں نقل کیا جا چکا۔

امام سفیان بن عیینہ (المتوفی ۱۹۸ھ) امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ ہم سے قتیبہ بن سعیدؒ اور ابن ابی السرح نے بیان کیا، وہ دونوں حضرت سفیان بن عیینہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبادہ بن الصامت کی مرفوع حدیث (اصلاوة لمن لعیراً بفاخرة الكتاب فصاعداً او كما قال) کا یہ مطلب بیان کیا لمن یصلی وحده (ابوداؤد جلد ۹ ص ۱۹) یعنی جو شخص تنہا نماز پڑھتا ہو تو اس کو سورہ فاتحہ کی قرأت کرنی ہوگی، اور یہ حدیث مقتدی کو شامل نہیں ہے، مطلب ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جاسکتی امام ابن عیینہؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے اور ابن ابی السرح کا ترجمہ باب دوم حدیث ۲۷ میں نقل ہو چکا ہے۔

امام اسحاق بن راہویہ (المتوفی ۲۴۶ھ) امام بغوی علامہ آلوسی اور مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ امام موصوف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے (معالم التنزیل جلد ۲ ص ۶۲۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) امام موصوف کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

قارئین کرام! ہم نے بعض حضرات تابعین و اتباع تابعین کے آثار باب اول میں (مثلاً حضرت محمد بن کعب، مجاہد بن جبر، حسن بصری، ابو عالیہ الریاحی اور امام زہری وغیرہ کے آثار) اور بعض دیگر اکابر علماء امت اور حضرات ائمہ اربعہ کے اقوال مقدمہ میں پوری تفصیل کے ساتھ عرض کر دیے ہیں اور گوان کے علاوہ ابھی بہت سے آثار اور اقوال اس مضمون کے موجود ہیں۔ لیکن چونکہ ان حضرات کے مسلک کے سمجھنے میں فریق ثانی کو ایک نمایاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان کے نام پیش کیے ہیں۔ ورنہ مقدمہ میں اجماع نقل کیا جا چکا ہے اور اس کے بعد مزید کسی اور صراحت اور وضاحت اور تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

وفیه کفایۃ لمن لہ ہدایۃ۔

۱۔ امام ابو داؤد صاحب سنن (المتوفی ۲۴۵ھ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الثبت اور سید المحافظ تھے (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲)

۲۔ قتیبہ بن سعیدؒ کو علامہ ذہبیؒ الشیخ، المحافظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۳)

حضرات! آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ آیت واذ قرئ القرآن... الآية کا شان نزول صحیح روایات اور اجماع امت سے قرآنہ خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اکیس^{۲۱} صحیح اور مرفوع روایات سے امام کے پچھے قرأت کی مانعت اس کتاب میں ثابت کی جا چکی ہے۔ اور ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے اور متعدد صحیح اور مرفوع حدیثوں سے خاص فاتحہ کا لفظ بھی نقل کیا جا چکا ہے اور فریقِ ثانی کی ہر طرح سے منہ مانگی مرادیں بھی پوری کی جا چکی ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کی وہ جماعت جن سے باقرار فریقِ ثانی، دین، علم فقہ اور حدیث مروی اور منقول ہے۔ وہ بھی امام کے پچھے قرأت کے قائل نہیں تھے۔ اور حلیل القدر حضرات تابعین^{۲۲} واتباع تابعین^{۲۳} اور دیگر بڑے بڑے حضرات محدثین^{۲۴} اور فقہاء بھی امام کے پچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پچھے قرآنہ کو مخالف قرآن شاذ منکر اور اجماع کے خلاف سمجھتے تھے، جیسا کہ شیخ الاسلام کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے اور جو سری نمازوں میں امام کے پچھے قائل بھی تھے۔ وہ بھی صرف استحباب کے درجہ میں اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مانعین قرآنہ خلف الامام صرف احناف ہی نہیں — (جس طرح کہ فریقِ ثانی نے تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دے کر یہ مغالطہ دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ صرف احناف کا قول اور ان کا مسلک ہے) بلکہ جمہور اہل اسلام اور فقہاء و محدثین کا یہ محقق مسلک ہے اور فریقِ ثانی نے غلطی کی وجہ سے صرف احناف کے مقتدر علماء مفتی محمد کفایت اللہ صاحب^{۲۵}، مولانا حسین احمد صاحب مدنی^{۲۶}، اور مولانا شبیر احمد صاحب کی خدمت میں چیلنج پیش کر کے یہ سمجھنے یا سمجھانے کی بالکل ناکام سعی کی ہے کہ یہ مسئلہ صرف ان کا ہے اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ پیش کردہ روایات میں کم و بیش سچا نوے فی صدی روایت وہ ہیں، جو ثقہ، مثبت، حافظ اور حجت ہونے کے علاوہ بخاری اور مسلم کے مرکزی روایت ہیں اور تقریباً پانچ فی صدی وہ راوی ہیں جن میں بعض حضرات محدثین کرامؓ نے کلام کیا ہے، لیکن ان کو بھی نوے فی صدی اور جمہور محدثین ثقہ کہتے ہیں اور ان کی روایتوں کو صحیح، حسن، صالح، جید اور قوی کہتے ہیں، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان روایت کی (بغیر تین چار کے حالانکہ جمہور محدثین کے نزدیک وہ بھی ثقہ ہیں) ثقاہت اور عدالت فریقِ ثانی کے

نزدیک بھی مسلم ہے۔ صرف ان پر تدلیس، تخلیط، تغیر سیر و ہم اور تفر دو غیرہ کے معمولی الزامات لگاتے گئے ہیں یا مرفوع کو موقوف اور موصول کو مرسل کہنے کی بے جاسعی کی گئی ہے اور یا محض اپنی مرضی یا معمولی سے شبہ کی بنا پر مطلق قرأت کو مقید کرنے کی بعد از انصاف کاوش کی گئی ہے، اب ذرا فرقی ثانی کی پیش کردہ روایات اور ان کے روایت اور رجال کا حال بھی دیکھ لینا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ فرقی ثانی کتنے پانی میں ہے۔ ان تمام پیش کردہ دلائل کو سامنے رکھ کر میں فرقی ثانی کے اہل علم طبقہ سے نہایت تودبانہ اور مبنی بر انصاف مطالبہ بلکہ درد مندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ حق کا ساتھ دے اور تعصب اور غلو سے کام نہ لے اور اگر وہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی پارٹی کا ساتھ نہ چھوڑ سکے یا نہ چھوڑنا چاہے تو اس چیلنج بازی سے باز آجائے اور یہ الفاظ اور نظر یہ واپس لے لے کہ

جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے،

کا لعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (انتہی بلفظہ دیکھتے فصل الخطاب ص ۱۔ جس میں تمام دنیا کے علمائے اخلاف کو کھلا چیلنج دیا گیا ہے)

اس سے قبل کہ باب چہارم شروع کیا جائے یہ کہ دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں (اور سخن ہائے

گفتنی میں بھی عرض کیا جا چکا ہے) کہ ہر مقام پر حضرات محدثین کرام اور فقہائے عظام کے ناموں کے قبل، امام، علامہ، محدث، فقیہہ یا حضرت وغیرہ کے توصیفی القاب نہیں لکھے جاسکے۔

اس لیے کہ ان کے نام بار بار آتے رہتے ہیں۔ ورنہ نہ صرف یہ کہ مجھے ان سے عشق اور محبت ہے، بلکہ ان کے نام لینے کو موجب نزول رحمت خداوندی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انہیں کی کاوش اور سعی

کی بدولت قرآن کریم اور حدیث شریف ہم تک پہنچی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اور آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظیم الشان ہستی تک ہماری رسائی کا عالم اسباب میں یہی اکابر بہترین

ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور جہاں ان اکابر سے (خصوصاً حضرت امام بخاری اور امام بیہقی وغیرہ) علمی اور تحقیقی رشتہ کشی کی گئی ہے، تو ماشاؤ کلا ثم ماشاؤ کلا کہ اس سے ان کی تذلیل اور تحقیر مراد نہیں کیونکہ ان کی تذلیل کو بغوا سے حدیث من عادی لی ولیا فقد بارزته بالحرب۔ اللہ

تعالیٰ کی ذات سے اعلان جنگ کے مترادف سمجھتا ہوں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) بلکہ جہاں بھی ان اکابر سے اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ صرف ان کی پیش کردہ دلیل کی خامی بتلانا مقصود ہے، وکل احد یؤخذ عنه ویترک الا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک بات اور خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ راقم الحروف نے فریبتِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے مفہوم کو اختصاراً اپنی عبارت میں پیش کیا ہے، مگر صرف بعض مواقع پر الفاظ بھی انہیں کے ہیں جہاں انتہی بلفظہ یا بلفظہ وغیرہ لکھ کر اشارہ کر دیا ہے۔ ہاں البتہ ان کی کتابوں کے حوالے ضرور درج کر دیے گئے ہیں تاکہ مزید تسلی اور اطمینان کے لیے اصل کتاب کی طرف باسانی مراجعت کی جاسکے۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا علم ہے۔ معصومیت کا دعوائے کب ہو سکتا ہے؟ اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بغیر معصوم ہے کون؟ و العصمة بید اللہ تعالیٰ وحده۔

پوتھا باب

قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرام، تابعین و اتباع تابعین وغیرہم سے بلکہ
 جمہور امت سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے اور
 جہری نمازوں میں تو مخالف اجماع اور شاذ و منکر ہے۔ قرآن کریم، حدیث شریف اور اجماع
 امت کے بعد کسی اور دلیل کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت، لیکن ہم محض تکمیل فائدہ کے
 لیے نہایت اختصار سے چند عقلی تریجی اور قیاسی دلائل بھی اس باب میں عرض کر دیتے ہیں
 تاکہ اصول فقہ کی رو سے قرآن کریم، حدیث شریف، اجماع امت اور قیاس کے جملہ دلائل سے
 آپ کو جمہور اہل اسلام کا محقق مسئلہ معلوم ہو جائے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورہ فاتحہ
 وغیرہ کسی قسم کی قرأت کرنا درست اور صحیح نہیں ہے۔

پہلی دلیل: علامہ حازمی^(۱) (المتوفی ۸۲۴ھ) لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی حدیث ظاہر

۱۔ ابو بکر محمد بن موسیٰ بن عثمان الشافعی علامہ ذہبی^(۲) لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، البارع اور النسابة تھے،
 نیز لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، حجت، نبیل، زاہد، عابد، متوسع اور من الوثمة الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۴ ص ۱۵۱)
 اور علامہ تاج الدین السبکی^(۳) (المتوفی ۷۴۰ھ) ان کو امام متقن اور مبرز لکھتے ہیں (طبقات
 الشافعیہ، جلد ۴ ص ۱۸۹)

قرآن کے موافق ہو، اور دوسرے طرف کے ایسی نہ ہو، تو وہ حدیث قابل اخذ اور حجت ہوگی جو ظاہر قرآن کے موافق ہوگی۔ (کتاب الاعتبار ص ۱۱) امام کے پیچھے ترک قرأت کی روایتیں نہ صرف یہ کہ ظاہر قرآن کے مطابق ہیں، بلکہ آیت واذا قرئ القرآن... الودیۃ کا شان نزول ہی بالاجماع مسئلہ خلف الامام ہے، جس کی پوری تشریح باب اول میں عرض کی جا چکی ہے اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ روایات کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت موجود نہیں ہے، لہذا جمہور کے مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۲۹ اور ص ۵۳۳ میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بالکل غیر متعلق ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ انصاف و استماع قرأت فی السر کے منافی ہیں۔ کما متر و ثانیاً۔ خلف الامام کی قید سے روایت نہ صحیح ہے اور نہ مشہور پھر اس سے تخصیص کیسی؟ وثالثاً۔ اختلاف نفس وجوب فاتحہ کا نہیں ہے جس کے لیے انھوں نے تین آیتیں پیش کی ہیں۔ (جو اصل مسئلہ سے بھی غیر متعلق ہیں) بلکہ اختلاف وجوب یا ترک فاتحہ خلف الامام میں ہے اور مقتدی کے لیے بحالت قرأت امام جواز اور اباحت قرأت کے لیے کوئی آیت موجود نہیں ہے محض کشیدہ ہے بخلاف قرأت خلف الامام کے اس پر بالاجماع آیت واذا قرئ القرآن... الودیۃ دلیل ہے۔

دوسری دلیل؛ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ اگر ایک جانب کی حدیث پر اکثر امت کا عمل ہو اور دوسری جانب اتنا عمل نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جس پر جمہور امت کا اتفاق ہوگا۔ (ایضاً ص ۱) اور امام کے پیچھے قرأت کے ترک کرنے کا مسئلہ جمہور امت کے اقوال اور عبارات سے آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی مانعین قرأت خلف الامام کی احادیث اور مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۱ میں اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ بالکل ناکام ہے کیونکہ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید اور تطبیق و ترجیح کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں دینیں مساوی ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور نزاع محض فاتحہ کے ایجاب کا نہیں جس کی حدیث صحیح ہے بلکہ فاتحہ برائے مقتدی میں نزاع ہے اور آیت انصاف قطعی ہے وہ بھلا حضرت ابوہریرہ کی ضعیف حدیث سے کیونکر منسوخ ہو سکتی ہے؟ اور معدودے چند حضرات صحابہ کرام کے بغیر باقی تمام حضرات قرن اول میں خلف الامام

قرآۃ کے منکر تھے اور بعد کے لوگوں کی اکثریت کا تو مؤلف مذکور کو بھی دینی زبان سے اقرار ہے اور قرآۃ خلف الامام سے منع کر نیوالے بے شمار حضرات صحابہ اور تابعین تھے بلکہ وہ تو منہ میں پتھر اور مٹی ڈالنے پر بھی اترے ہوئے تھے اور احناف کا مذہب باحوالہ گذر چکا ہے کہ منع قرآۃ خلف الامام ہے۔ اس لیے ترک القرآۃ خلف الامام جمہور کا مسلک ہونا واضح ہے۔ لا شک فیہ۔

تیسری دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی حدیث کے ساتھ آپ کا عمل بھی موجود ہو۔ اور دوسری طرف صرف آپ کا قول ہو تو آپ کی اس حدیث کو ترجیح ہوگی جس پر آپ کا قول اور فعل دونوں موجود ہوں۔ (کتاب الاعتبار ص ۱۱) اور باب دوم میں آپ کی بہت سی قولی صحیح اور مرفوع حدیثوں کے علاوہ حدیث منہ میں آپ کا آخری عمل بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ آپ نے نظریہ ظاہر ساری سورۃ فاتحہ ترک کی اور آپ کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کی عملی اور فعلی حدیث بھی نقل کی جا چکی ہے۔ اور ایسی کوئی روایت بسند صحیح نہیں پیش کی جاسکتی کہ آپ نے اقتدار کی حالت میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ہے۔ ومن ادعی فعلیہ البیان دیدہ باید، اگر قرأت خلف الامام کی روایتیں صحیح بھی ہوں تب بھی ان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی حالانکہ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ اس میں بھی مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۳۲ میں کلام کیا ہے مگر معقول نہیں کیونکہ باحوالہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آپ پہلے مقتدی تھے۔ پھر آپ نے امامت اختیار کی اور بالاجماع اور باقرار مؤلف مذکور قرأت سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اور وہی آپ سے چھوٹ گئی تھی اور بایں ہمہ نماز ہو گئی، قرأت سے نماز مراد لینا بے دلیل ہے اور یہ ترک فاتحہ کلاً یا بعضاً عذر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اقتدار کی وجہ سے تھا۔

چوتھی دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی روایت قیاس کے موافق ہو اور دوسری قیاس کے موافق نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جو قیاس کے مطابق ہوگی (کتاب الاعتبار ص ۱) اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا قیاس کے مطابق ہے، اور فریق ثانی کا بھی اس امر پر اتفاق ہے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت اور اسی

طرح مقتدیوں کو جہر بالقرآنہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت اور جہر سے پڑھنا امام کا فریضہ ہے تو اس پر سورہ فاتحہ کی قرأت کو قیاس کر لیں۔ ہاں اگر کسی صحیح سند کے ساتھ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرأت کرنے کی اجازت ہوتی تو الگ بات تھی۔ اس صورت میں قیاس نص کے مقابلہ میں باطل ہوتا۔ مگر خلف الامام کی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے، جیسا کہ بیان ہو گا۔ مؤلف خیر الکلام کا فاتحہ کو نماز کی صحت کے لیے شرط قرار دینا اور قرآن کی قرأت کو رکن قرار دینا سجا ہے مگر مقتدی کے لیے دونوں شرط نہیں اور نزاع صرف اس میں ہے اور مانس اد کو بالاجماع عدم رکن قرار دینا غیر مسلم ہے قرأت کے سلسلے میں فاتحہ اور مانس اد کا ایک ہی حکم ہے امام اور منفرد کے لیے دونوں ہیں اور اور مقتدی کے لیے دونوں نہیں۔ اس لیے ترک قرآنہ للمقتدی ہی قیاس کے مطابق ہے۔

پانچویں دلیل: اگر ایک طرف کی حدیث محرم اور دوسری طرف کی بیخ ہو تو محرم کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ حضر مقدم باشد بر جانب اباحت (بدور الاہلہ ص ۱۸) اور یہ گدڑ چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فاستمعوا له وانصتوا اور واذا قرأ فانصتوا وغیرہ امر کے الفاظ سے مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے برحق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم اور امر کا خلاف کرنا یقیناً حرام ہے۔ اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین کے جو تہدید فی الفاظ نقل ہو چکے ہیں (کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے منہ میں چنگاری ہو، خاک ہو، نتن ہوں، پتھر پڑے وغیرہ وغیرہ) وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اس لیے محرم کو بیخ پر ترجیح ہوگی۔ اور اس لحاظ سے بھی جمہور کی دلیل کا پلہ بھاری رہے گا۔ مؤلف خیر الکلام کا ایجاب فاتحہ خلف الامام کا دعویٰ کر کے اور ترک قرأت کو تخیر سے تعبیر کر کے ترجیح دینا مردود ہے کیونکہ ایجاب فاتحہ خلف الامام کی جب سرے سے کوئی حدیث ہی صحیح نہیں تو پھر راجح و مرجوح کا کیا سوال؟ اور قرآن کریم و حدیث شریف سے ثابت ہے، کہ مقتدی کو خلف الامام استماع و انصات کا وجوبی حکم ہے پھر تخیر کہاں سے؟

چھٹی دلیل: اس امر پر تمام محدثین اور فقہاء کا اتفاق ہے جن میں خصوصیت حضرت امام بخاری اور امام بیہقی قابل ذکر ہیں کہ امام کا سترہ مقتدیوں کو کافی ہے اور ان کو الگ سترے

کی ضرورت نہیں ہے (دیکھئے بخاری جلد ۱ ص ۱ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۳۵۲) جب وہی امام، نماز اور مقتدی جمع ہیں تو امام کی قرأت مقتدیوں کو کیوں کافی نہیں ہے؟ جب کہ ماشراد علی الفاتحة کی قرأت میں سب کے نزدیک امام کفایت کرتا ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ سترہ نماز کے ارکان اور شرائط سے نہیں قرأت نماز کے ارکان سے ہے... الخ صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسے سترہ رکن نہیں اسی طرح مقتدی کے لیے قرأت بھی رکن نہیں مطلق نماز کا جھگڑا نہیں بات مقتدی کی ہو رہی ہے اور جیسے سترہ آگے ہونے کی وجہ سے بقول مؤلف خیر الکلام بمنزلہ کعبہ ہے اور سب کے لیے ایک ہی کعبہ کافی ہے تو اسی طرح امام بھی سب کے آگے ہوتا ہے اور قرأت میں سب کی کفایت کرتا ہے۔ لہذا امام کی قرأت اور سترہ سب کے لیے کافی ہے۔

ساتویں دلیل: صاحب امر کے آخری قول و فعل سے بظاہر ہی متبادر ہو سکتا ہے کہ پہلا قول اور فعل فسوخ قرار دیا جائے۔ اور اس سے کیا کم ہو سکتا ہے کہ اگر آخری عمل ناسخ نہ ہو۔ تب بھی ترجیح تو اس کو بہر حال ہوگی۔ جیسا کہ حضرت امام بخاری نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے وانما یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری جلد ۱ ص ۱)

۱۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: الامام یجمل عن اللہ ما مومین السہو وکذا القرآۃ عند الجہوس (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱) امام سہو میں اور جہور کے نزدیک قرأت میں مقتدیوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس نے ایک جنازہ پر بلند آواز سے قرأت کی۔ پھر ارشاد فرمایا: وانما جہرت لہ علیہم انہا سنتہ والوامام کفایا (منتقی ص ۲۶۲) میں نے جہرا اس لیے قرأت کی ہے تاکہ تمہیں اس کا سنت ہونا معلوم ہو جائے ورنہ امام کی قرأت کافی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث آتی ہے لا صلوة الا بخطبة کہ خطبہ کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی، حالانکہ فریق ثانی بھی متفق ہے کہ خطبہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۷۷) بہر حال جب امام ماشراد علی الفاتحة سترہ، سہو اور خطبہ وغیرہ میں کفایت کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ باقر فریق ثانی تو قرأت میں بھی یقیناً وہ کفایت کر سکتا ہے۔

یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سب سے آخری فعل ہی قابل عمل ہوگا۔ اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری نماز میں باقرار قاضی شوکانی ۷ پوری سورۃ فاتحہ بحالت اقتدار ترک کی مگر آپ کی نماز صحیح ہو گئی اور آپ کے آخری فعل کے حجت ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام کا حضور علیہ السلام کی ابتداء اقتدار کا اور پھر ترک فاتحہ کلاً یا بعضاً کا انکار کرنا بالکل مکابرہ ہے جبکہ روایات سے ثابت ہے کہ امر تو انکار کا کیا معنی؟ باقی نماز میں قیام وقوع اور نیابت وغیرہ میں عذر تو شریعت نے خود بتایا ہے مگر قرأت اور ترک قرأت میں عذر اور غیر عذر کا کوئی فرق نہیں کیا اس لیے قرأت یا ترک قرأت کو دیگر امور پر قیاس کرنا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے قیاس مع الفارق ہے جو قابل سماعت نہیں ہے۔

آٹھویں دلیل: آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الامام ضامن امام ضامن اور کفیل ہے ضامن اور کفیل جب قرض وغیرہ ادا کر دے تو اصل مقروض سبکدوش ہو جائے گا۔ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حضرات صحابہ کرام کے ابتداءً اس لیے جنازے نہیں پڑھائے تھے کہ وہ مقروض تھے اور ان کے پاس قرض کی ادائیگی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور جب ان کے قرض کو ان حضرات صحابہ کرام نے اپنے ذمہ لے لیا جو زندہ تھے۔ اور ان کے کفیل اور ضامن بن گئے تو آپ نے اصل کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے ان کا جنازہ پڑھا دیا۔

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الامام ضامن امام مقتدیوں کا ضامن اور کفیل ہے۔ یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص ۸۲، ترمذی جلد ۱ ص ۲، مجمع صغیر طبرانی ص ۱۲۳، اور مسند احمد جلد ۲ ص ۴۱۹ وغیرہ میں موجود ہے۔ صاحب تنقیح کتبہ ہیں کہ مسند احمد کی تصحیح علی شرط مسلم صحیح ہے اور علامہ زبیدی فرماتے ہیں کہ یہ سند صحیح ہے (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۵۲) علامہ بیہقی کہتے ہیں کہ بزار نے یہ روایت بیان کی ہے: ورجاله کلہم موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت حضرت ابوامامہ باہلی سے بھی مروی ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الامام ضامن (الحديث) علامہ بیہقی کہتے ہیں کہ امام احمد نے اور طبرانی نے مجمع میں یہ روایت بیان کی ہے ورجاله موثقون طبرانی کے سب راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲)

(دیکھیے بخاری و مسلم وغیر) باقی باریک فقہی تدقیقات کا یہ مقام نہیں ہے ہم ان کو یہاں نہیں چھپاتے۔ لہذا جب امام سورہ فاتحہ کی قرأت کر لے تو مقتدیوں کو کافی ہوگی جیسے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت بالاتفاق مقتدیوں سے ساقط ہے اور امام کی قرأت ہی کفایت کرتی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۵ میں لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا بہت سے آدمیوں نے سو سو روپیہ ادا کرنا ہو تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کفیل ان سب کی اور اپنی طرف سے ایک سو روپے لے کر سب کی ذمہ داری سے بری ہو جائے ... الخ

اجواب: مگر یہ سب کچھ ان کی قلتِ فہم کا نتیجہ ہے کیونکہ یہاں ایک آدمی کا بہت سے آدمیوں نے نہیں دینا بلکہ کئی آدمیوں پر صرف سو روپیہ ہے اور اس کو کفیل ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ قرأتِ جماعت کی نماز میں صرف ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ میں تو فریقِ ثانی کو بھی مُسَلَّم ہے کہ امام اور کفیل سب کی طرف سے ادا کر رہا ہے۔ منفرد ہوتے تو ان کو خود پڑھنی ہوتی، لیکن یہاں سب تو مقتدی کی ہو رہی ہے اور اس پر سب سے قرأت ہی نہیں جو ہے وہ امام ادا کر رہا ہے۔

نویں دلیل: امام طحاوی نے ترکِ قرأتِ خلف الامام پر متعدد مرفوع حدیثیں اور آثارِ حضرات صحابہ کرام رض و تابعین وغیر ہم نقل کرنے کے بعد اپنی عادت کے مطابق نظر فقہی اور عقلی دلیلوں بیان کی ہے۔ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور سورہ فاتحہ اس سے کلیتہً چھوٹ چکی ہو تو جمہور اہل اسلام کے نزدیک (جس کی تحقیق اپنے مقام پر آئیگی۔ اور دو مرفوع روایتیں اور متعدد حضرات صحابہ کرام کے اقوال پہلے نقل بھی ہو چکے ہیں) اس کی وہ رکعت بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر تکبیر تحریمہ اور قیام (جس میں کم از کم تکبیر تحریمہ ادا ہو سکتا ہو) کی طرح مقتدی پر سورہ فاتحہ بھی پڑھنی لازم اور فرض اور رکن ہوتی تو جیسے تکبیر تحریمہ اور قیام اس سے ساقط نہیں ہوتے اسی طرح اس پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی فرض ہوتا اور بغیر اس کے اس کی نماز نہ ہو سکتی۔ حالانکہ جمہور کے نزدیک اس کی یہ رکعت بالکل صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ وہوالمطلوب (محصلاً طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸) مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ رکوع میں طے سے رکعت کا ہو جانے ان احادیث کے منافی نہیں جن میں آتا ہے کہ نماز میں ایک بار فاتحہ پڑھنی چاہیے جیسا کہ ہادیہ اور فتح الباری کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔ ہاں ان احادیث کے منافی ہے

جن میں ہر رکعت میں فاتحہ کا ذکر آتا ہے اس صورت کو خاص کر لیا جائے گا یا عذر شرعی پر
مخول ہوگا۔ (محصلا ص ۵۳۶)

الجواب: جس طرح یہ صورت رکوع والی رکعت کے منافی نہیں، اسی طرح یہ ان احادیث
کے عین مطابق ہے جن میں قرأت صرف امام کا فریضہ بتلایا گیا ہے باقی مقتدی کے لیے ہر رکعت
میں بلکہ کسی بھی رکعت میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے نہ تو یہاں منافاة کا سوال
ہے اور نہ تخصیص اور عذر شرعی پر عمل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

دسویں دلیل: بحر العلوم، حجت الاسلام اور شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح
(المتوفی ۱۲۹۷ھ) بانی دارالعلوم دیوبند نے عقلی رنگ میں یہ مسئلہ یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ
ہر چیز کا صرف ایک طول اور ایک ہی عرض ہوتا ہے۔ سو باعتبار طول کے ایک رکعت ایک نماز
ہے اور ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور باعتبار عرض کے امام اور مقتدی کی نماز
ایک ہے۔ تو یہاں بھی ایک ہی سورۃ فاتحہ کافی ہوگی جس کا امام ادا کر رہا ہے۔ اور اگر امام اور مقتدی
کے لیے الگ الگ اور جدا جدا سورۃ فاتحہ ضروری ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ایک چیز کے
لیے ایک سے زیادہ عرض ثابت ہو اور یہ اصول موضوعہ کے خلاف ہے (توثیق الکلام ص ۹،
تبغیر) متولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ہر رکن چونکہ امام اور مقتدی کو الگ الگ ادا کرنا پڑتا ہے پس
قرأت بھی ہر ایک کو الگ الگ ادا کرنی چاہیے۔ (بلفظہ ص ۵۳۶)

الجواب: جب قرأت مقتدی کے لیے رکن ہی نہیں تو اس کے لیے الگ پڑھنے کا کیا سوال؟
مقتدی کا رکن تو صرف استماع و انصات ہے جس کو وہ ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مانا د علی القاضی
کی قرأت آپ حضرات کے نزدیک بھی مقتدی پر نہیں ہے۔

گیارہویں دلیل: مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ بسلسلہ قرأت امام اور مقتدی کی مثال
ایسی سمجھ لیں جیسے سواری اور مسافر، مسافر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ گاڑی، موٹر، بس، جہاز اور
ٹانگہ وغیرہ میں اطمینان سے سوار ہو کر بیٹھ جائے۔ گاڑی وغیرہ حرکت کرے گی تو مسافر کی مسافت
خود بخود طے ہوتی جائے گی اور مسافر کو ساتھ ساتھ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالذات
حکمت گاڑی کی ہے مگر بالعرض مسافر کی۔ اور باوجودیکہ مسافر آرام کے ساتھ گاڑی وغیرہ میں

بیٹھا رہتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسافر نے اتنا راستہ طے کیا ہے۔ اسی طرح امام جو بمنزلہ گاڑھی کے ہے قرأت کرتا جائے گا اور یہی قرأت مقتدی کو کافی ہوگی (توثیق الکلام، ص ۷۷ تبخیر) مولانا کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کیونکہ ما زاد علی الفاتحة کی قرأت میں فریق ثانی بھی متفق ہے کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے اور اگر سورۃ فاتحہ کی قرأت مقتدیوں کو کافی نہ ہو تو اس مثال کے پیش نظر مطلب یہ ہو گا کہ ایک دو اشیش تک مسافر گاڑھی کے ساتھ ساتھ بھاگتا چلا جائے اور پھر گاڑھی میں بیٹھ جائے۔ جہاں تک گاڑھی کا تعلق ہے اس کا سفر خود بخود طے ہوتا جائے گا۔ لیکن طبعی، شرعی اور دیگر ضروریات میں خود کوشش اور کاوش کرنی پڑیگی اور بغیر اپنی ہمت اور حرکت کے دیگر ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔ مشہور ہے کہ حرکت ہی میں برکت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب گاڑھی کی مسافت طے ہو جائے گی تو اپنے گاؤں محلہ اور گھر تک پہنچنے کے لیے خود عمل کی ضرورت ہے، اس لیے امام بمنزلہ گاڑھی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں باقی رکوع و سجودہ تسبیح و شہد وغیرہ میں مقتدی کو خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔ مؤلف خمبہ الکلام کا امام کی نماز کو حقیقت اور مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھ کر جواب میں دونوں کی نماز کو حقیقت سے تعبیر کرنا اور اس پر جواب کی بنیاد رکھنا بالکل غلط ہے نماز تو امام اور مقتدی دونوں کی حقیقت ہے، یاں قرأت میں فرق ہے، امام حقیقی قرأت کرتا ہے اور مقتدی کی قرأت حکمی ہے اور ہم نے کتاب میں اس کی تصریح کر دی تھی کہ اس لیے امام بمنزلہ گاڑھی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں ... الخ لہذا مؤلف مذکور کا ہماری عبارت سے مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھنا غلط ہے۔

بارہویں دلیل: شمس العلماء مورخ اسلام علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ) نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حالات میں ایک واقعہ نقل کیا ہے (جس کا خلاصہ راقم کی عبارت میں یہ ہے) کہ چند آدمی مل کر مسئلہ خلف الامام پر امام صاحب سے بحث کرنے آئے، آپ نے فرمایا کہ میں

لہ یہ واقعہ مناقب موفی جلد ۱ ص ۱۸۷ میں مذکور ہے ان جماعۃ من اهل المدينة جاؤ الی ابی حنیفہ رحمہ لینا ظروہ فی القرأۃ خلف الامام ۱ھ اور اسی طرح مناقب کردی جلد ۱ ص ۱۸۷ میں بھی ہے اور نواب صاحب بھی اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔ و حکایتی کہ از امام اعظم دربارۃ الزام خصم باختیار یکی برائے مناظرہ از میان جماعۃ و بدون الزام او الزام جماعۃ نقل کردہ اند (باقی اگلے صفحہ پر)

اکیلا اتنے آدمیوں سے کیسے بحث کر سکتا ہوں؟ ایک آدمی کو اپنا وکیل اور مختار بنا لو کہ اس کی فتح تمھاری فتح اور اس کی شکست تمھاری شکست متصور ہو، چنانچہ وہ سب اس پر راضی ہو گئے اور اپنا ایک وکیل انھوں نے انتخاب کر لیا۔ جب وکیل نے بحث شروع کی۔ تو حضرت امام صاحب نے فرمایا کہ مسئلہ تو حل ہو چکا ہے۔ وہ بولا کیسے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ جب تم اکیلے سب کی طرف سے وکیل ہو کر گفتگو کر رہے ہو اور تمھاری بات ان سب کی بات سمجھی جاتی ہے تو اسی طرح امام کی قرأت سب مقتدیوں کی قرأت سمجھی جائیگی وہ سب شکست تسلیم کرتے ہوئے لاجواب ہو کر چلے گئے۔ (سیرت النعمان ص ۵۶)

مبارک پوری صاحب نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ امام صاحب کی طرف اس واقعہ کی نسبت غلط ہے۔ کیونکہ امام جب وکیل ہے تو قیام، رکوع، سجود، تشهد اور سلام وغیرہ جملہ امور میں امام کو وکیل ہونا چاہئے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱) لیکن مبارک پوری صاحب کا یہ اعتراض محض بیج اور باطل ہے۔ اس کی پوری تشریح گزر چکی ہے کہ امام مقتدیوں کا وکیل صرف قرأت قرآن میں ہے، باقی امور میں ان کا وکیل نہیں ہے اور اس کو ایسا سمجھ لیں جیسے بادشاہ کے حضور میں ایک وفد اپنی معروضات پیش کرنے کے لیے حاضر ہو۔ گفتگو تو صرف وفد کا وکیل اور پارٹی لیڈر ہی کرے گا۔ لیکن ارکان وفد کی طرف سے پارٹی لیڈر کی تائید بھی ضروری ہے، قرأت قرآن کریم کو اصل معروضات اور تسبیحات و تشهد وغیرہ کو اس کی تائید سمجھ لیجئے۔

نواب صاحب کی یہ عبارت نقل کی جا چکی ہے کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہمہ قرأت قرآن کریم است فقط (دلیل الطالب ص ۲۹۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ وقول نبویؐ اذ اقرأ فانصتوا وقول من كان له امام فقرأة الامام له قراءة دال است برآنکہ امام متمحل قرأت است از سامع (بدور الابلہ ص ۵۱) اس لیے مبارک پوری صاحب کا یہ اعتراض (باقی پچھلا صفحہ) لطیفہ شاعرانہ و مجرب و تجویز عقلی بیش نیست در مقام استدلال و احتجاج بنصوص قابل التفات

نہی تواند شد ۱ھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۴) ہم نے بھی اس واقعہ کو قرآن و حدیث کے دلائل کی مدد میں پیش نہیں کیا بلکہ عقلی دلائل میں نقل کر کے نواب صاحب کی عقلی تجویز کی تائید کی ہے۔

سراسر باطل ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد سو فی صدی صحیح ہے۔ مولف خیر الکلام ص ۵۳۷ میں لکھتے ہیں کہ امام وکیل نہیں بلکہ مقتدی ہے اور ہر نمازی صرف اپنے لیے نماز پڑھتا ہے اور ہر نمازی رب سے باتیں کرتا ہے اور مناجات صرف فاتحہ پڑھنے میں ہوتی ہے اور فاتحہ فرض ہے اور دعا ہے اور یہ امام اور مقتدی دونوں پر لازم ہے۔ (مصلہ)

اجواب: جب صحیح حدیث میں الامام ضامن آتا ہے تو اس کی کفالت اور ضمانت کا انکار کون سنتا ہے؟ وہ مقتدی بھی ہے اور کفیل بھی ہے۔ مقتدی تمام ارکان و افعال میں ہے اور کفیل صرف قرأت میں ہے اور نمازی نماز خدا تعالیٰ کے لیے پڑھتا ہے جس کا ثواب نمازی کو ملتا ہے اور بے شک نمازی اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے مگر وہ مناجات صرف ثنا اور تسبیحات وغیرہ ہی میں ہے قرأت میں تو اس کو صرف انصت و استماع کا حکم ہے جیسا کہ اس کے دلائل گذر چکے ہیں اور مناجات کو صرف فاتحہ میں بند کر دینا عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ سارا قرآن کریم اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اور سب تسبیحات اس سے سرگوشی ہے اور اول سے آخر تک نماز اس سے ہم کلامی ہے۔ باقی امور میں اصالتہ مقتدی خود عمل کرتا ہے اور قرآن میں اس کا امام و کالتہ سرگوشی کرتا ہے اور فاتحہ صرف امام پر لازم ہے۔ مقتدی کا فریضہ صرف انصت و استماع ہے، مقتدی پر فاتحہ فرض نہیں ہے۔ فاتحہ دعا ہے، لیکن مقتدی حکماً دعا خواں ہے اور آمین سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

حضرات! ابھی ترجیحی، عقلی اور قیاسی دلائل اور بھی پیش کیے جاسکتے ہیں مگر ہمارا مقصد دلائل کا استقصار اور استیعاب نہیں ہے، بلکہ عامۃ المسلمین کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ترک القراءۃ خلف الامام صرف احناف ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ جمہور اہل اسلام کا مسلک ہے اور جمہور اپنے اس محقق مسلک پر قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ و تابعینؒ وغیرہم اور اجماع امت اور قیاس سے ٹھوس وزنی اور صحیح معیاری دلائل اور براہین پیش کرتے ہیں اور وہ ہرگز بلا دلیل نہیں ہیں جیسا کہ

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ہم بطور تبرک اس باب کو قرآن کریم کی ایک آیت کے ایک حصہ پر ختم کرتے ہیں، جیسا کہ پہلا باب بھی قرآن کریم کی آیت ہی سے شروع ہوا تھا۔ کہ
 اَوَّلُ بَآخِرٍ نَسْبَتُهُ وَاوَّلُ اِنَّ عِلَّةَ الشَّهَادَةِ عِنْدَ اللّٰهِ اَشْنَا عَشَرَ شَهْرًا۔ اور
 آخر میں نہایت اخلاص اور دلسواری کے ساتھ فریقِ ثانی سے استدعا ہے کہ وہ اپنے
 اس غلو آمیز نظریہ سے باز آجائے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ
 پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ اس پوری کتاب
 کو پیش نظر رکھ کر انصاف سے فرمائیں کہ کس کس کی نماز باطل، کالعدم، بیکار اور ناقص
 ہوگی؟ غور تو کیجئے کہ جہور امت کی نمازوں پر یہ حکم لگانا کیسی کھلی گستاخی اور بے ادبی ہے۔
 اور گویا اس اعلان کے مطابق جہور امت نماز پڑھتے ہوئے بھی بے نماز ہی ٹھہرے اور تارک
 صلوٰۃ کے بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ کس مسلمان سے مخفی ہو سکتی ہیں؟ فریق
 ثانی نے احناف کے مقتدر علماء حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب و حضرت شیخ الاسلام
 مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ کی خدمت میں
 یہ اعلان پیش کیا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ راقم الحروف، دارالعلوم دیوبند کا خوش چین اور
 ان اکابر کے فضالہ علم اور پس خوردہ سے فیضیاب ہوا ہے۔ اس لیے اس حقیر پر یہ لازم تھا
 کہ اپنے محسن اکابر کا مسلک بیان کرتا اور ان سے سو وطن کو دور کرتا۔ نیز فقیر فروعی مسائل میں
 اپنے اکابر کی طرح حنفی ہے۔ اس لیے فریقِ ثانی کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک
 ہمارے کسی حنفی بھائی کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی
 ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کر کے انعام لے (بلفظہ فصل الخطاب ص ۱) اور
 انعام کی بابت وہ یوں لکھتے ہیں اور مخالفین کو ایک ہزار روپے کا انعامی کھلا چیلنج دیا ہے
 (بلفظہ فصل الخطاب ص ۱) اب فریقِ ثانی کو دیا نتہ از خود ہی یہ انعام دے دینا چاہئے۔
 ورنہ اگر ہم چاہیں تو قانونی اور آئینی طور پر لے سکتے ہیں اور انہیں دینا پڑے گا۔ اور اس
 سے کیا کم ہے کہ۔ ع: شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
 حضرات! آپ دیکھ چکے کہ ہمارا مسلک کیا ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں؟ ع

قیاس کُن زنگستان من بہار مرا

آخری التماس۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ جس طرح جمہور اہل اسلام کے دلائل اور براہین پیش کرنے کا صحیح حق تھا، میں ادا نہیں کر سکا۔ اہل علم حضرات سے التماس اور التجار ہے کہ وہ مجھے میری کوتاہیوں اور لغزشوں پر مطلع فرماتے رہیں۔ کیونکہ ایک نوعمر آدمی سے جس کو اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا بھی پورا احساس اور اقرار ہو۔ اور ایسے ہم مسئلہ میں جس میں حضرت امام بخاریؒ اور حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ ائمہ حدیث اور فرسان علم نے خامہ فرسائی کی ہو، لغزشوں کا صادر ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ سے نہایت اخلاص اور صدق دل سے دعا ہے کہ وہ حقیر کو جملہ جسمانی و روحانی، ظاہری اور باطنی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ اور کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ، محدثینؒ اور فقہاءؒ اور جمہور اہل اسلام کی محبت اور اطاعت کا صحیح جذبہ عطا فرمائے جن کا ذکر موجب رحمت خداوندی ہے۔

پینے میں آگیا کہاں لپٹی ہیں اڑ کے مستیاں

اتنی ہے تندھے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

جلد دوم میں فریق ثانی کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لیا جائے گا کہ ان کی حقیقت کیا

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ

ہے؟

الہ واصحابہ ومنتخبینہم اجمعین۔

ابوالزاہد محمد سر فراز خاں صفدر

خطیب جامع لکھنؤ، ضلع گوجرانوالہ

۳ رمضان المبارک ۱۳۷۲ھ بمطابق

۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء